NIOS SENIOR SECONDARY - URDU (306)

Complete Textbook (38 Lessons)

Table of Contents

1. Lesson 1 3
2. Lesson 2 16
3. Lesson 3 24
4. Lesson 4 40
5. Lesson 5 66
6. Lesson 6 82
7. Lesson 7 96
8. Lesson 8 106
9. Lesson 9 116
10. Lesson 10 134
11. Lesson 11 146
12. Lesson 12 152
13. Lesson 13 160
14. Lesson 14 168
15. Lesson 15 176
16. Lesson 16 194
17. Lesson 17 208
18. Lesson 18 217
19. Lesson 19 225
20. Lesson 20 235
21. Lesson 21 245
22. Lesson 22 255
23. Lesson 23 267
24. Lesson 24 281
25. Lesson 25 293
26. Lesson 26 301
27. Lesson 27 311
28. Lesson 28 321
29. Lesson 29A 328
30. Lesson 29B 338
31. Lesson 30A 343
32. Lesson 30B 353
33. Lesson 31A 360
34. Lesson 31B 368
35. Lesson 32A 376
36. Lesson 32B 381
37. Lesson 33A 388
38. Lesson 33B 401

URDU (306) - SYLLABUS BIFURCATION

Chapter split as per NIOS Bifurcation of Syllabus

TMA (Tutor Marked Assignment) (0 lessons)

Public Examination (1 lessons)

1. Lesson 1 3

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

1

افسانوی اور غیر افسانوی ادب کا ارتقاء

افسانوی ادب کا ارتقاء

دنیا کی بیشتر زبانوں کی طرح اردو میں بھی نثر کا آغاز شاعری کے بعد ہوا۔ جدید تحقیق کے مطابق اردو نثر کی ابتدا آٹھویں صدی ہجری سے ہوئی اور نظم کی طرح نثر کے ابتدائی نمونے چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے اور صوفیا کے ملفوظات (وہ باتیں یا گفتگو جو کسی شخص سے سن کر لکھی جاتی ہیں) ہیں۔ میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، شیخ عین الدین گنج العلم نے نثر میں کچھ مذہبی رسالے لکھے۔ مذہبی رسالے لکھنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عام لوگ دیسی زبان جانتے تھے، اس لیے صوفیائے کرام اپنے خیالات عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے دیسی بولیوں اور زبانوں کا استعمال کرتے تھے۔ دکن میں مشہور شاعر ملاّ وجہی نے نثر میں سب رس لکھی۔ جسے اس دور کی کامیاب ادبی نثر کہا جاسکتا ہے۔ اس کی زبان بڑی عام فہم ہے۔

جدید: نیا
تحقیق: چھان بین

صوفیا: صوفی کی جمع۔ وہ شخص جو دنیاوی مکر و فریب سے دل کو پاک رکھے اور ہر وقت خدا کو یاد کیا کرے۔ غیر حق سے دل کو پاک رکھنے والا

شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتداء محمد شاہی عہد (۱۷۱۹۔۱۷۴۸ء) سے ہوتی ہے۔ جب ۱۷۳۱ء میں فضل علی فضلی نے ملاّ حسین واعظ کاشفی کی مشہور فارسی کتاب روضۃ الشہداء کا اردو میں آزاد ترجمہ کیا۔ اس میں کربلا کے سانحے اور امام حسینؓ اور ان کے رفقاؓ کی شہادت کا بیان ہے۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا رواج بھی کم ہو رہا تھا۔ اس لیے فارسی اور عربی سے مذہبی، نیم مذہبی اور تصوف پر مبنی کتابیں اردو میں منتقل ہونے لگیں۔ ۱۷۷۵ء میں میر حسین عطا تحسین نے ایک فارسی داستان قصہ چہار درویش کا نوطرز مرصّع کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں دہلی کے مشہور عالم دین شاہ ولی اللہؒ کے تیسرے بیٹے شاہ رفیع الدینؒ نے ۱۷۸۶ء میں قرآن پاک کا لفظی ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۷۹۰ء میں قرآن پاک کا وضاحتی ترجمہ کیا اس ترجمے میں وہی زبان استعمال کی ہے جو اس وقت عوام میں رائج تھی۔ اس سے کچھ پہلے نواب عیسوی خاں نے قصہ ''مہر افروز و دلبر'' کے نام سے اردو میں داستان لکھی۔ شاہ عالم ثانی نے 'عجائب القصص' کے نام سے ایک داستان ۱۷۹۲۔۹۳ء

تصوف: ایک علم یا طریقہ جو بندے کو خدا تک پہنچانے کا ذریعہ اور راستہ ہے۔

gs\Administrator\Desktop\
Print\nOTE\NOTE2.tif not
found.

میں عام فہم زبان میں لکھی ایسی زبان جو قلعہ معلیٰ میں عام طور پر بولی جاتی تھی۔

آیئے اب افسانوی ادب کا جائزہ لیں۔ افسانوی ادب میں داستان، ناول اور افسانے شامل ہیں۔

داستان

۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا جس میں نئے آنے والے انگریزوں کو ہندوستان کی کئی زبانیں سکھانے کا انتظام تھا۔ان زبانوں میں اردو کو بہت اہمیت حاصل تھی کیونکہ اردو ہی وہ زبان تھی جو ملک کے بہت سے حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی انگریز اسے عام طور سے ہندوستانی کہتے تھے اور اسی کو یہاں کی عام زبان قرار دیتے تھے۔اس کالج میں اہم رول ادا کرنے والے ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے وہ ۱۷۸۳ء میں ہندوستان پہنچے ان کو ہندوستانی زبان سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور انہوں نے قواعد لغت اور بول چال کی زبان پر انگریزی اور اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر گلکرسٹ شعبہ ہندوستانی کے نگراں مقرر ہوئے۔ڈاکٹر گلکرسٹ نے دیکھا کہ اردو میں شاعری کے مقابلہ میں نثر بہت کم ہے جو نثری کتابیں ہیں ان میں بیشتر مذہبی ہیں جن سے اردو زبان کی تعلیم نہیں دی جاسکتی تھی۔اس لیے انہوں نے فارسی اور سنسکرت وغیرہ سے ترجمہ کرانے کے لیے تصنیف و تالیف کا شعبہ قائم کیا اور اس کے لیے جن اردو، ہندی ادیبوں کو باقاعدہ ملازم رکھا گیا ان میں میر امن، میر بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، تارنی چرن، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، مظہر علی خاں ملاّ، کاظم علی جوان، نہال حیدر لاہوری، بنی نرائن جہاں اور للو لال جی کے نام نمایاں ہیں۔فورٹ ولیم کالج میں ادیبوں سے بیشتر ایسی کتابیں لکھوائی گئیں جو عام دلچسپی کی داستانیں یعنی اصلاحی، اخلاقی تاریخی اور تعلیمی موضوعات پر مبنی تھیں۔ان کتابوں کی زبان انتہائی سیدھی سادی تھی۔گلکرسٹ کی کوشش تھی ہندوستانی شعبہ اور ہندوستانی زبان (اردو) ہر اعتبار سے ترقی کرے اس کا ادب بھی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کی طرح ممتاز درجہ حاصل کرے اور خاص و عام میں مقبول ہوجائے۔فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں میر امن کی کتاب باغ و بہار کو سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی اردو نثر میں کتابیں لکھی جارہی تھیں۔انشاءاللہ خاں انشا نے اردو میں ایک کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کے نام سے لکھی جس میں فارسی یا عربی کے الفاظ استعمال نہیں کئے۔لکھنؤ میں رجب علی بیگ سرور نے ۱۸۲۴ء میں فسانہ عجائب لکھی۔یہ کتاب رنگین اور مقفّٰی نثر میں ہے۔

تالیف: دو چیزوں کو باہم ملانا یا جمع کرنا

موضوعات: موضوع کی جمع

اسی زمانے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مشہور شاعر مرزا غالبؔ نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو اردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ان خطوط کی سادگی، ظرافت اور شگفتگی کا جواب نہیں، غالبؔ ایک انقلابی مزاج رکھتے تھے۔انہوں نے خط و کتابت کے تمام قاعدوں سے گریز کیا۔خطوط میں دل کی باتیں لکھیں اور بے تکلف طرز تحریر ایجاد کیا۔اسی عہد میں غالبؔ کے ایک عزیز خواجہ امان نے بھی فارسی کی مشہور داستان بوستانِ خیال کا ترجمہ اردو میں کیا۔اس دور کے نثر لکھنے والوں میں غلام

gs\Administrator\Desktop Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

امام شہید اور غلام غوث بے خبر کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔

ناول

ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی انوکھے اور عجیب یا نرالے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی کے اثر سے ناول اردو میں آیا۔ لیکن اردو نثر کی تاریخ میں داستانوں کا دور ختم ہونے کے بعد بیسویں صدی تک کے زمانے میں، سورج پور کی کہانی، سبودھی کہودھی، داستان جمیلہ خاتون اور خط تقدیر کے علاوہ کہانیوں کے ایک مجموعے مراۃ النساء کی موجودگی یہ ثابت کر دیتی ہے کہ ناول اردو ادب میں بہت پہلے سے موجود ہے۔ پھر ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اردو ادب میں اپنی افادیت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں کو سماج میں پھیلی برائیاں دور کرنے کا ذریعہ بنایا۔ ان کا مقصد قوم کی ذہنی اور معاشی پستی کو دور کرنا تھا۔ ان کا ناول فنی اعتبار سے قدرے کمزور سہی مگر یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اردو نثر کو نیا انداز بخشا ہے۔ دلّی اور خاص طور سے عورتوں کی زبان پر انہیں قدرت حاصل تھی۔

اردو ناول نگاری میں ڈپٹی نذیر احمد کے بعد دوسرا اہم نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ یہ لکھنو کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بڑے عرصے تک ''اودھ اخبار'' کی ادارت کی اور 'فسانہ آزاد، جام سرشار، سیر کہسار، کامنی بچھڑی دلہن، پی کہاں، کڑم دھم اور خدائی فوجداری جیسی مشہور کتابیں لکھیں۔ ''فسانۂ آزاد'' تو سرشار کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس میں لکھنوی تہذیب اور وہاں کی روزمرہ زندگی کی بڑی جاندار عکاسی کی گئی ہے۔ سرشار کا یہ طویل افسانہ صرف لکھنوی تہذیب کا نمائندہ نہیں بلکہ داستان اور ناول کے درمیان کی ایک اہم کڑی ہے۔

اسی زمانے کے دوسرے اہم ناول نگار عبدالحلیم شرر ہیں۔ شرر کا تعلق بھی لکھنؤ سے ہے۔ لیکن انہوں نے عمر کا ابتدائی زمانہ کلکتہ میں بسر کیا۔ بیس سال کی عمر میں لکھنؤ واپس آئے۔ شرر نے بے انتہا لکھا۔ ان کی کتابوں کی تعداد تقریباً 102 بتائی جاتی ہے اور اس میں زیادہ تر ناول ہیں۔ ''فردوس بریں'' ایام عرب، حُسن کا ڈاکو، منصور موہنا، فتح اندلس، ملک العزیز ورجنا اور مینا بازار وغیرہ مشہور ناول ہیں۔ ''ملک العزیز ورجنا'' ان کا پہلا ناول ہے جو 1888ء میں لکھا گیا۔ شرر کے ناولوں کے موضوعات زیادہ تر تاریخی ہیں۔ انہوں نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول ''درگیش نندی'' کا ترجمہ بھی اردو میں کیا۔

عبدالحلیم شرر کے بعد ناول نگاری کا جو دور شروع ہوا اس میں مرزا محمد ہادی رسوا، محمد سعید اور منشی سجاد حسین وغیرہ اہم نام ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا ''امراؤ جان ادا'' 1899ء میں لکھا گیا جو مرزا کا شاہکار رہے۔ مرزا رسوا نے اس ناول میں ناول کے فن کا پورا خیال رکھا ہے۔ لکھنؤ کے ایک خاص طبقے اور لکھنؤ کے تہذیبی زوال کی تصویر کشی رسوا نے بڑی فن کاری سے کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ''ذات شریف'' اختری بیگم، شریف زادہ اور ''افشائے راز'' جیسی کتابیں لکھیں لیکن وہ شہرت نہ ملی جو ''امراؤ جان ادا'' کے حصّہ میں میں آئی۔

gs\Administrator\Desktop\
Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

منشی سجاد حسین کے ناول ''طرح دارلونڈی''، ''حاجی بغلول، احمق الذی'' ریاض خیرآبادی کا ''دل ناشاد'' اور قاری سرفراز حسین کا ''شاہد رعنا'' بھی اس دور کے اہم ناول ہیں۔ جن میں زبان وبیان کے دلکش نمونے بھی ملتے ہیں اور ناول کی فنی خوبیاں بھی کم وبیش موجود ہیں۔ راشد الخیری نے بہت سے ناول لکھے جن کا موضوع گھریلو خواتین اور ان کے مسائل ہیں۔ راشد الخیری بھی اچھی نثر لکھتے تھے۔ لیکن ان کے یہاں دکھ اور غم کے سائے گہرے ہیں۔ ان کے ناولوں کے نام ''صبح زندگی، شام زندگی'' وغیرہ بھی اسی تاثر کو پیش کرتے ہیں۔

انیسویں صدی میں اردو نثر کا افسانوی ادب ترقی کر چکا تھا۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور صنعتی ترقیوں نے اردو نثر کے میدان کو بھی بہت وسیع کیا اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور تک پہنچتے پہنچتے اردو نثر میں نہ صرف کہانی، ناول اور افسانے نے ترقی کی بلکہ تحقیق، تنقید اور طنز یہ ومزاحیہ ادب کا بھی اچھا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا۔

ساری دنیا میں بیسویں صدی میں ہونے والی تبدیلیوں، سائنس اور مشینوں کی ترقیوں، قومی انقلابی اور ادبی تحریکوں کا اثر ہندوستانی عوام اور ان کے ادب پر بھی خاصا پڑا۔ پھر یہاں آزادی کی جدوجہد اور آزادی ملنے کے بعد تباہی وخون ریزی، غربت، بے روزگاری، بیماری، تعلیمی پستی، تہذیب اور روایات سے دوری، نئے اور پرانے کی کش مکش، بے اعتباری، خود غرضی، سماجی بھید بھاؤ جیسے سینکڑوں مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ اردو ناول، ڈرامے اور افسانے، نے ان مسائل کی صحیح اور سچی تصویریں پیش کیں۔ اس دور کے اردو ادیبوں نے ان مسائل سے متعلق بے شمار افسانے، ڈرامے اور ناول لکھے۔ اپنی تحریروں کے ذریعے قوم اور ملک کی بہتری اور ترقی اور انسان دوستی کے جذبات کو عام کیا۔ اس اعتبار سے ان ادیبوں اور مصنفوں میں پریم چند بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

پریم چند ترقی پسند بھی تھے گاندھی وادی بھی اور وطن دوست بھی۔ انہیں ملک، قوم اور اس کے تمام مسائل سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے بہت سے ناول اور ڈھیروں افسانے لکھے جن میں زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی اور سچائی اور حقیقت کو آسان، سادہ اور پراثر انداز میں پیش کیا۔ اسرار معابد، بیوہ، کشنا، نرملا، روٹھی رانی، جلوۂ ایثار، بازار حسن، گوشۂ عافیت، میدان عمل اور گئودان وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔

پیش رو: آگے چلنے والا

سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات''، کرشن چندر کے ''جب کھیت جاگے''، ''شکست''، ''ایک عوت ہزار دیوانے'' عصمت چغتائی کے ناول ضدی، معصومہ، ٹیڑھی لکیر، سودائی، عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی پستی گریز، خدیجہ مستور کا آنگن، قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا''، میرے بھی صنم خانے، چاندنی بیگم، گردش رنگ چمن، احسن فاروقی کا شام اودھ اور فیاض علی کا ''انور، شمیم وغیرہ ایسے ناول ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کی بھرپور عکاسی کی ہے اور ناول کے فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

زبان اور بیان کے بھی اچھے تجربے کیے ہیں۔

موجودہ زمانے میں بھی جو اردو ناول نگار اپنے دور کے حالات اور واقعات کو بہتر ڈھنگ سے پیش کر رہے ہیں۔ ان میں قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، قاضی عبدالستار، جوگیندر پال وغیرہ خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اردو ناول کا ایک معیار قائم کیا، اس کے فن کو سنوارا اور اردو نثر کے تخلیقی حسن کو نکھارا ہے۔

افسانہ

افسانہ اردو نثر کی اہم صنف ہے۔ ظاہر میں چھوٹی سی کہانی اپنے اندر بہت وسعت اور گہرائی رکھتی ہے۔ یہ غزل کی طرح کم الفاظ میں بڑی بات بیان کرتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کی نمائندگی اس کے ذریعہ کی جاتی ہے اردو نثر میں افسانے کی روایت تو پریم چند سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور سلطان حیدر جوش نے بہت سے ترکی افسانوں کے ترجمے بھی کیے اور اردو میں افسانے لکھے بھی۔ ان کے افسانوں میں عام طور سے وہ دلکشی، رنگینی اور رومان پایا جاتا ہے جو اس دور کا تقاضا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں، مغربی اثرات اور ترقی پسند تحریک کے مقاصد نے اردو افسانے کو نیا رنگ روپ بخشا۔ کہانی رومان بھری فضاؤں سے نکل کر حقیقت سے قریب ہوگئی۔ منشی پریم چند نے افسانے کو مختصر بھی کیا اور زندگی کا ترجمان بھی بنا دیا۔ انہوں نے زندگی کی بے شمار چھوٹی بڑی سچائیوں، خوشیوں اور غموں کو اپنی کہانیوں کے ذریعے بیان کیا۔ ہندوستان کے دیہاتوں کی خوبصورتی، وہاں کے عوام کی سادگی، خلوص، ان کی پریشان حالی، مفلسی اور بے بسی کی بڑی واضح تصویریں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے ملک میں پھیلی خام خیالی، تنگ نظری، جہالت، بے جا رسم و رواج کی پابندی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کے افسانے واقعات کے ترجمانی کرنے کے ساتھ ہی زبان کی سادگی، سلاست، صفائی اور جذباتی خلوص کا بھی اچھا نمونہ ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، واردات، خواب وخیال، خاک پروانہ، آخری تحفہ، دودھ کی قیمت اور دیہات کے افسانے کے نام سے شائع ہوئے۔

پریم چند نے اردو افسانے میں سادگی اور حقیقت نگاری کی جو روایت قائم کی اس کو آگے بڑھانے کی کوشش ان کے زمانے کے اور بھی بہت سے افسانہ نگاروں نے کی۔ علی عبّاس حسینی، اعظم کریوی، سدرشن بالی اور اوپندر ناتھ اشک تو اس سلسلے میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کے افسانوی ادب میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' جو 1933 میں لکھنو سے شائع ہوا، بہت اہم ہے۔ اس کی اشاعت نے اردو ادب میں تہلکہ مچا دیا۔ ان لوگوں نے پرانی روایات، سماجی بے

gs\Administrator\Desktop\
Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

اعتدالیوں اور فضول رسموں کے خلاف آواز اٹھا کر اردو افسانے کو بے خوف اور بے باک اسلوب بخشا۔

کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری، اختر اور ینوی، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بلونت سنگھ، اشفاق احمد وغیرہ وہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے افسانے کے فن کو ترقی دی۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے افسانے بھی لکھے اور اچھے ڈرامے بھی۔ ان کی تحریروں میں سماجی شعور بھی ہے، انسانی جذبات کی گرمی بھی اور فن کی لطافتیں بھی۔

اردو افسانے کا سفر جاری ہے اور موجودہ دور کے ادبی، سماجی، سیاسی، تہذیبی غرض ہر طرح کے معاملات کو افسانہ نگار بہتر انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ ان میں قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، قاضی عبدالستار، جوگندر پال اور اقبال متین، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے افسانے کے فن کو جس انداز سے برتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کے افسانوی ادب نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ موضوعات کی جدت، بیان کی شگفتگی، خیال کی ندرت اور فن کی جو لطافت اس دور کے افسانے میں پائی جاتی ہے وہ افسانے کے فن کی بقا اور اردو نثر کی ترقی کا پتا دیتی ہے۔

غیر افسانوی ادب کا تعارف

غیر افسانوی ادب میں تذکرہ نگاری، تحقیق وتنقید، مکاتب، مضمون نگاری، صحافت، طنز و مزاح، آپ بیتی، خاکہ نگاری، انشائیہ، رپورتاژ اور سفر نامے شامل ہیں۔ **آیئے اب غیر افسانوی ادب کا جائزہ لیں۔**

تذکرہ نگاری

اردو میں تذکرہ نگاری کا آغاز فارسی کے زیر اثر اٹھارویں صدی میں ہوا۔ اردو شعراء کا پہلا دستیاب تذکرہ میرؔ کا نکات الشعرا ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۷۵۲ء ہے۔ اس وقت سے انیسویں صدی کے وسط تک بے شمار تذکرے فارسی میں لکھے گئے جن میں سے بیشتر شائع ہو چکے ہیں۔ جدید تذکرہ نگاری کی ابتداء مولانا محمد حسین آزاد کے تذکرۂ آب حیات سے ہوتی ہے۔ جو ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ آب حیات تاریخ اور تذکروں کی درمیانی کڑی ہے۔

آب حیات سے پہلے جو تذکرے لکھے گئے ان میں شاعر کا نام، تخلص، استاد کا نام، سکونت وغیرہ کا ذکر کر کے کلام پر ایک دو جملوں میں تبصرہ جسے ہم تنقید کے ابتدائی نقوش کہہ سکتے ہیں اور چند اشعار کا انتخاب آب حیات میں نہ صرف یہ شعرا کے حالات زندگی اور دلچسپ اہم واقعات، کلام کا انتخاب اور شگفتہ انداز میں کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ آب حیات کے بعد جو

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

تذکرے سامنے آئے ہیں ان میں آثار الشعرائے ہنود سُخن شعراء، جلوہ حضر، یادگار ضیغم، آب بقا، گل رعنا خم خانۂ جاوید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تنقید

غیر افسانوی ادب میں تنقید ادب کا ایک اہم شعبہ ہے تنقید کا مقصد ہے تخلیقات کا پرکھنا فنی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لینا۔ اور فیصلہ کرنا ہے۔ اردو تنقید کے ابتدائی نقوش تو تذکروں میں نظر آتے ہیں لیکن تنقید کا باقاعدہ آغاز مولانا الطاف حسین سے ہوتا ہے جب انہوں نے مقدمہ شعروشاعری لکھا۔ حالی صحیح معنوں میں اردو تنقید کے پیش رو ہیں حالی کے بعد ان کے ہم عصر شبلی نعمانی نے شعرالعجم کے حصہ چہارم میں اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ تحقیق کرنے کے لیے خلوص اور سکون کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے کم لوگ ہی اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اردو میں سرسید نے تحقیق کی طرف توجہ دی۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق، پنڈت دتہ تریا کیفی محمود شیرانی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، سید مسعود حسین رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، رشید حسن خاں، مالک رام، خلیق انجم، نثار احمد فاروقی، پروفیسر گیان چند جین نے اپنے تحقیقی کاموں سے شہرت حاصل کی۔

پیش رو۔ آگے چلنے والا

شبلی نے مشرقی انداز کی تنقید کی۔ موازنہ انیس و دبیر میں ان کا یہ تنقیدی طرز نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے۔ شبلی کے شاگردوں میں سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے شبلی کی پیروی کی۔ اسی زمانے میں عبدالرحمٰن بجنوری اور نیاز فتحپوری تاثراتی تنقید نگار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ چکبست، مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، محمد اکرام، احتشام حسین، آل احمد سرور کلیم الدین احمد اور ممتاز حسین کی تحریروں نے اردو تنقید کے معیار میں اضافہ کیا۔ ان میں سے بیشتر نقادوں نے مغربی اصول تنقید کی پیروی کی اس کے باوجود شعروادب کی روایات اور تاریخ کو بھی ذہن میں رکھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کی تنقید میں توازن اور اعتدال نظر آتا ہے۔ اسی دوران ایسے تنقید نگار بھی سامنے آئے جنہوں نے ترقی پسند ادب کے پس منظر میں شعروادب کو پرکھنے کی کوشش کی۔ اردو تنقید کے ضمن میں جن نقادوں کے نام اوپر لیے گئے ہیں ان کے علاوہ اختر حسین رائے پوری، مسعود حسین خاں، اختر، ڈاکٹر سید عبداللہ، عندلیب شادانی، محمد حسن عسکری، خورشید الاسلام، وقار عظیم، پروفیسر محمد حسن، اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

تحقیق

تنقید کے ساتھ تحقیق کا شمار غیر افسانوی ادب میں ہوتا ہے۔ تنقید اور تحقیق دونوں لازم اور ملزوم ہیں تحقیقی عمل بنیادی طور سے تجسس سے شروع ہوتا ہے کیونکہ جب ذہن میں کیوں، کیسے اور کب کے الفاظ ابھرتے ہیں تو یہی الفاظ ہمیں تلاش وجستجو میں مصروف کرتے ہیں۔ تحقیق کے لیے محنت، جاں فشانی کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔

gs\Administrator\Desktop\
Print\nOTE\NOTE2.tif not
found.

مضمون نگاری

مضمون جسے انگریزی میں ایسے (Essay) کہتے ہیں کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کا نام ہے جس میں غور و فکر کے ساتھ کسی موضوع کے تمام گوشوں کو پیش کیا جائے۔ مضمون نگاری کے لیے موضوع کی پابندی نہیں۔ کسی بھی عنوان کے تحت مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موضوع سے متعلق مضمون نگار کے خیالات واضح ہوں۔ ان میں وسعت اور معلومات کا خزینہ ہو۔ اردو میں مضامین تعلیمی اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی، تاریخی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ سرسید احمد خاں پہلے مضمون نگار ہیں جنہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی موضوعات پر پابندی سے مضامین لکھے۔

مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، وحید الدین سلیم، برج نرائن چکبست، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی، عبدالحلیم شرر، شیخ عبدالقادر، ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، پیارے لال شاکر، خواجہ غلام السیدین نے اردو مضمون نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

سوانح نگاری

سوانح نگاری غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ سوانح کے لفظ سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی ایک شخص کی نجی زندگی اور اس کی تاریخ پر مبنی ہے جب کہ سوانح نہ تو تاریخ ہے نہ محض حالات زندگی۔ سوانح نگاری میں کسی فرد کی زندگی کے نشیب و فراز کی روداد نفسیاتی کیفیت، سماج کے اثرات کے ساتھ ادبی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ اردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے اس کے بعد شبلی دوسرے اہم سوانح نگار ہیں۔

حالی نے حیات سعدی، یادگار غالب اور سرسید کی سوانح حیات جاوید لکھی۔ شبلی نے سیرت نبویؐ، الفاروق، المامون، سوانح ابوالکلام جیسی سوانح عمریاں لکھیں۔ وحید الدین سلیم کی ایک وصت کی تکمیل اور عبدالرزاق کانپوری کی البرامکہ غلام رسول مہر کی غالب، قاضی عبدالغفار کی حکیم اجمل خاں، آثار ابوالکلام آزاد، عبداللہ ذکر میر، سوانح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔
اس کے لیے یونیورسٹی میں لکھے جانے والے مونوگراف میں خواجہ احمد فاروقی کا میر تقی حیات شاعر، خلیق انجم کا مرزا محمد رفیع سودا اور صدیق الرحمٰن قدوائی کا ماسٹر رام چندر مونوگراف کے بہترین نمونے ہیں۔ ایسے ہی بے شمار مونوگراف یونیورسٹیوں میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جارہے ہیں۔

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

آپ بیتی یا خودنوشت

سوانح نگاری کی طرح آپ بیتی بھی غیر افسانوی ادب کا ایک حصہ ہے۔ سوانح نگاری اور آپ بیتی میں فرق یہ ہے کہ سوانح نگاری میں زندگی کے کسی خاص شعبے سے تعلق رکھنے والی شخصیت یا ممتاز فرد کے حالات زندگی دوسرا شخص لکھتا ہے جب کہ آپ بیتی میں یہی روداد متعلقہ شخص خود بیان کرتا ہے۔ اس لیے اسے خودنوشت یا آپ بیتی کہتے ہیں۔ اردو میں ابتدائی دور میں شائع ہونے والی خودنوشت تواریخ عجیب ہے اس کا مصنف جعفر تھانیسری بیسویں صدی میں اردو کے مشہور شاعر ذوق کے شاگرد ظہیر دہلوی کی خودنوشت داستان غدر ہے خواجہ حسن نظامی نے خودنوشت ''آپ بیتی'' کے نام سے لکھی، سر رضا علی کی خود نوشت ''اعمال نامہ'' کے نام سے ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت نقش حیات، دیوان سنگھ مفتوں کی نا قابل فراموش، ڈاکٹر اعجاز حسین کی ''میری دنیا'' ڈاکٹر یوسف حسین کی ''یادوں کی دنیا'' اور جوش ملیح آبادی کی تصنیف ''یادوں کی بارات'' اردو میں لکھی جانے والی معروف ومقبول خودنوشت ہیں۔

صحافت

اردو میں اخبار نویسی یا صحافت کی ابتداء آج سے ۱۷۸ سال پہلے ۱۸۲۲ء سے ہوتی ہے جب لالہ سدا سکھ نے اخبار جام جہاں نما شائع کیا۔ یہ اخبار فارسی میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ اردو میں تھا۔ جو اردو صحافت کا اولین نمونہ ہے اردو کا پہلا مکمل اخبار مولانا محمد حسین کے دادا مولانا محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے جاری کیا اس میں علمی ادبی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اردو صحافت نے زمانے کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی آزادی تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جدوجہد کا سہرا اردو صحافت کے سر ہے۔ غدر کے بعد انگریزوں کی مخالفت اور جہاد آزادی اور حق کی راہ میں جان دینے والے پہلے اردو صحافی مولوی محمد باقر ہی تھے۔ بیشتر اردو اخبارات ہی کے مالکان اور مدیران سب سے زیادہ سامراج کے ظلم وستم کا نشانہ بنے قید وبند کی صعوبتیں سہیں۔ پریس اور ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ مولانا حسرت موہانی اردو کے پہلے صحافی ہیں جنھیں قید کیا گیا اور پریس ضبط ہوا۔

اردو کا دوسرا اخبار سید الاخبار تھا جسے سرسید کے بھائی سید محمد نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ اردو صحافت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دہلی اخبار سے آج کے روزنامہ قومی آواز (۲۰۰۰ء) تک بے شمار اردو روزنامے ہفتہ وار، پندرہ روزہ، مہینہ وار اخبارات اور ماہانہ شائع ہوئے جو ہندوستان کے بیشتر مقامات سے شائع ہوتے تھے۔ اپنے دور کا اہم ترین اخبار ''اودھ

gs\Administrator\Desktop\ Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

اخبار'' لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ سرسید کا تہذیب الاخلاق مولانا حسرت موہانی کا اردوے معلیٰ، مفتی سجاد حسین کا اودھ پنچ، مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور البلاغ مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار مولانا محمد علی کا ہمدرد اور لالہ لاجپت رائے کا بندے ماترم اور مدینہ اخبار نے اردو صحافت کے فروغ اور مقبولیت میں اہم رول ادا کیا۔

انشائیہ

انشائیہ مضمون نگاری کی ایک قسم ہے۔ انشائیہ میں عام طور پر انتہائی اہم اور سنجیدہ خیالات کو لطیف انداز میں قدرے تخیل آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ پان بیشتر لوگ کھاتے ہیں۔ لیکن سادہ پان کو اگر قوام کے ساتھ چاندی کے ورق میں لپیٹ کر کھایا جائے تو اس کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال انشائیہ کے ساتھ ہے۔ انشائیہ میں مصنف کی داخلی شخصیت کے ساتھ ساتھ خارجی یا بیرونی اثرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ انشائیہ دراصل داخلی اور خارجی کیفیت یا اثرات کا آزاد بیان ہے۔ اردو میں انشائیہ کے ابتدائی نمونے مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف آب حیات میں نظر آتے ہیں۔ میر ناصر علی، سجّاد حیدر یلدرم، عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، سجاد انصاری، ڈاکٹر جاوید، اور رام لال نابھوی اردو کے معروف انشائیہ نگار ہیں۔

طنز و مزاح

اردو میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم ہے طنز و مزاح کے واضح نقوش اردو کی معروف صنف سخن ہجویات میں نظر آتے ہیں۔ اردو میں شخصی ہجو بھی لکھی گئی ہیں اور شہر آشوب بھی شخصی ہجو میں طنز کے نشتر بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات رکیک جملے بھی کہے جاتے ہیں۔ شہر آشوب میں معاشرے کی بدحالی پر تیکھا طنز نظر آتا ہے۔ ظرافت کا اعلیٰ معیار غالب نے قائم کیا۔ غالب نے اپنے خطوط میں شگفتگی اور شوخی کے جو نمونے پیش کئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ غالب کے بعد مزاحیہ نگاری کا فروغ ۱۸۷۷ء اخبار اودھ پنچ لکھنؤ سے ہوا ہے۔ ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے جو خود بھی مزاح نگار تھے۔ اس میں مضامین لکھنے والے اکثر معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی کمزوریوں کا مذاق اڑا کر ہنسی ہنسی میں کام کی باتیں بتا دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے اردو میں طنز و مزاح کی مضبوط روایت قائم ہوگئی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، سید محفوظ علی بدایونی، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، کنہیالال کپور، فرحت کاکوری، فکر تونسوی، احمد جمال پاشا، بھارت چند کھنہ، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، نریندر لوتھرا اور دلیپ سنگھ نے طنز و مزاح کے کامیاب نمونے پیش کئے ہیں۔ طنز و مزاح صرف اردو نثر میں ہی نہیں نظم میں بھی ہے۔

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

مکتوب نگاری

مکتوب نگاری یا خطوط نگاری بھی غیر افسانوی ادب کی ایک صنف ہے اردو میں مکتوب نگاری کی ابتداء غالب سے ہوتی ہے۔ غالب سے پہلے بھی ایک دو ادیبوں اور شاعروں نے خط لکھے تھے لیکن ان کی زبان فارسی آمیز اور القاب وآداب میں انتہائی تکلف برتا گیا تھا۔ جو صرف ذاتی حالات یا مراسم تک محدود تھا۔ اور ان خطوط میں عام قاری کی دلچسپی یا معلومات کا سامان نہیں تھا۔ غالب ہی ایسے پہلے مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط عام قاری کو دلچسپی اور ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ جو اس دور کی تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ غالب کے خطوط کی بے تکلف فضا اور انداز تحریر متعدد ادیبوں نے اپنانا چاہا۔ لیکن غالب کی سی بات اور کیفیت پیدا نہ ہوسکی۔ خطوط کے لیے کہا جاتا ہے کہ خطوں میں ہمارے لیے وہی کشش ہوتی ہے جو ہمارے لیے ہمارے دوستوں میں ہوتی ہے۔ خطوط ذاتی یا نجی ہوتے ہیں لیکن جب نجی باتوں میں رنگارنگی دلچسپی اور تنوع پیدا ہوجاتے ہیں تو یہ دوسروں کے لیے پرکشش ہوتے ہیں ایک اچھے خط میں یہی شخص وہ نظر آتا ہے جو ظاہری روپ میں ویسا نہیں ہوتا۔ اس لیے شخصیات کا مطالعہ کرنے والے آپ بیتی کے ساتھ ساتھ خطوط کا بھی خصوصی مطالعہ کرتے ہیں۔
غالب کے بعد سرسید، حالی، شبلی، اکبرالہ آبادی، مہندی حسن، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے خطوط کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔

خاکہ نگاری

خاکہ نگاری سوانح اور آپ بیتی کی ملی جلی کیفیت ہے خاکہ میں کسی شخص کی زندگی کی ایسی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں جس سے اس کی شخصیت یا سیرت نمایاں ہوجاتی ہے۔ اور اس شخص کی رفتار وگفتار، طرز زندگی اور عام رویے کے نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سوانح اگر ناول ہے تو خاکہ اسی شخص کا افسانہ ہے۔ جس طرح افسانہ میں اشاروں سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح خاکہ میں اشارے اور کنائے کے ساتھ متعلقہ شخص کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے جو بیک وقت کارٹون بھی ہوتی ہے اور پورٹریٹ بھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے جب ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی والا مضمون لکھا تھا تو انہیں احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کا ایک دلچسپ اور معلومات سے بھرپور نہ صرف خاکہ لکھ رہے ہیں بلکہ خاکہ کی تعریف بھی متعین کررہے ہیں۔ ایک اچھے خاکے میں مصنف کے ساتھ ساتھ وہ شخص بھی بولتا ہوا نظر آتا ہے جس پر خاکہ لکھا جارہا ہے۔ یہی وصف فرحت اللہ بیگ کے مضمون میں ہے۔ آب حیات ایک ایسی کتاب ہے جس میں خاکہ نگاری کے بھی ابتدائی نمونے نظر آتے ہیں۔ اس میں انہوں نے جہاں انشا اللہ خاں انشاء، اور جرأت کا ذکر کیا ہے یا اپنے استاد ذوق کا حال بیان کیا ہے خاکہ نگاری کی اچھی مثالیں ہیں۔
ہم مرزا فرحت اللہ بیگ کو اردو کا پہلا باقاعدہ خاکہ نگار کہہ سکتے ہیں ان کے بعد سید عابد حسین، مولوی عبدالحق، رشید احمد

gs\Administrator\Desktop\ Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

صدیقی، خواجہ حسن نظامی، سعادت حسن، عصمت چغتائی، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، اور مجتبیٰ حسین نے اردو کے بہترین خاکے لکھے ہیں۔

رپورتاژ

رپوتاژ غیر افسانوی نثری ادب کی ایک صنف ہے رپورتاژ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی رپورٹ کے ہیں۔لیکن رپورتاژ محض رپورٹ نہیں ہوتا۔ رپورتاژ صرف چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے اس میں سنے سنائے واقعات نہیں ہوتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ مصنف نے واقعات کا بذات خود جائزہ لیا ہو۔ایک اچھے رپورتاژ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کی صداقت اور اسی کے ساتھ جذبات وتاثرات کی گہرائی اور خلوص کا ہونا بہت ضروری ہے اس لیے رپورتاژ نگار کا کسی واقعہ، حادثے، ادبی جلسے، مشاعرے، کانفرنس وغیرہ کا ذاتی طور پر دیکھنا اور اس کی صحیح تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے۔

اردو میں رپورتاژ کا آغاز تو بیسویں صدی میں ہوا لیکن غالب کے خطوط اور ظہیر دہلوی کی مشہور تصنیف ''داستان غدر'' میں رپورتاژ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔اردو میں رپورتاژ کا باقاعدہ آغاز ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوتا ہے سجاد ظہیر کا رپورتاژ ''یادیں'' اردو کا پہلا مکمل رپورتاژ ہے۔ان کے بعد جن ادیبوں نے رپورتاژ لکھے ان میں کرشن چندر، ابراہیم، عادل رشید، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، پرکاش پنڈت اور شاہد احمد دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔

آپ نے کیا سیکھا؟

......اردو نثر کا آغاز شاعری کے بعد آٹھویں صدی ہجری میں ہوا۔

......اردو نثر کے ابتدائی نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات میں نظر آتے ہیں۔

......شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتداء محمد شاہی عہد (۱۷۱۹—۱۷۴۸ء) سے ہوتی ہے۔

......اٹھارویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں قرآن مجید کے اردو ترجمے ہوئے۔

......۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ جس میں انگریزوں کو اردو سکھائی جاتی تھی۔ جس کے لیے فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا۔

......دہلی کالج ایسا پہلا کالج ہے جس میں مغربی علوم اردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔

......افسانوی ادب (فکشن) میں داستان' ناول' ڈرامے اور افسانے ہیں اور غیر افسانوی ادب میں تذکرہ نگاری، تحقیق وتنقید، مکتوب نگاری، مضمون نگاری، صحافت، طنز ومزاح، سوانح، آپ بیتی، خاکہ نگاری، انشائیہ، رپورتاژ اور سفرنامے شامل ہیں۔

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

......سوانح نگاری اور آپ بیتی میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ سوانح نگاری دوسرا شخص لکھتا ہے۔ اور آپ بیتی خود لکھی جاتی ہے۔

اردو میں اخبار نویسی یا صحافت کی ابتداء آج سے ۱۷۸ سال پہلے ہوئی تھی۔

......انشائیہ مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جس میں سنجیدہ خیالات تخیل آمیزی کے ساتھ لطیف انداز میں پیش کئے جاتے ہیں جس میں مزاح کا عنصر بھی ہوتا ہے۔

اختتامی سوالات 1.4

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب لکھئے۔

1. اردو نثر کی ابتداء کس طرح ہوئی ؟
2. شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقاء کس طرح ہوا؟
3. افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب میں کیا فرق ہے؟
4. غالب نے اردو نثر میں کن اصناف کو متاثر کیا؟
5. رپورتاژ کی صنف اردو میں کہاں سے آئی اور اس سے کیا مراد ہے؟

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

2

حیدر بخش حیدری

مصنف کا تعارف

حیدر بخش حیدری بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شامل ہیں۔ ان کے والد سید ابوالحسن دہلی کے رہنے والے تھے۔ بعد میں وہ بنارس چلے گئے۔ حیدری بنارس ہی میں پلے بڑھے اور وہیں تعلیم بھی پائی۔ جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو گل کرائسٹ نے انہیں اپنے ہاں منشی مقرر کیا۔ اور وہ تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئے۔ حیدر بخش حیدری نے متعدد تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، جن میں گلزارِ دانش، گل مغفرت، ہفت پیکر، لیلیٰ مجنوں اور طوطا کہانی خاص طور پر مشہور ہیں۔

یہ قصہ ''حق وفاداری'' اور ''طوطا کہانی'' سے لیا گیا ہے۔ اس قصے میں بتایا گیا ہے کہ شاہ طبرستان کے محل سرا کا ایک ادنیٰ پاسبان اپنی بہادری، ہمت اور وفاداری کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے شاہ طبرستان کا ولی عہد بن گیا۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

1. اس سبق میں پڑھے ہوئے مشکل الفاظ کے معنی سمجھ لیں گے اور انہیں اپنی گفتگو میں استعمال کر سکیں گے؛
2. پُرانے زمانے کی اردو اور آج کے زمانے کی زبان کا فرق بیان کر سکیں گے؛
3. حیدر بخش حیدری کے اسلوب بیان پر اظہار خیال کر سکیں گے؛
4. اصطلاح ''تجسیم'' کے معنی سمجھ کر اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گے۔

gs\Administrator\Desktop\ Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

2.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

حق وفاداری (داستان)

ایک دن بادشاہ طبرستان نے مجلس عیش، برابر بہشت کے آراستہ کی، کھانے اچھے، لذیذ اور شرابیں پُر کیف، کباب قسم قسم کے اس محفل میں مہیا کیے۔ شہزادے، وزیر، امیر، کلیم، استاد، بلکہ جتنے اہل کمال اس شہر کے تھے حاضر ہوئے۔ کھانے انہوں نے کھائے اور شرابیں انہوں نے پییں کہ اتنے میں ایک شخص اجنبی اس محفل بادشاہی میں بے دھڑک چلا آیا۔ تب ہر ایک اہل بزم نے پوچھا ''اے مرد بیگانہ! تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میں شمشیر زن ہوں''، شیر گیر ہوں اور تیر اندازی بھی ایسی جانتا ہوں کہ تیر میرا سنگِ خارا کو پھوڑتا ہے، بلکہ پہاڑ کے بھی دوسار ہوتا ہے۔ سوائے اس سپہ گری کے ہر ایک فن سے واقف ہوں اور بہت حکمتیں جانتا ہوں۔ پہلے امیر خجند کے پاس نوکر تھا، جب اس نے میری قدر کچھ نہ کی اور کاری گری نہ سمجھی تب اس کی چاکری چھوڑ کر بادشاہ طبرستان کے پاس آیا ہوں، اگر وہ مجھ کو رکھے گا رہوں گا اور ہر ایک وقت جاں فشانی قرار واقعی کروں گا۔''

طبرستان کے بادشاہ نے یہ سخن سن کر اپنے نوکروں اور اہل کاروں کو حکم دیا کہ بالفعل اسے خدمت پاسبانی کی دو۔ بعد دریافت ہونے کے جو اس کے حق میں مناسب ہوگا سو کیا جائے گا۔ بہ موجب حکم بادشاہ کے ارکان دولت نے اسی وقت خدمت پاسبانی کی دی اور سرفراز کیا، چنانچہ وہ شام سے صبح تک ہر ایک شب دولت خانے کی خبر داری کے واسطے جاگتا اور کھڑا ہو کر بادشاہ کے قصر کو دیکھا کرتا۔

اتفاقاً ایک شب آدھی رات کو بادشاہ بالا خانے پر کھڑا اِدھر اُدھر پھرتا تھا۔ نگاہ اس کی اس پاسبان پر پڑی۔ دیکھا کہ ایک شخص مستعد کھڑا ہے۔ تب اس نے پوچھا۔ ''اے شخص تو کون ہے جو اس وقت اس محل سرا کے نیچے کھڑا ہے۔'' اُس نے عرض کی: ''خداوند!'' میں پاسبان اس دولت خانے کا ہوں، خبر داری کے واسطے اس محل سرا کی کتنے دنوں سے شام سے صبح تک حاضر رہتا ہوں اور امیدوار تھا کہ جمال مبارک حضرت کا دیکھوں اور اپنی آنکھیں روشن کروں، بارے آج کی شب قسمت نے یاوری کی کہ دیدار خداوند عالم کا دیکھا، دل کو شاد کیا۔''

اتنے میں ایک آواز جنگل کی طرف سے بادشاہ کے کان میں آئی ''میں جاتی ہوں، ہے کوئی ایسا مرد جو مجھ کو پھیر لاوے۔'' یہ بات سنتے ہی بادشاہ متعجب ہو کر اس سے کہنے لگا: ''اے پاسبان! تو بھی کچھ اس آواز کو سنتا ہے کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے؟'' اس نے عرض کی کہ ''خداوند! میں تو کئی شب سے سنتا ہوں کہ بعد آدھی رات کے یہ آواز یونہی آتی ہے لیکن میں خدمت پاسبانی

طبرستان: ایک خیالی مقام کا نام
بہشت: جنت
مرد بیگانہ: اجنبی شخص
شمشیر زن: تلوار چلانے والا
شیر گیر: شیر پکڑنے والا
سنگِ خارا: ایک قسم کا سخت پتھر
دوسار ہونا: آر پار ہونا
سپہ گری: سپاہی کا کام
امیر خجند: خجند کا سردار
قرار واقعی: بخوبی
سخن: بات
اہل کار: کارندہ
بالفعل: فی الحال
بہ موجب: مطابق
ارکان دولت: وزراء
پاسبانی: چوکیداری
سرفراز کرنا: عزت افزائی کرنا
قصر: محل
خداوند: (مراد) بادشاہ
یاوری: مدد

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

کی رکھتا ہوں، محل سرا چھوڑ کر جا نہیں سکتا۔ اس واسطے اس کو دریافت نہیں کر سکا کہ یہ آواز کس کی ہے اور کہاں سے آتی ہے، اگر شاہِ جہاں ارشاد کریں تو ابھی جاؤں، شتاب اس کو دریافت کر کے حضور پرنور میں عرض کروں۔" بادشاہ نے فرمایا کہ "بہتر، جا جلد جا اور سچ خبر حضور میں آ کر گزارش کر۔"

وہ پاسبان یوں ہی خبر لینے چلا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ بادشاہ بھی ایک کمبل سیاہ اوڑھ، سارا بدن اور منہ اس سے چھپا کر اس کے پیچھے ہولیا۔ پاسبان تھوڑی دور جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک عورت، حسین خوب صورت، ایک درخت کے نیچے اس راہ میں کھڑی ہے اور یہی کہتی ہے کہ "میں جاتی ہوں، دیکھوں تو کون ایسا مرد ہے جو مجھے پھیر لاوے اور نہ جانے دے" تب اُس نے پوچھا کہ "اے بی بی صاحب جمال پری پیکر! تو کون ہے اور یہ بات کس لیے کئی شب سے کہتی ہے؟" اُس نے کہا، "میں تصویر عمر بادشاہ طبرستان کی ہوں۔ وعدہ اس کا برابر ہوا ہے، اب اس واسطے میں جاتی ہوں۔" یہ سخن سنتے ہی پاسبان نے کہا کہ، اے تصویر، عمر بادشاہ! اب تو کس طرح پھر مراجعت کرے گی اور آوے گی۔" اس نے کہا کہ "اے پاسبان! ایک صورت سے، اگر تو اپنے بیٹے کو اس کے عوض ذبح کرے تو البتہ مراجعت کروں تا بادشاہ پھر چندروز اس جہاں میں زندگی کرے اور جلدی نہ مرے۔"

یہ بات بادشاہ نے بھی سنی اور پاسبان نے نہایت خوش ہو کر جواب دیا کہ "اے صورت عمر بادشاہ! اپنی عمر اور اپنے بیٹے کو بادشاہ کی عمر پر نثار و تصدق کرتا ہوں، جلدی مت کر، تو یہیں کھڑی رہ، میں ابھی اپنے گھر جاتا ہوں اور بیٹے کو لا کر تیرے سامنے ذبح کرتا ہوں، میں اس سے ہاتھ اٹھاؤں گا بادشاہ کی سلامتی کے واسطے ماروں گا۔" حاصل کلام۔ یہ کہہ کر اپنے گھر گیا، بیٹے سے کہنے لگا "بیٹا! آج بادشاہ کی عمر تمام ہوئی ہے، کوئی دم میں وہ مرتا ہے، اگر تو اپنی عمر اس کو دے تو وہ تیرے مرنے سے جیے اور چندروز اس دنیا میں رہے۔" وہ لڑکا نیک بخت و وفادار، اس بات کو سنتے ہی کہنے لگا کہ "اے قبلہ و کعبہ! وہ بادشاہ منصف و عادل ہے، ایسے والی، صاحب سخا، اہل ہمت، غریب پرور، کرم بخش کے بدلے ایک میں کیا اگر تمام گھر تمہارا، کام آوے تو تم قصور نہ کرنا کیوں کہ ایک مجھ ناچیز، اگر اس کے صدقے ہوا تو ہوا، وہ جیتا رہا تو ایک عالم کو پرورش کرے گا۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے جلد لے چلو اور اس کے اوپر صدقے کرو۔ تو میں سعادتِ دارین حاصل کروں کیوں کہ ایک تو آپ کا کہنا، دوسرے ایسے بادشاہ پر نثار ہونا، اس سے بہتر بات میرے واسطے اس جہاں میں اور کوئی نہیں۔"

آخر وہ پاسبان اپنے بیٹے کو اس عورت کے پاس لے گیا، اور اس کے ہاتھ پانو باندھ، جھک کر ایک خنجر تیز سے چاہتا تھا کہ اس کا گلا کاٹے کہ اتنے میں اس عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ "اے پاسبان! اپنے بیٹے کو ذبح مت کر اور اس کا گلا مت کاٹ، حق تعالیٰ کو تیری ہمت پر رحم آیا اور مہربان ہو کر مجھے پھر ساٹھ برس کا حکم کیا کہ بادشاہ کے قالب میں رہ" جس وقت پاسبان نے اس خوشی کی خبر کو سنا بہت خوش ہوا اور اس گھڑی بادشاہ کو خبر دینے چلا۔
یہ حالت بادشاہ طبرستان نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور بات چیت پاسبان کی اور اس کے بیٹے کی کما حقہ، دریافت کی، پھر اس کے پہنچنے سے پہلے دوڑ کر اپنے تئیں بدستور اس بالا خانے پر پہنچایا اور اسی طرح سے اس پر پھرنے لگا اور بعد ایک گھڑی

یونہی: اسی وقت، فوراً
شتاب: جلدی
پری پیکر: خوب صورت
مراجعت: واپسی
تا: تا کہ
نثار کرنا: قربان کرنا
تصدق ہونا: واری جانا، صدقہ میں دینا
قبلہ و کعبہ: (مراد) باپ
منصف: انصاف کرنے والا
والی: مالک
صاحب سخا: سخی
قصور: غلطی
دارین: دار کی جمع۔ دنیا و آخرت
قالب: جسم

gs\Administrator\Desktop\ Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

کے وہ پاسبان بھی حضور پر نور میں آیا اور تسلیمات بجالا کر دعاء دینے لگا کہ عمر و دولت و جاہ وحشمت شاہنشاہ کی تا قیامت رہے۔

بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ ''اے پاسبان! وہ کیسی آواز تھی کچھ تو نے دریافت کیا؟ تو مفصل بیان کر!'' اس نے دست بستہ ہو کر عرض کی! ''اے خداوند! ایک عورت حسین و صاحب جمال اپنے خاوند سے لڑ کر جنگل میں نکل آئی تھی اور ایک درخت کے نیچے اس راہ میں بیٹھی رو رہی تھی اور بہ آواز بلند یہی کہتی تھی کہ ''میں نہ رہوں گی'' تب میں اس کے پاس گیا اور میٹھی میٹھی باتوں سے بہلایا اور اچھے اچھے سخن سمجھا بجھا کر اس کے شوہر سے ملا دیا۔ دوستی ان دونوں میں کرادی، اب اس نے مجھ سے اقرار کیا ہے کہ میں ساٹھ برس تک اپنے شوہر کے گھر سے نہ نکلوں گی۔''

بادشاہ نے یہ دانائی اور جانفشانی اس کی اور جرأت اس کے بیٹے کی دیکھی تھی، فرمایا کہ اے پاسبان! جس وقت تو اس کی خبر لینے چلا تھا میں بھی تیرے پیچھے پیچھے چلا تھا۔ سب سوال و جواب تیرے بیٹے کے اور اطوار اس عورت کے اپنی آنکھوں سے اور کانوں سے دیکھے اور سنے، خیر اگر چہ اگلے وقت میں تو محتاج و غریب، ذلیل و پریشان تھا اور اب میری پاسبانی میں نوکر ہوا ہے۔ انشاءاللہ روز بروز بہبودی اور ترقی تری ہوگی اور گھڑی بہ گھڑی سلوک پر سلوک کروں گا۔''

یہ کہہ کر بادشاہ آرام کرنے گیا، بعد دو چار گھڑی کے صبح ہوئی، بادشاہ تخت پر نکل بیٹھا اور پاسبان کو یاد کیا، پھر سب وزیروں، امیروں اور اہل کاروں کو جمع کر کے فرمایا کہ ''اے حاضرانِ پائے تخت، میں نے اسے بہ خوشی تمام اپنا ولی عہد کیا اور مال واسباب وخزانہ سب اپنی رضامندی سے اسے دیا۔''

کماحقہ: ٹھیک ٹھیک، جیسا ہونا چاہیے

اپنے تئیں: خود کو

جاہ وحشمت: شان وشوکت

دست بستہ: ہاتھ باندھ کر

دانائی: عقلمندی

جانفشانی: محنت

جرأت: ہمت

اطوار: طور کی جمع۔ طور وطریقے

ولی عہد: شہزادہ

2.2 متن کی تشریح

ایک دن بادشاہ۔۔۔۔ آکر گزارش کی

کہانی کے اس حصے میں مصنف نے بتایا ہے کہ طبرستان کے بادشاہ کے محل میں شہر کے مشہور اور باصلاحیت لوگوں کی دعوت ہو رہی تھی کہ ایک اجنبی آدمی اجازت لیے بغیر محفل میں گھس آیا، لوگوں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ تلوار چلانے کے فن میں ماہر ہے، شیر کو پکڑ سکتا ہے اور اتنا اچھا تیرانداز ہے کہ اس کے تیر پہاڑوں کے آر پار ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ اس کے اندر اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ اگر طبرستان کا بادشاہ اسے اپنے یہاں نوکر رکھ لے گا تو وہ دل وجان سے اس کی خدمت کرے گا۔ بادشاہ طبرستان نے غور سے اس کی باتیں سنیں اور اسے اپنے محل کا دربان بنا دیا۔

ایک رات بادشاہ اپنے محل کے بالا خانے پر ٹہل رہا تھا کہ ایک آدمی کو اپنے محل کے دروازے پر کھڑا دیکھا اس سے پوچھا، تم کون ہو؟ اس نے بتایا کہ میں محل کا چوکی دار ہوں۔ آپ کو دیکھنے کی میری بڑی خواہش تھی سو پوری ہوئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محلوں میں جو نوکر چاکر رکھے جاتے تھے۔ انہیں بادشاہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ سب کام بادشاہ کے وزیر کیا کرتے تھے۔ اسی لیے بہت سے نوکر چاکر بادشاہ کو کبھی نہیں دیکھ پاتے تھے۔

بادشاہ ابھی یہ بات کر رہا تھا کہ جنگل کی طرف سے ایک آواز سنائی دی کہ ''میں جاتی ہوں، ہے کوئی جو مجھے پھیر لاوے۔'' بادشاہ کے پوچھنے پر دربان نے بتایا کہ یہ آواز تو میں روز سنتا ہوں مگر آپ کی اجازت کے بغیر میں نے اس کے بارے میں کچھ

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں مصنف نے بتایا ہے کہ دربان بے حد فرض شناس تھا اور جو کام اسے سونپا گیا تھا وہ اسے پوری ذمہ داری سے پورا کر رہا تھا۔ یہ آوازیں روز سنتا تھا اس کے بارے میں پتہ بھی لگانا چاہتا تھا۔ مگر چونکہ بادشاہ کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ اس آواز کے پیچھے نہیں جاتا تھا۔ اب بادشاہ نے اس سے کہا کہ جلد جا کر پتہ لگاؤ اور فوراً مجھے خبر کرو۔

2.3 زبان کے بارے میں

اس حصے میں مندرجہ ذیل جملے آپ نے پڑھے:

- ''کھانے انہوں نے کھائے''، ''شرابیں انہوں نے پیں''، ''میں پاسبان اس دولت خانے کا ہوں''، ''میں خدمت پاسبانی کی رکھتا ہوں۔''
- آج کل اس طرح نہیں بولا جاتا یہ پرانی زبان ہے۔ آج ان جملوں کو اس طرح بولیں گے ''انہوں نے کھانے کھائے اور شراب پی''، ''میں اس دولت خانے کا پاسبان ہوں۔'' ''میں پاسبانی کرتا ہوں۔''

متن پر سوالات 2.1

درست جواب پر ( ) کا نشان لگائیے۔

1. دعوت کا اہتمام کس نے کیا تھا؟
   (i) امیر خجند نے
   (ii) امیر طبرستان نے
   (iii) امیر خراسان نے
2. ''دوسار'' کے معنی ہیں......
   (i) آر پار ہو جانا
   (ii) دور کھڑے ہو جانا
   (iii) بہت دور چلے جانا
3. بادشاہ کی اجازت سے پہلے دربان آواز کے پیچھے کیوں نہیں گیا؟
   (i) کام چور تھا
   (ii) دربان بزدل تھا
   (iii) دربان بڑا فرض شناس تھا

gs\Administrator\Desktop\ Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

2.4 متن کی تشریح

وہ پاسبان۔۔۔۔۔رضامندی اسے دیا

بادشاہ کی اجازت پاتے ہی دربان فوراً اس آواز کے پیچھے چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ طبرستان بھی کمبل اوڑھ کر دربان کے پیچھے پیچھے چلا اس نے دربان اور عورت کی ساری بات چیت سنی۔ اس کے بعد دربان کا اپنے بیٹے کو مار ڈالنے کا حال بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دربان کی وفاداری سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اس کی وفاداری کا دربان کو یہ انعام دیا کہ اسے اپنا ولی عہد بنا کر اپنا تاج وتخت سب کچھ سونپ دیا۔

2.5 زبان کے بارے میں

1. داستان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسی خیالی باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو عام زندگی میں ممکن نہیں ہیں۔ داستان کے اس حصے میں آپ نے پڑھا کہ بادشاہ کی عمر عورت کی شکل میں دربان سے بات چیت کر رہی ہے۔

2. تصویر عمر بادشاہ طبرستان سے مصنف کی مراد بادشاہ کی عمر سے ہے۔ جب مصنف کسی جذبے یا کسی نظر نہ آنے والی چیز کو شکل دے دیتا ہے یا جسم کی صورت میں پیش کرتا ہے اسے ''تجسیم کرنا'' کہتے ہیں۔ اس میں مصنف نے بادشاہ کی عمر کو عورت کی شکل میں مجسم کر دیا ہے۔ اس میں ایک نازک اور خوب صورت پہلو یہ بھی ہے کہ عمر کو مونث بولتے ہیں، اس لیے اسے عورت کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔

3. دربان کا بیٹا نیکی اور فرماں برداری کی زندہ مثال ہے۔ باپ کے کہنے پر اس لیے اپنی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ اس کے بجائے بادشاہ کے زندہ رہنے سے رعایا کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ کیوں کہ وہ ایک بہادر، انصاف پسند اور غریبوں کی مدد کرنے والا بادشاہ ہے۔ آج کل یہ بھی ایک افسانوی بات معلوم ہوتی ہے ورنہ آج کل کون کسی غیر کے لیے قربانی دیتا ہے۔

متن پر سوالات 2.2

درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے۔

1. تصویر عمر بادشاہ طبرستان سے مراد ہے۔

   (i) بادشاہ کی عمر۔

   (ii) بادشاہ کی تصویر۔

   (iii) بادشاہ کا جسم۔

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

2. دربان نے بادشاہ سے غلط بیانی کی کیوں کہ وہ......

(i) وہ جھوٹا تھا

(ii) وہ بے غرض اور وفادار تھا اور اپنا احسان نہیں جتانا چاہتا تھا

(iii) وہ بیوقوف تھا

3. ''تجسیم کرنے'' کا مطلب ہے......

(i) ترتیب دینا

(ii) تمثیل کرنا

(iii) کسی جذبے یا نظر نہ آنے والی چیز کو مجسم بنا دینا

4. دربان بادشاہ کا ولی عہد بن گیا کیوں کہ وہ

(i) بہت چالاک تھا

(ii) بادشاہ بہت بے وقوف تھا

(iii) دربان بہت وفادار تھا

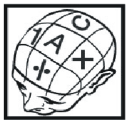

آپ نے کیا سیکھا

- داستان ''طوطا کہانی'' حیدر بخش حیدری کی لکھی ہوئی ہے۔
- ''حصہ حق وفاداری'' اسی داستان سے ماخوذ ہے۔
- داستان میں بہت سی ایسی باتوں کا ذکر ہوتا ہے جو عام زندگی میں نظر نہیں آتیں۔
- تجسیم کرنے کا مطلب ہے کسی جذبے یا کسی نظر نہ آنے والی چیز کو مجسم کر دینا، انہیں جسم دے دینا۔
- اس کہانی سے ہمیں وفاداری اور فرض شناسی کا سبق ملتا ہے۔
- اس کہانی کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سخاوت، بہادری، ہمدردی، انصاف پسندی اور رعایا سے محبت کرنا اچھے بادشاہوں کے اوصاف تھے۔

2.6 اسلوب بیان

حیدر بخش حیدری نے داستان ''طوطا کہانی'' فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے دوران فارسی سے ترجمہ کی تھی۔ اس لیے اس کی زبان آسان ہے، عبارت صاف، شستہ اور بامحاورہ ہے۔ یہ کتاب آج سے تقریباً 200 سال پہلے لکھی گئی تھی۔ مگر حیدری نے کتاب میں عام بول چال کا انداز اختیار کیا ہے۔ اسلوب سادہ، صاف اور رواں ہے۔ حیدر بخش حیدر کا اسلوب فارسی کے عام

gs\Administrator\Desktop\
Print\nOTE\NOTE1.tif not
found.

اور موزوں الفاظ کی کثرت اور ہندی کے مناسب امتزاج سے بنا ہے۔ یعنی ان کے یہاں اردو اور ہندی کے الفاظ روزمرہ کی زبان میں بڑی خوبصورتی و خوش اسلوبی سے شیر وشکر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے فارسی کی وہی ترکیبیں اور محاورے استعمال کیے ہیں جو اردو کے مزاج کے مطابق ہیں۔ اس لیے فارسی قافیے، تشبیہہ اور استعارے اس میں غیر محسوس طور پر کھپ گئے ہیں۔

مزید مطالعہ

حیدر بخش حیدری کی داستان ''آرائش محفل'' یا کوئی اور داستان پڑھیے۔

2.10 اختتامی سوالات

1. کہانی ''حق وفاداری'' کس داستان کا حصہ ہے؟
2. داستان ''طوطا کہانی'' کس مصنف کی لکھی ہوئی ہے؟
3. تجسیم کرنا کسے کہتے ہیں؟
4. دربان کی کس بات سے خوش ہو کر بادشاہ نے اسے ولی عہد بنا دیا، دس جملوں میں لکھیے؟
5. مندرجہ ذیل جملوں کو آج کی زبان میں کیسے لکھیں گے؟
   - (i) میں تصویر عمر بادشاہ طبرستان ہوں۔
   - (ii) وعدہ اس کا برابر ہوا ہے، اب اس واسطے جاتی ہوں۔
   - (iii) پھر اس کے پہنچنے سے پہلے دوڑ کر اپنے تئیں بدستور اس بالا خانے پر پہنچا۔
   - (iv) بادشاہ نے یہ دانائی اور جانفشانی اس کی اور جرأت اس کے بیٹے کی دیکھی تھی۔
   - (v) انشاءاللہ روز بروز بہبودی اور ترقی تیری ہوگی اور گھڑی بہ گھڑی سلوک پر سلوک کروں گا۔

متن پر سوالات کے جوابات

2.1
1. (ii)
2. (ii)
3. (iii)

2.2
1. (i)
2. (ii)
3. (iii)
4. (iii)

NOS\NOTE2.tif not found.

3

منشی پریم چند

مصنف کا تعارف

منشی پریم چند اپنے زمانے کے بہت ہی مشہور مصنف مانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش وارانسی (بنارس) سے چھ کلومیٹر دور لمہی گاؤں میں 31 جولائی 1880ء کو ہوئی اصل نام دھنپت رائے تھا۔ لیکن افسانہ و کہانی کی دنیا میں منشی پریم چند کے نام سے مشہور ہوئے۔

ان کے والد منشی عجائب لال ڈاکخانہ میں ملازم تھے۔ کم عمری میں والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ پرورش کی ذمہ داری دادی نے سنبھالی لیکن جلد ہی وہ بھی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ایک گاؤں میں آٹھ برس کی عمر تک ایک مولوی صاحب سے حاصل کی۔ والد نے دوسری شادی کر لی۔ نئی ماں کے سخت برتاؤ نے ان کی زندگی میں تلخی پیدا کر دی۔ جس کے لیے خود ان کا کہنا ہے ''میری ماں کے انتقال کے بعد میری روح کو خوراک نہیں ملی وہی بھوک میری زندگی ہے''۔
غریبی، گھٹن، روکھے پن سے نجات حاصل کرنے کے لیے پریم چند نے مضامین اور افسانے دھنپت رائے کے نام سے لکھنے شروع کیے۔ اپنے ناول کرم بھومی کے کردار کے ذریعے آپ بیتی سنائی ہے۔ والد کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا شہر کا ماحول پسند آیا اور گلی ڈنڈا چھوڑ کر دل لگا کر پڑھائی کی۔ میٹرک پاس کیا۔ اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ مدرسی تو کر لی لیکن ہمیشہ پچھتایا کرتے تھے کہ کہاں سے جنگل میں آ پھنسا۔ 1921ء میں مہاتما گاندھی نے جب عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو پریم چند نے ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

1903-4ء کے دوران پریم چند نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز کانپور سے شائع ہونے والے رسالے ''زمانہ'' میں اپنے افسانے

NOS\NOTE1.tif not found.

لکھ کر کیا۔ 2-1901ء میں انہوں نے دو ناول لکھے۔ پریم چند کی پہلی کہانی ''سنسار کا سب سے انمول رتن'' تھی۔ انہوں نے کہانیوں کو اس وقت اپنایا جب اردو میں داستان گوئی کا دور تھا انہوں نے کہانیوں کو طلسمی، عیاری، قدیم داستانوں و قصوں کتھاؤں سے باہر نکال کر نئے انداز اسلوب کو تعین کرنے میں بڑی کامیاب کوشش کی۔ انہوں نے کہانی کا رشتہ ہمارے دیہات اور محنت کش طبقے سے جوڑ دیا یعنی کہانی رومان بھری فضاء سے نکل کر حقیقت سے قریب ہوگئی۔ اور افسانہ کو مختصر کر کے زندگی کا ترجمان بھی بنایا۔ انہوں نے زندگی کی بے شمار چھوٹی بڑی سچائیوں کو خوشیوں اور غموں کو اپنی کہانی کے ذریعے بیان کیا۔ ہندوستان کے دیہاتوں کی خوبصورتی اور وہاں کے عوام کی سادگی، خلوص، پریشان حالی، مفلسی اور بےبسی کی سچی اور بڑی واضح تصویریں پیش کیں۔ پریم چند نے ملک میں پھیلی خام خیالی، تنگ نظری، جہالت، بے جا رسم ورواج کی پابندی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کے افسانے واقعات کی ترجمانی کرتے ہیں ساتھ ہی زبان کی سادگی، سلاست اور جذباتی خلوص کا بھی اچھا نمونہ ہے۔ ان کی کہانی کے مجموعہ سوز وطن، پریم پچیسی، بزم بتیسی، آخری تحفہ، دودھ کی قیمت۔ کفن کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

پوس کی رات بھی ان کی ایسی کہانی ہے جس کے پس منظر میں ایک ایسے کسان کی زندگی کا حال پیش کیا ہے۔ جو ہر طرح کی راحتوں سے محروم ہے اس کی پیداوار بھی اس کی نہیں اس کے قرض کا بوجھ ایسا قرض ہے جو اس کے سر سے اُترتا ہی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ پیر سردی میں جکڑے و اکڑے ہی رہتے ہیں۔ اس کی بےبسی کی داستان پریم چند نے تحریر کی ہے۔

مقاصد

1. دیہات اور کسان کی زندگی کے بارے میں جان سکیں گے؛
2. محاورات کے معنی سمجھ کر ان کے معنی جان سکیں گے؛
3. دیہی زندگی کے سماجی، معاشی مسائل اور حقیقت کو جان سکیں گے؛
4. افسانہ میں پائی جانے والی دلکشی، رنگینی اور رومان کو جان سکیں گے؛
5. افسانہ اردو نثر کی اہم صنف ہے جان سکیں گے؛
6. افسانہ کے ذریعے زندگی کی گہرائی و وسعت کے بارے میں کم الفاظ میں بڑی بات کہی جاتی ہے جان سکیں گے؛
7. پریم چند کے افسانوں کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

3.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

پوس کی رات

ہلکو نے اپنی بیوی سے آ کر کہا،''شہنا آیا ہے لاؤ جو روپے رکھے ہیں اُسے دے دوں، کسی طرح گردن تو چھوٹے۔منّی بہو جھاڑو لگا رہی تھیں پیچھے پھر کر بولی،''تین ہی تو روپے ہیں دے دوں تو کمبل کہاں سے آئے گا؟ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔اس سے کہہ دو کہ فصل پر روپے دے دیں گے۔ابھی نہیں ہیں۔''

ہلکو تھوڑی دیر تک چپ کھڑا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا! پوس سر پر آ گیا ہے بغیر کمبل کے رات کو وہ کسی طرح کھیت پر نہیں سو سکتا۔مگر شہنا مانے گا نہیں۔وہ گھڑکیاں دے گا۔گالیاں سنائے گا بلا سے جاڑے میں مریں گے، یہ بلا تو سر سے ٹل جائے گی— یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا۔اپنی بیوی کے پاس گیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا، لا دے دے۔گردن تو کسی طرح سے بچے۔کمبل کے لیے کوئی تدبیر سوچوں گا۔

منی اس کے پاس سے دور ہٹ گئی اور آنکھیں ٹیڑھی کر کے بولی''کر چکے دوسری تدبیر ذرا سنوں کون سی تدبیر کرو گے؟ کون کمبل خیرات میں دے دے گا۔نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔میں کہتی ہوں تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے مر مر کر کام کرو پیداوار ہو۔تو اس سے باقی ادا کرو چلو چھٹی ہوئی باقی چکانے کے لیے ہی تو ہمارا جنم ہوا ہے— ایسی کھیتی سے باز آئے میں روپے نہ دوں گی۔نہ دوں گی۔''

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا— ''تو کیا گالیاں کھاؤں؟'' منی نے کہا،''گالی کیوں دے گا؟ کیا اس کا راج ہے؟'' مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھنویں ڈھیلی پڑ گئیں— ہلکو کی بات میں جو دل دہلا دینے والی سچائی تھی۔معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی— اس نے طاق پر سے پیسے اٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔پھر بولی ''کھیت مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو چین سے کھانے کو ملے گی، کسی کی دھونس تو نہ رہے گی— اچھی کھیتی ہے مزدوری کر کے لاؤ وہ بھی اس میں جھونک دو۔اس پر سے دھونس الگ!''

ہلکو نے روپے لیے اور اس طرح باہر چلا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپے کمبل کے لیے جمع کئے تھے، وہ آج نکلے جا رہے ہیں۔ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا!

گردن تو چھوٹے: مصیبت سے نجات دلانا
کیسے کٹے گی: گزرنا بیتنا
پوس: شدید سردی کا مہینہ جو انگریزی مہینے کے حساب سے دسمبر جنوری کا ہوتا ہے۔
بلا تو سر سے ٹل جائے: مصیبت ختم ہونا
آنکھیں ٹیڑھی کرنا: بے مروّتی کرنا
باز آنا: چھوڑ دینا
بھنویں ڈھیلی پڑنا: غصہ کم ہونا
ٹکٹکی باندھے ہونا: بنا پلک جھپکائے دیکھنا، لگاتار دیکھنا
چین سے: آرام سے، بے فکری سے
دھونس: دھمکی، ڈراوا
ناداری: مجبوری، لاچاری، کنگالی

(2)

پوس کی اندھیری رات، آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے ہلکو اپنے کھیت کے کنارے روکھ کی پتیوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتّا

NOS\NOTE1.tif not found.

''جبرا'' پیٹ میں منہ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا— دونوں میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا: ''کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے— کہا تو تھا کہ گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اب کھا سردی۔ میں کیا کروں؟ جیسے کہ میں حلوا پوری کھانے جا رہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے آگے آگے چلے آئے۔ ''اب روؤ اپنی نانی کے نام کو— ''

جبرا نے پڑے پڑے دُم ہلائی اور ایک جمائی لے کر چپ ہو گیا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا۔ کہ اس کی کوں کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آرہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا: ''کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے۔ یہ رانڈ پچھوا ہوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آرہی ہے۔ اُٹھو پھر ایک چلم بھرو۔ کسی طرح رات تو کٹے۔ اُٹھ چل تو پی چکا۔ یہ کھیتی کا مزہ ہے اور بھگوان کچھ ایسے بھی ہیں کہ — جن کے پاس جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے موٹے گدّے، لحاف، کمبل، مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے۔ تقدیر کی خوبی ہے مزدوری ہم کریں، مزہ دوسرے لوٹیں۔''

ٹھنڈے ہونا: مر جانا

ہلکو اٹھا اور گڑھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری جبرا بھی اُٹھ بیٹھا۔ ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا، پیئے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔''

جبرا نے اس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہلکو نے کہا'' آج اور جاڑا کھالے۔ کل سے میں یہاں پیال بچھا دوں گا۔ اس میں گھس کر بیٹھنا جاڑا نہ لگے گا— ''

جبرا نے اگلے پنجے اس کے گھٹنوں پر رکھ دیئے اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی۔ چلم پی کر ہلکو پھر لیٹا اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو۔ اب کی سو جاؤں گا۔ لیکن ایک لمحے میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کبھی اس کروٹ لیٹتا کبھی اُس کروٹ۔ جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔ جب کسی طرح نہ رہا گیا۔ تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اُٹھایا اس کے سر کو تھپ تھپا کر اُسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتّے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آرہی تھی۔ پر اُسے اپنی گود سے چمٹائے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا۔ جو اُدھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ جنت یہیں ہے۔ اور ہلکو کی روح اتنی پاک تھی کہ اس کو کتے سے بالکل گِھن نہ آتی تھی۔ وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اس کی روح کے سب دروازے کھول دیئے تھے۔ اور اس کا ایک ایک ذرّہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ سُنی اس کے مالک کی اس خالص روحانیت نے اس کے دل میں ایک نئی طاقت پیدا کر دی تھی۔ جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی بے وقعت سمجھ رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور چھپّر سے باہر آکر بھونکنے لگا۔

کلیجہ کانپنا: شدید سردی لگنا

بے وقعت: حقیر

NOS\NOTE2.tif not found.

ہلکو نے اس سے کئی بار پچکار کر بلایا۔ پر وہ اس کے پاس نہ آیا۔ کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا۔ فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

(3)

ایک گھنٹہ گزر گیا، سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اُٹھ بیٹھا اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپا لیا۔ پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ اس نے اُٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ابھی کتنی رات باقی ہے؟ وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں۔ ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر پائے تھے۔ جب وہ اوپر آ جائیں گے تو کہیں سویرا ہوگا۔ ابھی ایک پہر سے زیادہ رات باقی ہے۔

منجمد ہونا: جم جانا

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک باغ تھا۔ پت جھڑ شروع ہو گیا تھا— باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہلکو نے سوچا چل کر پتیاں بٹوروں اور ان کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی پتیاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے گا کہ کوئی بھوت ہے۔ کون جانے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو۔ مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سلگتا ہوا اُپلا لیے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اُسے جاتے دیکھا تو پاس آیا۔ اور دُم ہلانے لگا۔

ہلکو نے کہا، ''اب تو نہیں رہا جاتا۔ جبرو، چلو باغ میں پتیاں بٹور کر تاپیں ٹانٹے ہو جائیں گے۔ تو پھر آ کر سوئیں گے، ابھی تو رات بہت ہے۔''

ٹانٹے ہونا: طاقتور، تگڑا

جبرا نے کوں کوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں— یکا یک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

گھٹاٹوپ: گھنا اندھیرا

ہلکو نے کہا— کیسی اچھی مہک آئی جبرا—! تمہاری ناک میں بھی خوشبو آ رہی ہے؟''

جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی۔ وہ اُسے چچوڑ رہا تھا۔ ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے، ننگے پاؤں گلے جاتے تھے۔ اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

جلا کر خاک کرنا: ختم کر دینا، تباہ کرنا
الاؤ: لکڑیاں ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ جلانا

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اُٹھا، اس کی لَو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی۔ اس ہلتی ہوئی روشنی میں باغ کے عالیشان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے وہ اس لا انتہائی اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اس اتھاہ

لا انتہا: بہت زیادہ۔ بے انتہا

NOS\NOTE1.tif not found.

سمندر میں روشنی ایک ناؤ کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبائی اور دونوں پاؤں پھیلا دیئے گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا— تیرے جی میں جو آئے وہ کر— سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا— اس نے جبرا سے کہا،'' کیوں جبرے! اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے؟''

بے پایاں: بہت زیادہ بے حد

جبرا نے کوں کوں کر کے گویا کہا،'' اب کیا ٹھنڈ لگے گی!''

پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی، نہیں تو اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے؟''

جبرا نے دُم ہلائی—

'' اچھا آؤ اس الاؤ کو کود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے۔ اگر جل گئے بچّہ تو میں دوانہ کروں گا۔''

جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی طرف دیکھا۔

'' منی سے کل نہ کہہ دینا ورنہ لڑائی کرے گی—''

یہ کہتا ہوا وہ اُچھلا اور اس الاؤ کے اوپر سے صاف نکل گیا۔ پیروں میں ذرا سی لپٹ لگ گئی۔ پر وہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

ہلکو نے کہا۔'' چلو چلو، اس کی نہیں۔ اوپر سے کود کر آؤ۔''

وہ پھر کودا اور الاؤ کے اس پار آ گیا۔

(4)

پتیاں جل چکیں تھیں— باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے ابھی کچھ کچھ آگ باقی تھی جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اٹھتی تھی۔ پر ایک لمحے میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی۔ اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا ایک گیت گنگنانے لگا۔ اس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی— پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی اُسے سستی دبائے لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا ہلکو کو ایسا محسوس ہوا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے کھیت میں آ گیا— شائد نیل گائیوں کا تھا۔ ان کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں— پھر ایسا معلوم ہوا کہ وہ کھیت میں چر رہی ہیں۔

اس نے دل میں کہا۔'' نہیں جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی جانور کھیت نہیں آ سکتا، نوچ ہی ڈالے گا— مجھے وہم ہو رہا ہے۔ اب تو کچھ دکھائی نہیں دیتا مجھے بھی؟ کیسا دھوکا ہوا—!

NOS\NOTE2.tif not found.

اس نے زور سے آواز لگائی۔ ''جبرا— جبرا— جبرا بھونکتا رہا۔ اس کے پاس نہ آیا۔

جانوروں کے چرنے کی آواز چر چر سُنائی دینے لگی ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا۔ مگر اسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایا ہوا مزے سے بیٹھا تھا— اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا، جانوروں کو بھگانا— ان کا پیچھا کرنا اسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لیے چلانے لگا—

''ہلو، ہلو— ہوہو— ہاہا— !''

مگر جبرا پھر بھونک اٹھا— جانور کھیت چر رہے تھے۔ فصل تیار ہے۔ مگر یہ ظالم جانور اس کا ستیاناس کئے ڈالتے ہیں۔

ہلکو پکا ارادہ کر کے اٹھا۔ اور دو تین قدم چلا پھر یکا یک ہوا کا ایک ایسا ٹھنڈا چبھنے والا، بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا کہ وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آبیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا۔ نیل گائیں کھیت کا صفایا کیے ڈالتی تھیں۔ اور ہلکو گرم راکھ کے پاس خاموش بیٹھا تھا۔ افسردگی نے اسے چاروں طرف سے اسی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

اسی راکھ کے پاس زمین پر وہ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ سویرے جب آنکھ کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ اور منی کھڑی کہہ رہی تھی— تم کہاں آ کر مر گئے اِدھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔

ہلکو نے اٹھ کر کہا، ''کیا تو کھیت سے اُٹھ کر آرہی ہے؟''

منّی بولی۔ ہاں سارے کھیت کا ستیاناس ہو گیا بھلا ایسا بھی کوئی سوتا ہے تمہارے یہاں منڈیّا ڈالنے سے کیا فائدہ ہوا؟

ہلکو نے بہانا کیا۔ ''میں مرتے مرتے بچا تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے پیٹ میں ایسا درد اٹھا تھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔''

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈے پر آئے دیکھا کھیت پر ایک پودے کا نام نہیں۔ جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے— گویا بدن میں جان ہی نہیں ہے۔

دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منّی کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ مگر ہلکو خوش تھا۔

منّی نے فکر مند ہو کر کہا۔ ''اب مجوری کر کے مال گجاری دینی پڑے گی۔'' ہلکو نے خوشی کے لہجے میں کہا، ''رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہیں پڑے گا۔''

''میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی۔ کہے دیتی ہوں'' جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں۔ مرنے کے لیے نہیں کرتے۔''

''جبرا ابھی تک سویا ہوا ہے۔ اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا—''

آج جا کر شہنا سے کہہ دو کھیت جانور چر گئے ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔ ''رات بڑے غضب کی سردی تھی۔''

میں کیا کہتی ہوں تم کیا سنتے ہو؟''

زہر معلوم ہونا: ناگوار ہونا

پہاڑ معلوم ہونا: مشکل معلوم ہونا

ستیاناس: برباد کرنا

صفایا: ختم کرنا، افسردگی، مایوسی

چوپٹ ہو گیا: ویراں ہو گیا برباد ہو گیا

منڈیا: کھیتوں کی رکھوالی کے لیے ڈالی گئی پھونس کی جھونپڑی

ڈانڈے: کھیت کی منڈیر

بدن میں جان نہ ہونا: بے دم ہونا

NOS\NOTE1.tif not found.

تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔شہنا کوان باتوں سے کیا مطلب۔تمہارا کھیت چاہے جانوروں نے کھایا۔چاہے آگ لگ جائے چاہے اولے پڑ جائیں، اسے تو اپنی مال گجاری چاہیے۔''

''تو چھوڑ دو کھیتی۔میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔''

ہلکو نے مایوسانہ انداز میں کہا— جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے۔کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں۔منی تجھ سے سچ کہتا ہوں۔مگر مجوری کا خیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے، کھیتی کا کام نہ بگاڑوں گا۔جبرا۔جبرا کیا سوتا ہی رہے گا۔چل گھر چلیں—

درگت: بری حالت

3.2 متن کی تشریح

(1)

ہلکو نے اپنی بیوی سے آ کر کہا.................ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔

اس حصے میں پریم چند نے پوس کی رات میں ایک کسان کی زندگی و مشکلات کے بارے میں بتایا۔پوس کا مہینہ بھارت میں دسمبر وجنوری کے مہینے کی وہ رات ہوتی ہے جس میں راتیں شدید ٹھنڈی ہوتی ہیں۔یہاں تک کہ رات میں پالا تک پڑتا ہے۔ایسی حالت میں ایک غریب کسان جنگلی جانوروں سے اپنے کھیت پر فصل کی حفاظت کے لیے ساری رات کس ماحول اور کتنی تکالیف برداشت کر کے گذارتا ہے۔

ایک موٹی سی چادر جو کہ انتہائی ٹھنڈ سے بچنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔اس کے ہاتھ پاؤں اس کی زندگی کی تکالیف کی کہانی سناتے ہیں کہ ہر طرح کی راحتوں سے محروم پیداوار کی حفاظت کرنا۔اور جس کی آمدنی اس کے قرض کا ایسا بوجھ ہے جو سر سے اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔''یعنی محنت کرو اور آرام بھی نہ پاؤ۔''

افسانہ مکالمہ سے شروع ہوا ہے اور محاوروں کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔کسان کی زندگی میں کیا کشمکش ہوتی ہے۔کس طرف اشارہ ہے۔اس کی زبان سے ایک کلمہ ادا ہوا ہے۔''باقی چکانے کے لیے ہمارا جنم ہوا ہے'' جو اس کی لاچارگی اور بے بسی کی طرف اشارہ ہے۔زمیندار کے کارندہ کا آنا کسان کے لیے ایک آفت سے کم نہیں ہے۔مجبوراً اسے قرض اتارنے کے لیے جو تین روپے کسی طرح بچائے تھے دینے پڑے۔دیتے وقت جو پریم نے اس کی روحانی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ وہ روپے کے بجائے ''اپنا کلیجہ نکال کردے رہا ہے۔'' ناداری کے بوجھ سے دبا جانا غریبی، مفلسی اور لاچاری کی طرف اشارہ ہے۔اس جملہ میں کہانی کی پوری روح سمٹ آئی ہے۔

3.3 زبان کے بارے میں

1. عام زبان کا استعمال کیا گیا ہے ''جیسے فصل پر دیدیں گے'' کسان اپنا قرض فصل سے حاصل آمدنی پر ہی ادا کرتا ہے۔ اور اپنی دیگر ضروریات کو بھی پورا کرتا۔
2. بات کو اہمیت دینے اور زوردار بنانے کے لیے محاورہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

3. کہانی میں مکالمہ کا زیادہ استعمال ہے۔

4. مکالمے برجستہ اور برمحل استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً کارندہ کا بار بار روپیہ مانگنا اور بیوی سے آ کر قرض چکانے کے لیے بار بار پیسہ مانگنا۔ اس کے انکار کرنے پر برجستہ ہلکو کا اس طرح کہنا ''کیا گالیاں کھاؤں''

متن پر سوالات 3.1

I. ماگھ پوس کی رات کسے کہتے ہیں؟ درست جواب پر صحیح ( ) کا نشان لگایئے۔

1. اندھیری رات
2. کڑاکے کی سرد رات
3. چاندنی رات

II. ''مرمر کر کام کرو پیداوار ہو تو اس سے باقی ادا کرو''

مذکورہ جملہ کس نے کہا درست جواب پر ( ) کا نشان لگایئے؟

الف) ہلکو نے

ب) منّی نے

ج) شینا نے

III. مکالمہ افسانہ کا اہم عنصر ہوتا ہے ''تو کیا گالیاں کھاؤں''

آپ کی نگاہ میں — درست پر ( ) کا نشان لگایئے۔

الف) مکالمہ ہے

ب) منظر ہے

ج) کردار ہے

IV. ''بلا سے چھٹی ہوئی'' آپ کیا کہیں گے درست پر صحیح کا نشان لگایئے۔

1. کہاوت
2. محاورہ
3. متعلق مثل

3.4 متن کی تشریح

(ii)
(2)

پوس کی اندھیری رات......................... بے چین کر رکھا تھا۔

اس حصے میں کہانی کے عروج کو دکھایا گیا ہے۔ یہ کہانی اس عہد کے ہندوستانی کسان کے اقتصادی و سماجی نظام کو پیش کرتی ہے جب مہاجن اور زمیندار کے قرض کے تلے ہندوستانی کسان کی کھیتی ایک گھاٹے کا سودا بن گئی تھی۔ ہلکو کو اپنے کھیت کی رکھوالی

NOS\NOTE1.tif not found.

میں دلچسپی نہیں وہ تو مجبوراً پوس کی اس رات میں کھیت کی حفاظت کرنے چلا جاتا ہے۔جس رات میں ٹھنڈ کی شدت کا منظر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ آسمان کے ستارے بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہے ہیں۔اور بچارہ غریب کسان جس کے پاس صرف ایک ہلکی سی چادر ہے کس طرح اپنے آپ کو ٹھٹھرن سے بچائے جبکہ شدید ٹھنڈ سے اس کی ہڈیاں تک کٹکٹا رہی ہوں۔

کہانی کا ایک اہم کردار کتا بھی ہے جو اپنے مالک کے لیے خاص طور پر وفادار ہوتا ہے۔اس کی ہر مصیبت اور خوشی میں شریک رہتا ہے اس کے اشاروں کو سمجھتا ہے۔ہلکو بھی اپنے من کے بوجھ کو کتے سے باتیں کر کے ہلکا کرتا ہے۔مارے محبت کے اسے اپنے گلے سے لپٹا لیتا ہے یہاں تک کہ اسے کتے سے آنے والی بدبو کا بھی احساس نہیں ہوتا ہے۔کتا بھی اپنے مالک کی محبت اور وفاداری میں اس شدید سردی میں کھیت کی حفاظت کے لیے چلا آتا ہے۔سچ یہ ہے کہ پرانے زمانے سے کتے کا یہ کردار آدمی کے کام آتا رہا ہے۔یہاں بھی کتا دوڑ دوڑ کر کھیت کو نقصان پہنچانے والے والے جانوروں کو بھگاتا ہے۔پریم چند نے اس عمل کے ذریعے محبت اور فرض کی ادائیگی کے تعلق کو سمجھایا ہے۔

3.5 زبان کے بارے میں

1. افسانے کے اس حصے میں پریم چند نے پوس کی کپکپا دینے والی سرد مار کا خوبصورت منظر پیش کیا ہے۔افسانے کا اہم عنصر منظر نگاری ہوتا ہے۔پریم چند کو منظر نگاری میں کمال حاصل ہے۔مثلاً سردی کتنی شدید پڑ رہی ہے۔اس کے اظہار کے لیے اس حصے کے شروع میں ہی آسمان پر ستاروں کو بھی ٹھٹھرے ہوئے بتایا گیا ہے۔جب بات میں وزن پیدا کرنا ہو تو چیزوں کو بڑھا چڑھا کر یعنی مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔مبالغہ کلام میں شدت تاثیر کا نام ہے۔

2. اس حصے میں افسانہ نگار نے ٹھنڈی رات یا جاڑے کی سرد کالی رات کو بھوت سے ایک خوبصورت تشبیہ دے کر کہانی میں حُسن پیدا ہے ''جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔'' تشبیہ قدر مشترک کی تلاش اور اس کے اظہار کا نام ہے۔

3. تصوف و روحانیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا خوبصورت و پُر اثر الفاظ کا استعمال کیا ہے جو زبان کی سادگی و حقیقت بیانی بھی ہے کہ ''ایک ایک ذرّہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا ہے۔''

متن پر سوالات 3.2

I. پوس کی رات میں ہلکو کس سے بات کر رہا تھا۔درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگایئے؟

1. جبرا (کتا) سے
2. اپنے آپ سے
3. منی سے

NOS\NOTE2.tif not found.

II. ''بھوت کی مانند کیا ہے'' صحیح پر (✓) کا نشان لگائیے۔

1. تشبیہ
2. استعارہ
3. صفت

III. قرض کی ادائیگی نے اُسے بے چین کر رکھا تھا۔ درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے؟

1. ہلکو کو
2. جبرا کو
3. منی کو

IV. افسانے کے اس حصے (جملہ) میں کس پر زور دیا گیا ہے؟

1. مکالمے پر
2. منظر نگاری پر
3. تشبیہہ پر

3.6 متن کی تشریح

کہانی کے اس حصے میں ہلکو کسان کی زندگی اور اس کی مشکلات کو[3] پیش کرنے میں جزئیات نگاری سے بڑی خوبصورتی سے کام لیتے ہوئے چھوٹی چھوٹی و باریک باریک چیزوں پر بھی نگاہ رکھی گئی ہے۔ مثلاً جاڑے کی برف جیسی ٹھنڈی رات بغیر جاڑ ادل (لحاف، کمبل، بچھونا) کے کس مشکل و مصیبت سے کٹتی ہے اور دونوں سردی سے ٹھٹھرتے ہیں۔ اسی اثناء میں کتے کو ایک ہڈی مل گئی تھی۔ جسے چوسنے کا بیان اس باریک سے پہلو پر نگاہ رکھنے سے کتے کی حقیقی تصویر سامنے آئی ہے۔ یعنی کسان ہلکو اور اس کے کتے کی مختلف طرح کی حرکات وسکنات کو پریم چند نے بیان کیا ہے۔

اس حصے میں الاؤ جلا کر جبرا اور ہلکو اس کے گرد بیٹھنے اور رات ہی میں آگ کو پھلانگنے کا منظر پیش کرنا بھی اس افسانے میں انوکھا پن پیدا کرتا ہے۔ عام طور پر اس طرح کی حرکت بچے کرتے ہیں۔ مگر یہاں وقت گزارنا ہلکو کے لیے ایک عذاب بن گیا ہے۔ جس کی شدت کو کم کرنے کے لیے وہ بچوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔

3.7 زبان کے بارے میں

1. کہانی کے اس حصے میں جزئیات نگاری پر خاص از ور دیا گیا ہے۔ افسانہ یا کہانی میں مناظر کا ہو بہو باریکی سے بیان کا نام جزئیات نگاری ہے۔

NOS\NOTE1.tif not found.

2. وقت کا اندازہ لگانے کے لیے سات ستاروں کا ذکر کیا ہے جسے سات ستاروں کا جھمکا کہتے ہیں۔
''ایک پہر باقی ہے''یعنی ابھی صبح ہونے میں کافی وقت باقی ہے۔ یہاں ستارہ شناسی کی واقفیت کرائی گئی ہے۔

3. اس حصے میں بھی خوبصورت تشبیہہ کا استعمال کر کے حقیقت کو رونما کیا ہے مثلاً اندھیرے کو اتھاہ سمندر سے تشبیہہ دی ہے اور روشنی کو ایک ناؤ سے (یعنی زندگی سے)۔

متن پر سوالات 3.3

I. ہلکو نے کیسے اندازہ لگایا کہ کتنی رات گزر چکی ہے؟
صحیح پر (✓) نشان لگائیے۔

1. گھڑی دیکھنے سے
2. سات ستاروں کے گھومنے سے
3. روشنی ہونے سے

II. اب کیا ٹھنڈ لگے گی یہ جملہ کس نے کہا؟ درست جواب پر (✓) نشان لگائیے۔

1. ہلکو نے
2. جبرا نے
3. منی نے

III. افسانہ کے اس حصے میں افسانے کے کسی عنصر پر زیادہ زور دیا گیا ہے درست پر () کا نشان لگائیے؟

1. منظر نگاری
2. مکالمہ نگاری
3. جزئیات نگاری

متن کی تشریح 3.8

(4)
(iii)

پتیاں جل چکی تھیں.................جبرا جبرا کیا سوتا ہی رہے گا چل گھر چلیں...........

افسانہ کے اس حصہ میں افسانے کے اصول کے مطابق کلائمکس ہے۔ افسانے کے اخیر میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان کوئی کام دل لگا کر نہیں کرتا تو اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو اس کھیت کا ہوا جس کی حفاظت کے لیے ہلکو سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ ہلکو آیا تھا کھیت کی حفاظت کے لیے مگر ہوا کیا۔ الاؤ جلا کر اس نے اپنے بدن کو گرم کیا اور پھر اس کی گرمی پا کر اس پر سستی سوار ہو گئی اور وہ گرمی پا کر بے فکر ہو کر سو گیا۔ رات میں نیل گائے کے غول نے اس کے کھیت کو برباد کر دیا۔ کہیں نہ کہیں ہلکو کو یہ

NOS\NOTE2.tif not found.

بھروسہ تھا کہ جبرا اس کے کھیت کی حفاظت کرے گا۔لیکن جبرا بھی اتنے بڑے غول کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ ہلکو کا یہ بھروسہ اس کی لاپرواہی کو ظاہر کرتا ہے۔کوئی بھی کام دوسروں پر نہ چھوڑنا چاہیے ورنہ اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔

ہلکو کے ذہن میں مزدوری اپنی کھیتی باڑی سے بہتر معلوم ہو رہی تھی اور اپنے کام سے یہی بے پروائی اس کے کھیت کو نقصان پہنچاتی ہے۔آدمی جو کام کرے، اسے لگن کے ساتھ اور ایمانداری سے کرنا چاہیے۔ ہلکو کی بیوی کی مزدوری کرنے کی سوچ بے معنی تھی کیونکہ کوئی بھی آدمی اپنے پیشے کو آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتا اور کسان کو تو اپنے کھیت سے بے انتہا لگاؤ ہوتا ہے۔ اور کسان ہونا فخر کی بات بھی سمجھی جاتی ہے۔آخر میں اتنی مشکلات کے باوجود ہلکو پھر عہد کرتا ہے کہ چاہے کتنی ہی درگت بن جائے وہ کھیتی کرنا نہیں چھوڑے گا وہ جبرا کو جگاتا ہے گھر چلنے کے لیے کہتا ہے۔

3.9 زبان کے بارے میں

1. افسانہ نگار نے اس افسانے میں صوت نقلی الفاظ کا استعمال بلحاظ ضرورت کیا ہے۔صوت نقلی الفاظ کا مطلب ہے ایسے الفاظ متن کے اندر جو آواز ہو وہی معنی بھی ہو۔جیسے ٹن ٹن گھنٹے کی آواز اسی طرح کتے کی کؤں کؤں۔جانوروں کے چرنے کی آواز چر چر۔شبنم کی بوندیں ٹپکنے کی آواز ٹپ ٹپ یا ہلکو اپنے کھیتوں میں چر رہی نیل گائے کو بھگانے کے لیے کہتا ہے۔ہلو ہلو۔ہوہو۔ہاہا۔
2. افسانہ کا تعلق ایک کسان کی دیہی زندگی سے ہے اس لیے مصنف نے کئی جگہ ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو گاؤں میں بولے جاتے ہیں۔مثلاً گجب کی سردی۔ مال گجاری، مجوری، منڈیا وغیرہ۔

یہ رانڈ پچھوا ہوا۔گاؤں کی زندگی میں کسی کو برا بھلا کہنے کے لیے رانڈ لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے جب کہ رانڈ کے معنی بیوہ کے ہیں۔

3.4 متن پر سوالات

ا. ”تم کہاں آکر مر گئے سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔“

یہ مکالمہ کس نے ادا کیا ہے۔درست پر (✓) نشان لگائیے۔

1. منی نے
2. سینا نے

3. ہلکو کے پڑوسی نے

II. زہر معلوم ہوتا کیا ہے۔ درست پر (✓) نشان لگائیے۔

1. محاورہ
2. ضرب المثل
3. استعارہ

III. کالم (الف) کو صحیح جواب کالم (ب) سے ملائیے۔

(الف)	(ب)
صفایا کرنا	دشوار ہو جانا
پہاڑ ہو جانا	غارت ہونا
چوپٹ ہونا	مٹا دینا

IV. ہلکو کے کھیت کے برباد ہونے کی وجہ کیا ہے؟

1. لاپرواہی
2. کتا
3. نیل گائے

3.10 اندازِ بیان

1. پریم چند کو گاؤں کا ذاتی تجربہ تھا۔ اس لیے ان کی تحریروں میں حقیقت اور اصلیت کا احساس پایا جاتا ہے۔
2. پریم چند کو جذبات نگاری میں کمال حاصل تھا۔ ان کی کہانیوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا انہوں نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔
3. سادہ آسان نثر لکھتے تھے۔ ان کا ہر جملہ سلجھا ہوا ہوتا تھا۔ اس لیے ان کی تحریریں دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔
4. انہوں نے اردو ہندی کے الفاظ کا بہت خوبی سے استعمال کیا ہے۔
5. ان کے ناولوں، افسانوں اور کہانیوں میں ہندوستانی دیہاتوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔
6. انہوں نے کہانی کے فن کو بہت ترقی دی ہے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

3.13 اختتامی سوالات

1. اس کہانی کا نام پوس کی رات کیوں رکھا گیا ہے؟
2. ''پوس کی رات'' سبق میں کس معاشرے پر روشنی ڈالی ہے؟
3. ایک غریب کسان کو جاڑے میں کھیت کی حفاظت کرنے کے لیے کن کن تکالیف کا سامنا کرتا ہے؟
4. ہلکو مزدوری کو کھیتی پر ترجیح دیتا ہے کیوں؟
5. کیا اس سبق سے محنت کش طبقہ اور زمین دار میں تعاون کا احساس ہوتا ہے چند لائنوں میں اپنے خیالات کا اظہار کریں؟
6. کہانی میں دیئے گئے محاورات کے معنی لکھئے؟

متن پر سوالات کے جوابات

3.1
1. 2
2. 2
3. 1
4. 2

3.2
I. 1
II 1
III. 1
IV. 2

3.3
1. 2
2. 2
3. 3

NOS\NOTE1.tif not found.

3.4 I. 1

II. 2

III.

الف	ب
صفایا کرنا	مٹا دینا
پہاڑ ہو جانا	دشوار ہو جانا
چوپٹ ہو جانا	غارت ہو جانا

IV. 1

NOS\NOTE2.tif not found.

4

عصمت چغتائی

مصنفہ کا تعارف

عصمت چغتائی کی پیدائش 1915ء میں ہوئی۔ ان کا اصل وطن آگرہ تھا۔ ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں جے پور میں مقیم تھے۔ اس لیے ان کی ابتدائی زندگی جے پور میں بسر ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جے پور اور آگرہ سے حاصل کی اس کے بعد علی گڑھ سے گریجویشن کیا اور پھر بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے کئی اسکولوں میں ملازمت کی۔ پھر بمبئی چلی گئیں کچھ عرصے تک انسپکٹرس رہیں پھر فلمی دنیا سے تعلق قائم ہوگیا اور یہ تعلق آخر وقت تک قائم رہا۔

عصمت چغتائی کی ادبی زندگی کا آغاز علی گڑھ سے ہوا۔ ان کو ترقی پسند تحریک سے کافی دلچسپی تھی جس کا اثر ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں متوسط طبقہ کے مسلمان گھرانوں کے مسائل خصوصاً نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جنسی مسائل پر طبع آزمائی کی۔ وہ اپنے جاندار اور بھرپور افسانوں کی وجہ سے صفِ اول کی افسانہ نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر انہیں غالب اکیڈمی کی جانب سے پانچ ہزار روپئے کا انعام دیا گیا۔

عصمت وہ پہلی ادیبہ ہیں جن کے افسانے عوام کے درمیان موضوع گفتگو بنے رہے اور ان پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔ ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کا تیکھاپن ملتا ہے ان کی زبان اشارے اور کنایے کی زبان ہے۔ سماج اور فرد کے رشتوں پر وہ اشارے کنایے میں طنز کرتی ہیں۔

ان کے افسانوں کے کئی مجموعے مثلاً کلیاں، چوٹیں اور چھوئی موئی وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ضدی، ٹیڑھی لکیر اور معصومہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانوں کی طرح ان کے ناول بھی سماجی شعور کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں وہ مسائل قلم بند کیے گئے ہیں جو تقریباً سبھی عورتوں کی زندگی سے وابستہ ہیں۔

NOS\NOTE1.tif not found.

آج آپ ان کا مشہور افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' پڑھیں گے جس میں ایک عام سماجی مسئلے ''غریب لڑکیوں کی شادی'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مقاصد

اس افسانے کو پڑھنے کے بعد آپ:

- نئے الفاظ کے معنی جان کر اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کریں گے؛
- مختلف محاوروں کے مفہوم سمجھ کر ان کا استعمال کر سکیں گے؛
- افسانے کے مرکزی خیال کو سمجھ کر اسے بیان کر سکیں گے؛
- مصنفہ کے اسلوب بیان پر روشنی ڈال سکیں گے۔

4.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

چوتھی کا جوڑا

(1)

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان پر بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگائے تھے کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑ چڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

''نائیں میرے لال!'' دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے، ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملے میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔

جازم: فرش پر بچھائی جانے والی بڑی چادر۔ صحن چاندنی
واردات: وارد کی جمع
منحنی: کمزور، دبلا پتلا

ٹول: سوتی لال کپڑا

بیونتنا: ناپ کا اندازہ لگانا

NOS\NOTE2.tif not found.

اس کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلے میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

''آستینیں اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری بقچی سے لے لو......'' اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔ پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول کر ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں کبریٰ کی ماں کے پر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹولی کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ اور اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

پنڈی: کترنوں کو لپیٹ کر گولا بنانا
استقلال: ٹھیراؤ، مستقل مزاجی
چار گرہ: چار گانٹھ
نیلگوں: آسمانی رنگ کا
شفق: سرخی جو غروبِ آفتاب کے وقت نمودار ہوتی ہے
جمگھٹے: مجمع، بھیڑ
ٹھسک: گرادینا، دے مارنا
لپا چھپ: جلدی جلدی
پلنگڑی: چھوٹا پلنگ
نقرئی کٹوری: سنہری ننھی ننھی کٹوریاں جو دلہنوں کے لباس پر ٹانکی جاتی ہیں۔

محلّہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا چھپ سوئی کے ناکوں میں دوڑے پرو دیئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لیے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی تھیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی تھیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا...... گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

(2)

یاد نہیں کب اس کے شبنمی ڈوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے۔ مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا۔ اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد ایک نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سروری کے صاف ستھرے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلّہ کی عورتیں ہاتھ میں

NOS\NOTE1.tif not found.

پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

''چھوٹے کپڑے کی گونٹ تو اتر آئے گی، پر بچوں کا کپڑا نہ نکلے گا'' بولو!............اور سنو تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟'' اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھر پسر کر کے قہقہے لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ بابنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمندھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق دار چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانپ کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بیچاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پر پہنچ پاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔
یہی تو مشکل تھی کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پاتا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا یا تو دولہ کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اسکی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کی پلنگ کے پایوں پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی سگھڑ اماں نے جہیز کا سامان جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بھی بچتی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گو کھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے۔ کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گذرے سلیقے کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو اپنے ابا ایک دم یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانسے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے چلی آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی بے طرح سینے میں الجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آ کر انہیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھب دھب ہاتھ مارتیں۔
''توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی،''
اُچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔
''کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے؟''

جھانجھ: پانو کا ایک زیور

نگوڑی: نامراد، منحوس
کیمیا گیر: زرساز، چالاک
طول: لمبائی
عرض: چوڑائی
چہلیں: ہنسی مذاق

کتر بیونت: کاٹ چھانٹ

دھنگ: ایک قسم کا گوٹا جس میں مختلف رنگ ہوتے ہیں

پھونسڑا: ریشہ

NOS\NOTE2.tif not found.

''بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن''

''اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اوپر سے چکنائی۔ بلغم نہ پیدا کردے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو''

''دکھاؤں گا'' ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

''آگ لگے اس موئے حقے کو...... اس نے تو یہ کھانسی لگائی ہے جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔''

اور ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے، کبریٰ جوان تھی، کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ کام نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنی چھوڑ دی اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور یک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

اُچھو: گلے میں پھندا لگنا

رحم طلب: رحم مانگنے والی

کریپ: کپڑے کی ایک قسم

چھکّے چھوٹنا: گھبرا جانا

لونگ: ناک کی کیل، چھوٹا سا کان کا زیور

(3)

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ بڑے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو بس ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی۔ اور انہوں نے ابھی دلہن کے مانگ کی افشاں بھی نہیں کری۔ ہول سے تو ان کے چھکّے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ

''بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ''

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں دونوں ایک نظر کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اُتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر

NOS\NOTE1.tif not found.

گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ، پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ کا کمرہ اپنے ہاتھوں سے پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور شام کو جب وہ مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری، ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

''اللہ! میرے اللہ! اب تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری بارگاہ میں پڑھوں گی۔'' حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو صبح ہونے سے پہلے ہی کبریٰ مچھر والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لیے۔

''لاؤ میں دھوؤں بی آپا'' حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

''نہیں وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی......، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپّا ٹانکتی رہیں۔

جن راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اُتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن رات راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے، خود سوکھا نوالہ پانی سے اُتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

''زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی'' وہ حمیدہ کو منہ پھیلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی۔'' ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح اٹھ کر جادو کی مشین کر طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے۔ تاکہ موٹی سی ملائی پڑ جائے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال پراٹھوں میں بھر دے، اور کیوں نہ بھرے آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول ٹکیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں، ان کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں، وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چیچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑھ تھیں۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

رنڈاپا: بیوگی کا زمانہ

بساندی: بدبودار

سوئٹ ڈریم: میٹھی نیند آئے

حکیمانہ: دانش مندانہ

تاویل: بہانہ

دور اندیشی: دور تک کی سوچنا

NOS\NOTE2.tif not found.

''بڑا شرمیلا ہے بیچارہ'' بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔''ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے، رنگ ڈھنگ سے کچھ آنکھوں سے۔''

اے لو، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے'' بی اماں فخر سے کہتیں۔

''اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے۔'' بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دوراندیشی کی داد دینی پڑتی۔

''اے بہن تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی۔

''اری اونگ چڑھی، بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونھ، اری چل دیوانی۔''

اونگ چڑھی: نیند کی متوالی

''اے تو میں کیا کروں خالہ؟''

''راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟''

''بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔''

''اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔'' بی اماں چڑ کر بولتیں۔

مسکوٹ: صلاح مشورہ، خفیہ سازش

''نہیں تو مگر......'' میں لاجواب ہوگئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں: ''دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''نہیں ہنسوں گی'' میں نے وعدہ کیا۔''

خنّاس: شیطان

''کھانا کھالیجئے۔'' میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت، میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خنّاس آنکھیں ہیں۔

نرخرہ: سانس لینے کی نالی

''جا نگوڑی دیکھ تو سہی وہ کیسا منہ بناتا ہے اے ہے سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔''

بی آپا نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے جوڑوں کی مانند اداسی میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

جواب ندارد: جواب غائب

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کا کباب دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ واہ جی دولہا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو'' مگر جانو میرا نرخرہ کسی نے دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

''راحت بھائی کو فتے پسند آئے!'' بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

''بتایئے نا؟''

NOS\NOTE1.tif not found.

''اری ٹھیک سے جا کر پوچھ'' بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

''آپ نے لاکر دیئے اور ہم نے کھائے، مزیدار ہی ہوں گے۔''

''ارے واہ رے جنگلی'' بی اماں سے نہ رہا گیا

''تمہیں پتہ ہی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔''

''کھلی کے؟ ارے تو روز کا ہے کہ ہوتے ہیں؟ میں عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔''

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں، دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے۔

''کہئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔''

''کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟'' میں جل کر کہا۔

''یہ بات نہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں، گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں، میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں، میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا۔ کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کہ کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔

غلیظ: گندی

مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ......نہیں......میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔

''اونہہ، میں جل گئی۔ بڑی آپا نے جو پلٹ کر کٹی ہوئی مرغی کی طرح دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

''آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟'' راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' آپا نے شرم وحیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

''کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ! جی چاہتا ہے کہ کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں......اونہہ نہیں......کھالوں بلکہ چوم لوں'' میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ اور بی آپا کا کھردرا، ہلدی دھنیے کی بساند میں سڑا ہوا

NOS\NOTE2.tif not found.

ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگالیا میرے آنسو نکل آئے۔''یہ ہاتھ''میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں پیاز کاٹتے ہیں بستر بچھاتے ہوئے صاف کرتے ہیں۔ یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔اس کی غلامی کب ختم ہوگی۔کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ پوچھے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

''اور کیا کہہ رہے تھے؟''بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو ......مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

''اور کہہ رہے تھے کہ اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں''

ابرو: بھوں

''چل جھوٹی''

''ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ......''

''اری چپ مردار''انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

تھودے: ڈھیر

''دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔''

''نہیں بی آپا۔انہیں نہ دو سوئٹر۔تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟''میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

پنگوڑے: گہوارہ، ہنڈولا

''آپا بی تم خود کیا پہنو گی؟''

''ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔''

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا کہ یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟''''نہیں تو''

''تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔''

بگلا بھگتی: ظاہر میں نیک باطن میں شریر، اندر سے کچھ اور ہے اور باہر سے کچھ

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تھودے، یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے، جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیب جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔منی پوری اور بھرت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔انہیں پیانوں پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا، انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لیے صبح شام تک سلائی کرتے ہیں۔صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولھوں کی آنچ سہتے ہیں، تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تا کہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں، ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتلایا کرتی

NOS\NOTE1.tif not found.

ہیں،کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں، بھوک اور کال کی باتیں، دھڑ کتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

''یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔''

جنگلی بلی کی طرح میں نے ان کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

''وہ بولے؟'' ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں'' میں نے سوچا کہ آج سب کچھ بتا دوں گی۔

''کیوں؟'' وہ مسکرائیں۔

''مجھے اچھے نہیں لگتے ...... دیکھیے میری ساری چوڑیاں چورا ہو گئیں۔'' میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

''بڑے شریر ہیں۔'' انہوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

''بی آپا...... سنو بی آپا...... یہ راحت اچھے آدمی نہیں'' میں نے سلگ کر کہا۔'' آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔''

''کیا ہوا'' بی اماں نے جا ءنماز بچھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔''

''راحت نے توڑ ڈالیں؟ بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

''ہاں''

خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کا ہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگائے اور پگھل گئیں۔'' پھر چمکار کر بولیں'' خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجو، وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں گے میاں جی'' یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

''اے ہے تو بری ٹھس ہے۔ اے ہے، ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔''

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو ممیری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے مواقع ہاتھ سے جا چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے۔ جہاں بے چارے لڑکیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں، کبھی سویوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

امید افزا: پرامید

گامزن: چلنا

از حد: بے حد

تیر بہدف: نشانہ پر لگنے والا تیر، مراد پر اثر

اختلاج: دھڑکن

ہیچا چلا: بچوں کو ڈرانے کا نام، ڈراؤنا چہرہ

NOS\NOTE2.tif not found.

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے یہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ ''بھئی کس سے؟'' تو کہا ''کسی سے بھی کرا دو'' اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھّم۔ پندرہ تولہ سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔''

ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولہ سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟'' بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔'' یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو لڑھک جائے گا۔''

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت اس میں سما دیتیں۔

''کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو دھکیلنا ہی ہوگا۔''

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں ادھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں اپنی چوکی پر بیٹھی کمزوری میں چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آپ مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھر تھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کی طشتری مجھے تھما دی۔

''اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے'' ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے ہیں۔ میں بھاگی بھاگی برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کے ایالوں کو چوم رہا ہے............

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں۔...... چوتھی کا زرتار

تھالی کا بیگن ہونا: غیر مستقل مزاج ہونا

مشکل کشا: مشکل دور کرنے والے، مراد حضرت علیؑ

مقدس: پاک
ایال: گردنوں کے بال
شہابی: سرخ

NOS\NOTE1.tif not found.

جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے...... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقموں کی طرح الجھ جاتا ہے۔

''یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔'' بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے۔حمیدہ کا گلا بھر آیا......

''جاؤ نہ میری بہنو'' بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

''یہ ہے ملیدہ......'' اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا......اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا۔ اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا...... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی چٹان نے اس کی چیخ کی چٹان کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی۔ باہر آنگن میں محلّے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

(4)

اس کے بعد اس کے گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی بھاگی پیچھے پیچھے آرہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں کفن کا سفید سفید لٹھا، موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا، بائیں ابرو پھڑک رہی تھی، گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھی جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح یہ چوتھی کا جوڑا اسینتا نہ جائے گا۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹوپی پر سفید گزی کا نشان اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہوگئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکا بھر کر ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسوان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سہاگ جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

بانبی: بل

گل ہو جانا: بجھ جانا

جست: چھلانگ

آغوش: گود

تحمل: برداشت، صبر

NOS\NOTE2.tif not found.

(1)

4.2 متن کی تشریح

سہ دری کے چوکے پر...... مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

☆ اس افسانے کا عنوان ہے ''چوتھی کا جوڑا''

☆ ''چوتھی کا جوڑا'' وہ مخصوص لباس ہوتا ہے جسے بہت اہتمام سے شادی میں دلہن کو پہننے کے لیے بنوایا جاتا ہے۔ عام طور پر قیمتی ہوتا ہے جس پر زری کا بہت بھاری کام کرایا جاتا ہے۔ یہ جوڑا کوئی معمولی جوڑا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہزاروں آرزوؤں کو پرو دیا جاتا ہے۔ ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے کہ وہ اس جوڑے کو پہنے۔

☆ افسانے کے اس حصہ میں مصنفہ نے سروری جو کہ افسانے کا مرکزی کردار ہے اس کے روز کا معمول بتایا ہے۔ وہ دوپہر کو کھانے کے بعد سہ دری میں جازم بچھا کر سلائی کڑھائی کا سامان پھیلا کر بیٹھ جایا کرتی اور اپنے کام میں مگن ہو جاتی تھی۔ محلے پڑوس کی عورتیں بھی اپنے بچوں کو لے کے چلی آتیں اور کبھی کسی کا چوتھی کا جوڑا تیار ہوتا کبھی چھٹی چھوچھک تیار کیا جاتا تو کبھی کفن سِیا جاتا۔ بچے جو کہ ماؤں کی چھاتیوں سے چپکے گود میں بیٹھے رہتے اگر کچھ کھانے کی چیز مانگنے کے لیے ہلنے کی کوشش کرتے تو مائیں انہیں ٹھوک ٹھوک کر دوبارہ سلاتیں۔ اس بات کو مصنفہ نے ایک نادر مثال کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

☆ ''دبلی پتلی ماں اسے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول پھٹک رہی ہو'' چونکہ سروری ایک غریب بیوہ عورت تھی اور آس پاس کی عورتیں بھی غربت کی ماری ہوئی تھیں اس لیے ماؤں کے لیے دبلی پتلی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بچہ بھوک کے مارے کچھ مانگنے کے لیے اٹھنا چاہتا لیکن اس وقت موقع اتنا نازک ہوتا کہ مائیں اسے دوبارہ زور زور سے ٹھوک کر سلا دیتیں کیونکہ سروری کسی کپڑے کو ناپ رہی ہوتی کہ کس طرح اسے کاٹا جائے کہ وہ صحیح ناپ کا لباس تیار ہو۔

☆ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔''

☆ کبریٰ کی ماں یعنی سروری سلائی کٹائی میں ماہر تھیں۔ محلے پڑوس میں سبھی عورتیں جب ناکام ہو جاتیں اور کپڑا کم ہونے کی وجہ سے کوئی چیز کاٹ نہیں پاتیں تو معاملہ کبریٰ کی ماں کے پاس لایا جاتا اور وہ پہلے تو اسے سیدھا کرتیں پھر اس کا کلف توڑتیں پھر ہر طرح سے اندازہ لگاتیں کہ کس طرف سے کٹ پائے گا پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کو ناپ کر دل ہی دل میں کاٹتیں اور پھر اطمینان کر لیتیں کہ کپڑا کافی ہے اس میں جوڑا بن جائے گا پھر مسکرا پڑتیں اور عورتوں کی جان میں جان آجاتی۔

NOS\NOTE1.tif not found.

☆ ''لال ٹولی کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح اک دم اجاگر ہوگئیں جیسے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔''

☆ مفلسی، غریبی، فکر پریشانی اور بوڑھاپے نے سروری کے چہرے کو زرد بنادیا تھا جس میں نیلا رنگ بھی شامل ہوگیا تھا۔ اسے اپنی بڑی لڑکی کبریٰ کی شادی کی فکر تھی اس بنا پر اس کے چہرے کی جھریاں اداس اداس نظر آرہی تھیں۔ اس حقیقت کو مصنفہ نے ایک خوبصورت تعبیر کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ لال کپڑا جو وہ کاٹ رہی تھیں اس کا عکس سروری کے چہرے پر پڑ رہا تھا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے شام کے وقت آسمان پر شفق پھوٹ رہا ہو اور اداس جھریوں پر اس کا عکس ایسا لگ رہا تھا جیسے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو اور جیسے گھٹا برس کر کھل جائے۔

☆ ''کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھی۔''

ہر لڑکی کا ارمان ہوتا ہے کہ وہ سرخ جوڑا پہنے اور دلہن بنے۔ اس کی شادی ہو یہ ارمان کبریٰ کو بھی تھا۔ حالانکہ وہ اس عمر سے پہلے ہی گزر چکی تھی مگر اسے ابھی تک یہ جوڑا پہننا نصیب نہیں ہوا۔ اس کی ماں جب کبھی لال کپڑے کو پھیلا کر اس پر کچھ کڑھائی کا کام کر رہی ہوتی تو اس کے دل میں ایک کسک پیدا ہوتی۔ اس کے چہرے پر شرم وحیا سے سرخ رنگ آجاتا کہ کہیں اس کے دل کی چوری نہ پکڑی جائے اور اس کے ارمان کا پتہ نہ چل جائے۔

☆ ''روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔''

☆ یہاں مصنفہ نے سروری کی حسرت بھری تمنا کا ذکر کیا ہے۔ کہ جب کبھی وہ سرخ جوڑے پر روپہلی کٹوریوں سے جال بناتی تو ایک دم چہرے پر ایک چمک آجاتی۔ ایک ارمان جاگ اٹھتا کہ اس کی بیٹی کبریٰ اس جوڑے کو پہنے گی اور دلہن بنے گی۔ شہنائیاں بجیں گی اور آنے والے خوش آیند لمحات کا تصور کر کے وہ خوش ہو جاتیں۔

☆ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اُٹھتیں۔''

☆ سروری کے چہرے پر مفلسی، پریشانی اور بوڑھاپے کی وجہ سے بہت گہری گہری جھریاں تھیں اسے مصنفہ نے گہری صندوقوں سے تشبیہہ دی ہے۔ ان پر جب کٹوریوں کا عکس پڑتا تو ایسا لگتا جیسے چھوٹی چھوٹی بہت سی مشعلیں جل اٹھی ہیں اور جب کٹوریوں سے بنا ہوا کام ہلتا تو اس کا عکس جو چہرے پر پڑ رہا تھا وہ بھی ہلتا تو ایسا لگتا جیسے مشعلیں کانپ اٹھیں۔

4.3 زبان کے بارے میں

☆ چھٹی چھوچھک، لپا چھپ، پلنگڑی، جھانجھیں وغیرہ خاص عورتوں کی زبان میں استعمال کیے جانے والے الفاظ ہیں۔

☆ جس طرح ہاتھ میں پہنی جانے والی چیز کو دستانہ کہتے ہیں اسی طرح انگلی میں پہنی جانے والی چیز کو انگشتانہ کہتے ہیں۔ یہ لوہے کی چوڑی سی انگوٹھی ہوتی ہے جسے سوئی سے کچھ سلنے سے پہلے پہنتے ہیں تاکہ انگلی زخمی نہ ہو۔

☆ بچے کی پیدائش کے چھٹے دن کچھ خاص قسم کی رسومات کی جاتی ہیں اسے چھٹی کہتے ہیں۔ اس دن نوزائیدہ بچے اور اس کی ماں کے لیے نئے کپڑے اور مختلف چیزیں تیار کرائی جاتی ہے۔ اسے چھٹی چھوچھک کہتے ہیں۔

☆ تراش کردہ ایک مرکب لفظ ہے جو تراش بمعنی کٹا اور کردہ بمعنی کیا ہوا سے مل کر بنا ہے۔ یعنی کٹا ہوا۔ اردو میں اس طرح کے اور بھی مرکبات مستعمل ہیں جیسے گناہ کردہ، ناکردہ، سرکردہ وغیرہ۔

متن پر سوالات 4.1

صحیح جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

1. بیونتنے کا مطلب ہے۔

(الف) بے وقوف بنانا

(ب) اندازہ لگا کر کپڑا کاٹنا

(ج) بڑا بننا

2. انگشتانہ کسے کہتے ہیں۔

(الف) ماتھے کی بندیا

(ب) پیر میں پہننے کا زیور

(ج) انگلی میں پہننے والی چیز

3. سروری کو کیا ارمان تھا؟

NOS\NOTE1.tif not found.

(الف) اپنی شادی کرنے کا (2)

(ب) اپنی بیٹی کبریٰ کی شادی کرنے کا

(ج) نیا جوڑا بنا کر رکھنے کا

4.4 متن کی تشریح

(2)

یاد نہیں کب اس کے......پھن کی طرح اٹھ رہی ہے

☆ عصمت چغتائی عورتوں کے چھپے جذبات اور ان کے دل کے ارمان کو بیان کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔افسانے کے اس حصے میں انہوں نے سروری کے ارمان وحسرت اور مایوسی کا ذکر کیا ہے۔

☆ ''یاد نہیں کب اس کے شبنمی ڈوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔''

☆ کبریٰ کی زبانی کہلائے گئے اس جملے میں کتنی حسرت اور یاس چھپی ہے۔کبریٰ کی شادی کے لیے ڈوپٹہ لایا گیا اس پر کڑھائی کی گئی وہ بن ٹن کر تیار بھی ہوا مگر اسے اوڑھنا نصیب نہ ہو سکا وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور دوپٹہ وقت کی صندوق کی تہہ میں ڈوب گیا۔نہ تو کبریٰ دلہن بنی اور نہ ہی وہ ڈوپٹہ اوڑھا۔

☆ ''جب ایک جوڑا پرانا ہوتا تو اسے چالے کا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔''

☆ کبریٰ کے لیے جو بھی چوتھی کا جوڑا تیار ہوتا کچھ عرصہ بعد پرانا ہو جاتا اس پر کیا ہوا زری کا کام ماند پڑنے لگتا تو اسے سروری چالے کا کہہ کر رکھ دیتی۔چالے کے جوڑے وہ کپڑے ہوتے ہیں جو دلہن اپنے ساتھ لے کر سسرال جاتی ہے۔انسان امیدوں کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے۔سروری بھی اس پرانے جوڑے کو چالے کے لیے رکھ کر کبریٰ کے لیے دوسرا کپڑا لاتی اور پھر سے اس کی چوتھی کا جوڑا تیار کرتی کہ ہو سکتا ہے جب تک یہ تیار ہو اس کے شادی کا مسئلہ طے ہو جائے۔اور اس کی بیٹی دلہن بنے۔

☆ ''یہی تو مشکل تھی۔کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور اڑنگا لگے گا یا تو دولہ کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا لگائے گی۔چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔'' شادی سے متعلق عورتوں میں کچھ ٹوٹکے مشہور ہو جاتے ہیں۔ان ہی کا ذکر یہاں کیا گیا ہے کہ چوتھی کا جوڑا نہایت اطمینان اور سکون سے تیار ہونا چاہیے۔اس کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔اگر

NOS\NOTE2.tif not found.

کچھ غلط ہو جائے تو سمجھ لو بدشگونی ہو گئی۔ اگر کوئی کلی الٹی کٹ جائے تو غضب ہو گیا۔ اب تو ضرور نائن کی لگائی ہوئی بات میں اڑنگا لگے گا۔ نائن وہ عورتیں ہوتی ہیں جو گھروں گھروں ناخن کاٹنے اور مالش وغیرہ کرنے کے لیے جاتی ہیں۔ انہیں ہر گھر کی خبر ہوتی ہے کہ کس گھر میں لڑکی یا لڑکا شادی کے لائق ہے۔ چنانچہ وہ رشتہ لگانے میں ایک وسیلے کا کام کرتی ہیں۔ اگر چوتھی کا جوڑا کچھ غلط کٹ جائے تو ضرور کچھ برا ہونے والا ہے یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا پھر ساس جہیز اور زیور کا مطالبہ کرے گی۔

☆ ''میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا''

☆ بچپن، جوانی اور بوڑھاپے کے لیے مصنفہ نے نادر مثال کی ہے کہ بچپن میں انسان معصوم ہوتا ہے۔ جوانی میں پُر جوش، پُر کشش اور امنگوں سے بھر پور، بوڑھاپے میں مجبور، معذور اور چڑ چڑا ہوتا ہے۔ کبریٰ کے لیے کہا کہ کیسے اس نے بچپن سے جوانی کا مرحلہ طے کیا اور جوانی سے بوڑھاپے کی طرف آ گئی کچھ فرق ہی نہیں پڑا۔ غریبی اور مفلسی کی وجہ سے اس کا بچپن بھی کام کاج کرنے اور گھر سنبھالنے میں گزر گیا اور جوانی بھی۔

☆ ''جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔''

جب سے حمیدہ کے ابو اللہ کو پیارے ہوئے لوگوں نے کبریٰ کے لیے رشتے بھیجنا ہی چھوڑ دیا۔ کسی طرح کپڑے سل کر گزر راوقات بمشکل ہو جاتی تھی لیکن سب سے بڑا مسئلہ تھا کبریٰ کی شادی۔ کسی کا رشتہ ہی نہیں آتا ایسا لگتا جیسے کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس غریب کے گھر میں ایک جوان لڑکی ہے جو اب بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی ہے اور دوسری لڑکی نوجوانی کی منزل میں ہے اور جوان ہونے والی ہے۔

☆ ''نہ جانے کیسے جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔''

ایک غریب کی جوانی بھی کیا ہے۔ کبریٰ جو جوان ہوئی تو نہ اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ ہی زلفیں لہرانا اور بننا سنورنا شروع کیا نہ ہی ساجن گنگنائی نہ ہی ارمان جاگے۔ کیونکہ اس کے سامنے تو ایک ہی چیز تھی کسی طرح دو وقت کی روٹی میسر ہو جائے۔ سروری دن بھر اسی لیے سلائی کرتی اور کبریٰ گھر کے کاموں میں جٹی رہتی۔ برتن مانجتی، کپڑے دھوتی، کھانا بناتی غرض دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔

NOS\NOTE1.tif not found.

4.5 زبان کے بارے میں

- ''طول پکڑنا'' مطلب ہے بڑھ جانا۔
- ''راستہ بھول جانا'' ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے ''نہ آنا''۔
- ''اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر''
- ''آگ لگے موئے حقے کو'' خاص طور پر عورتیں غصے میں بددعا کے طور پر بولتی ہیں۔ خاک پڑنا، آگ لگنا معنی ہیں ''برا ہو''۔
- ''کلی'' دو معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک تو پھول کی کلی دوسرے کپڑے کی کلی۔ دارو دوا کو کہتے ہیں۔ عوام دیسی شراب کو کہتے ہیں لیکن جب دوا اور دارو ایک ساتھ استعمال ہوں تو مطلب ہوتا ہے ''دوا علاج''۔
- جب کوئی شادی شدہ مرد اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے جسمانی تعلقات قائم کرے تو اس عورت کو داشتہ کہتے ہیں۔ عام زبان میں اس کے لیے ''رکھیل'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ رشتہ سماجی اور اخلاقی اور مذہبی طور پر ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ ایسا آدمی جسمانی طور پر بہت سی مہلک بیماریوں کا شکار ہو سکتا ہے جیسے ایڈز، سوزاک وغیرہ۔ یہ تمام بیماریاں لاعلاج ہیں۔ ہمیں ان سے بچنا چاہیے اور ضروری احتیاط برتنا چاہیے۔

4.2 متن پر سوالات

1. خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجئے۔

(i) اے............ پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔

(ii) چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا............ ہوتا ہے۔

(iii) ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے............ کا علم۔

(iv) میٹھا برس............ ہوا پھر کڑوا ہو گیا۔

(راستہ بھول گئے، نمکین، نازک، خاک، محرم)

2. کبریٰ کے لیے شادی کے پیغام کیوں نہیں آتے تھے؟

(الف) کیونکہ وہ بدصورت تھی۔

(ب) کیونکہ وہ غریب تھی۔

NOS\NOTE2.tif not found.

(ج) کیونکہ وہ بوڑھی تھی۔

3. طول وعرض کے معنی ہیں۔

(الف) اونچائی نیچائی۔

(ب) لمبائی چوڑائی۔

(ج) موٹاپا اور دبلا پن۔

4.6 متن کی تشریح

(3)

مگر بی اماں کا دستور............اور اسے جلدی تھی

☆ عصمت چغتائی عورتوں کی نفسیات بیان کرنے میں ماہر ہیں۔ افسانے کے اس حصے میں انہوں نے سروری کی اس وقت کی کیفیت کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھانجہ راحت پولیس ٹریننگ کے لیے اس کے یہاں آرہا ہے۔ سروری کو ایسا لگا گویا کنواں خود پیاسے کے پاس آگیا۔ انہوں نے کبریٰ اور راحت کی شادی کے منصوبے بنا لیے اور ایک دم ساری تیاریاں شروع کر دیں گویا کہ بارات دروازے پر کھڑی ہو۔

☆ ''بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اس گھڑی نہ آؤ''

یہ جملہ سروری نے اپنی منہ بولی بہن کو کہلا بھیجا۔ یہ خاص انداز ہے جو عورتیں اپنی بات منوانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہا اگر تم نہیں آئیں تو مجھ سے تعلقات ختم کر لینا اور مرنے کے بعد ہی میری صورت دیکھنا۔

☆ ''اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں' راحت کی خاطر داری ہو سکے۔ گھر پر مفلسی چھائی ہے۔ ایسے میں زیورات عورتوں کی مدد کرتے ہیں۔ سروری نے کان کی چار ماشہ کی لونگیں منہ بولی بہن کو دے دیں تاکہ بیچ کر کچھ سامان لا سکے۔ لونگ عام طور پر ناک میں پہنی جانے والی کیل کو کہتے ہیں۔ یہاں کان کے ٹاپس کے لیے لونگ استعمال کیا ہے۔

☆ ''اللہ میرے اللہ اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ سو رکعت نفل تیری بارگاہ میں پڑھوں گی۔''

☆ راحت کے آنے سے ہر کوئی پر امید تھا۔ حمیدہ نے بھی فوراً اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ بس راحت میری بہن کبریٰ سے شادی کر لے اور سو رکعت نفل نماز کی منت مان لی۔ یہ عورتوں کی خاص نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔

☆ ''جب سوئیوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی۔''

NOS\NOTE1.tif not found.

یہاں کبریٰ کا نفسیاتی پہلو دکھایا ہے کہ جب گھر میں ہر کوئی پر امید ہے تو اس نے بھی ایک سپنا سجا لیا اور دل میں ارمان جاگ اٹھے کہ شاید راحت ہی وہ شخص ہو جو اسے دلہن بنائے گا اور وہ بھی چوتھی کا جوڑا پہن سکے گی۔

☆ اس کا بس نہیں چلتا کہ اپنی چربی پراٹھوں میں بھر دے اور کیوں نہ بھرے آخر کو وہ ایک دن اس کا ''اپنا ہو جائے گا''۔

☆ کبریٰ کے جذبات کا دوسرا نفسیاتی پہلو ہے۔ وہ راحت کی ''دل وجان'' سے خدمت کرتی، خوب گھی میں تلے ہوئے پراٹھے کھلاتی۔ اچھے اچھے پکوان بناتی۔ ایک آس ایک امید تھی کہ راحت اس کا ہو جائے گا۔ اسے اپنا لے گا۔

☆ ''اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے۔ بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دوراندیشی کی داد دینی پڑتی۔''

سروری کی منہ بولی بہن نے جب دیکھا کہ راحت کی طرف سے کوئی پہل نہیں ہو رہی ہے تو وہ سروری سے بولی کہ کچھ تو اشارہ ملے کہ اس کے دل میں کیا بات ہے۔ سروری ناراض ہو کر بولی کہ کیا پردہ تڑوا دوں؟ منہ بولی بہن بولیں نہیں میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ کبریٰ کی شکل اور اس پر پکے مہاسے دیکھ کر تو راحت اور بھی حامی نہیں بھرتا۔ ایک تو غریبی ومفلسی نے چہرے کی رنگت خراب کر دی تھی اوپر سے عمر بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ اس لیے عقل مندی اسی میں تھی کہ راحت کبریٰ کو نہ دیکھے۔ کسی نہ کسی ترکیب سے بس شادی کے لیے ''ہاں'' کہہ دے۔

☆ ''کھلی کے؟ ارے تو روز کا ہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں۔ کھلی اور بھوسہ کھانے کا'' راحت کا یہ جملہ سب کے اوپر بجلی بن کر گرا۔ اپنی جان سے بڑھ کر کبریٰ اس کی خدمت کر رہی تھی۔ حمیدہ رات دن اس کے آگے پیچھے کرتی۔ سروری سلائی کر کر کے اس کے لیے عمدہ سے عمدہ چیزیں منگواتیں اور جب مذاق میں کھلی کے کباب کھلائے گئے تو راحت نے نمک حرامی کا ثبوت دیا اور بولا کہ روز تو ایسے ہی ملتے ہیں۔ اس جملے سے سب کو مایوسی ہوگئی۔

☆ ''جی چاہتا کہ کسی دن صاف کہہ دوں کہ کسی کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس؟ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔''

☆ حمیدہ نے دیکھا کہ راحت کی دست درازیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مگر وہ یہ سب صرف اس لیے برداشت کر لیتی کہ اس کی بہن کی شادی ہو جائے گی لیکن جب وہ حد سے آگے بڑھنے لگا۔ مذاق میں اس کی کلائی پکڑ لی، اسے بات بات پر چھیڑتا تو حمیدہ کا جی چاہتا کہ وہ یہ سب کرنے سے منع کر دے۔ شادی تو وہ کبریٰ سے کرے گا اور مجھے اس کی دست درازیاں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔

☆ ''میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں، مٹی کے تھودے! یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ جو چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تا کہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔''

☆ کبریٰ دن بھر کام کے بعد جو وقت ملتا اس میں راحت کے لیے سوئٹر بنتی۔ اس کے پاس خود سوئٹر نہیں تھا مگر وہ اس نے راحت کو بھجوا دیا۔ راحت نے حمیدہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے بنا ہے تو حمیدہ بولی نہیں۔ راحت بولا پھر تو ہم نہیں

پہنیں گے۔ اس پر حمیدہ کا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ کبریٰ کس طرح راحت کی خدمت کرتی۔ اس کا کمرہ جھاڑتی۔ کپڑے دھوتی، کھانا بناتی۔ دن بھر اس کی غلامی میں لگی رہتی۔ چولھے کے پاس گھٹنوں بیٹھ بیٹھ کر اس کے لیے انڈے پراٹھے اور کباب تلتی۔ حمیدہ کا جی چاہا کہ بول دے کہ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو دن رات تمہاری خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ تمہاری گندگی اور غلاظت دھوتے ہیں تا کہ تم اجلے چٹے نظر آ سکو اور بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ حالانکہ تم اندر سے ایسے پاک وصاف نہیں ہو۔ ورنہ تمہیں کیا کبریٰ کی اچھائیاں نظر نہیں آتیں۔ کبریٰ کی خاموش خدمت کی طرف اشارہ اور راحت پر طنز ہے۔

☆ ''کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے۔ نہیں وہ مرد کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے اس بوجھ کو دھکیلنا ہی ہوگا۔''

☆ ایک غریب لڑکی کے جذبات اور دلی کیفیات کی اس سے بہتر ترجمانی ممکن نہیں۔ شادی امنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل نہیں بلکہ ان کے لیے روٹی کپڑے کا سہارا ہے۔ کبریٰ ایک بیوہ کی بیٹی تھی۔ اس کے سینے پر بوجھ تھی کیونکہ سروری سلائی کر کے بمشکل گزر اوقات کر پاتی تھی۔ ایسے میں کبریٰ کی شادی ہو جاتی تو تھوڑا بوجھ ہلکا ہوتا۔ حمیدہ کی زبانی یہ بات کہلائی گئی ہے کہ کبریٰ کسی مرد کی بھوکی نہیں تھی بلکہ روٹی کپڑے کے لیے شادی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن راحت کی طرف سے کوئی بات بن نہیں پا رہی تھی۔

☆ ''ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں ایک اور بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کی چٹان کو گھونٹ دیا۔''

☆ جب کسی طرح راحت سے بات نہیں بن پائی تو آخری حربہ کے طور پر سروری نے پاؤں کے زیور کو گروی رکھ کر مشکل کشا کی نیاز کر ڈالی۔ حمیدہ ملیدہ کی پلیٹ لے کر راحت کے پاس گئی سب کو یہ امید تھی کہ راحت وہ ملیدہ کھائے گا اور کبریٰ سے شادی کے لیے تیار ہو جائے گا۔ حمیدہ راحت کی بدنیتی بھانپ چکی تھی۔ پھر بھی بڑی بہن کی خاطر ملیدہ کی پلیٹ لے کر راحت کے پاس گئی۔ باہر محلے پڑوس کی لڑکیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔ حمیدہ نے ملیدہ کا لقمہ بنا کر راحت کی طرف بڑھایا اور راحت نے منہ کھول دیا۔ حمیدہ نے چیخنا چاہا مگر راحت نے اس کا منہ بند کر دیا۔

4.7 زبان کے بارے میں

افسانے کے اس حصے میں درج ذیل محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔

NOS\NOTE1.tif not found.

- چھکے چھوٹ جانا : (مطلب) گھبرا جانا
- چاروں کونے چوکس بیٹھنا : معاملہ فٹ ہو جانا
- تن بدن میں آگ لگنا : بہت غصہ ہونا
- داد دینا : تعریف کرنا
- ٹھنڈی سانس لینا : افسوس کرنا
- گل ہو جانا : بجھ جانا
- تھالی کا بیگن ہونا : آدمی کا بے اصول ہونا

ایال کے معنی ہیں گھوڑے کی گردن کے بال۔ اس کا دوسرا تلفظ ''عیال'' ہے اس کے معنی ہیں گھر کے لوگ۔ عام طور پر اہل وعیال ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

لاجواب ایک مرکب ہے جس میں ''لا'' سابقہ استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کا سابقہ استعمال کر کے منفی کے معنی لیتے ہیں۔ عربی میں ''لا'' کے معنی ''نہیں'' کے ہوتے ہیں۔ جیسے لاعلم، لاپتا، لاریب وغیرہ۔

دوراندیشی ایک مرکب ہے جو دور اور اندیشی سے مل کر بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں دور تک کی سوچنا۔ سابقہ ''دور'' کو استعمال کر کے بہت سے اور الفاظ بنائے جاتے ہیں جیسے دوربین، دوررس وغیرہ۔ (4)

متن پر سوالات 4.3

1. مناسب سابقوں کا استعمال کیجئے۔

(i) .... جواب	........................علم
(ii) ....ادب	........................غرض
(iii) ....بیں	........................اندیش
(iv) ....تمیز	........................کردار

(دور، بد، بے، لا)

2. حمیدہ نے سو رکعت نماز کی منت کیوں مانی؟

(الف) اپنی شادی کے لیے۔

(ب) اپنی ماں کی قسمت کے لیے۔

(ج) اپنی بہن کی شادی کے لیے۔

4.8 متن کی تشریح

(4)

اس کے بعد اس کے گھر..................شہنائیاں بج اٹھیں گی

☆ افسانے کے آخری حصے میں سروری کی حسرت و یاس کا ذکر ہے۔ راحت کے اچانک چلے جانے کے بعد سروری، کبریٰ اور حمیدہ پر کیا نفسیاتی اثرات پڑے۔

☆ کبریٰ کو سخت محنت، پریشانی اور فکر کی وجہ سے دق کا عارضہ لگ گیا اور وہ دوبارہ جاں بر نہ ہوسکی۔ موت کی آغوش میں پہنچ کر اس نے چین کی سانس لی۔

☆ ''کفن کا سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔''

☆ کبریٰ کے مرنے کے بعد سروری سفید لٹھا لے کر اُسی سہ دری میں بیٹھ کر کفن سینے کی تیاری کرنے لگی۔ اتنے بڑے صدمے کو برداشت کئے ہوئے تھیں۔ صبر و تحمل کے بوجھ سے چہرہ لرز رہا تھا۔ خود اپنی بیٹی جس کے لیے انہوں نے چوتھی کے سرخ جوڑے تیار کیے تھے۔ آج اس کے لیے اپنے ہاتھوں کفن سئی رہی تھیں۔

☆ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح یہ چوتھی کا جوڑا سینتا نہ جائے گا۔''

کبریٰ مر چکی تھی اور اسے کفن پہننا ہی ہے۔ اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا کہ سروری کو پورا یقین تھا کہ آج جو لباس وہ تیار کر رہی ہے وہ اس کی بیٹی ضرور پہنے گی۔ اس سے پہلے اس نے کئی چوتھی کے جوڑے تیار کئے مگر کوئی بھی اسے نصیب نہ ہوسکا۔ اور وہ حسرت جو دل میں تھی کہ بیٹی کو شادی کا جوڑا پہنائے گی۔ اسی حسرت کی تلافی یہ سوچ کر کر رہی ہے آج تو یہ لباس وہ ضرور پہنے گی۔

☆ ''دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سہاگ جوڑا بن کر تیار ہو گیا اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔''

آخر کے ان جملوں میں اک درد اور کرب چھپا ہوا ہے۔ جب سروری کفن سئی کر مکمل کرتی ہے تو بے اختیار دو آنسو گر جاتے ہیں جو ایک فطری عمل ہے لیکن فوراً ہی وہ مسکرا پڑتی ہے۔ ایک ڈوبی ہوئی مسکان، حسرت بھری مسکان، ایسی حسرت جو پوری نہ ہوسکی۔ بیٹی کو سہاگ جوڑا پہنانے کی حسرت۔ آج اسے کفن پہنا کر پوری کر رہی تھیں۔

NOS\NOTE1.tif not found.

4.9 زبان کے بارے میں

- نامراد مرکب ہے جو ''نا'' اور ''مراد'' سے مل کر بنا ہے۔
- سابقہ 'نا' لگا کر بہت سے الفاظ بنائے جاتے ہیں جیسے نالائق، نامعقول، ناسمجھ وغیرہ

متن پر سوالات 4.4

1. سروری کے چہرے پر اطمینان کیوں تھا؟

(الف) کیونکہ اس کی بیٹی کبریٰ کی شادی ہو رہی تھی۔

(ب) کیونکہ اسے یقین تھا کہ کبریٰ کفن تو ضرور پہنے گی۔

(ج) کیونکہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔

-2 کبریٰ سے راحت نے شادی کیوں نہیں کی؟

(الف) اس میں جنسی کشش کم تھی۔

(ب) ہنرمند نہیں تھی۔

(ج) بہت موٹی تھی۔

آپ نے کیا سیکھا

- اس افسانے میں ایک عام معاشرتی مسئلہ ''غریب لڑکیوں کی شادی'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔
- اس افسانے میں بہت سے الفاظ ایسے آئے ہیں جو خاص عورتیں استعمال کرتی ہیں۔
- افسانہ نگار نے بہت سے محاوروں کا نہایت خوب صورت استعمال کیا ہے۔
- عصمت چغتائی عورتوں کے نفسیاتی پہلوؤں کو افسانے میں پیش کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔
- اصل چیز انسانی سیرت ہے۔ صرف صورت کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اچھے اور بُرے کی پرکھ کرنی چاہیے تھی۔ کبریٰ کو اس کی سیرت کا انعام نہیں ملا۔
- ہمیں سماج میں موجود ایسے ہنرمند لوگوں کی قدر کرنی چاہیے اور ان کی مدد بھی کرنی چاہیے۔
- جنسی بلوغ کے زمانے میں دل میں اٹھنے والے بہت سے غلط سوالات سے بچنا چاہیے اور جنس کے اخلاقی پہلو پر

NOS\NOTE2.tif not found.

دھیان دینا چاہیے۔

- جنس کو ممنوع نہیں سمجھنا چاہیے۔ ناواقفیت کی حالت میں اپنے بڑوں سے معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ غلط حرکات و سکنات سے بچنا چاہیے ورنہ سماجی نشوونما پر اس کے بُرے اثرات مرتب ہوں گے۔
- کچی عمر میں جنسی تعلقات قائم کرنے کے بُرے اثرات ہوتے ہیں۔ ناواقفیت کی حالت میں کم عمری میں لڑکیوں کا ماں بننا اس کی صحت اور جسمانی نشوونما کے لیے مضر ہے۔

4.10 اسلوب بیان

عصمت چغتائی کا طرز بیان بڑا ہی پیارا ہے۔ ان کے منجھے ہوئے جملے، روز مرہ اور چبھتے ہوئے فقرے افسانوں میں جان پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا انداز نہایت تیکھا اور برجستہ ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں مکالموں کے ذریعہ بڑے بڑے کام لیتی ہیں۔ وہ کرداروں کی زبانی ایسی تیکھی بات کہلواتی ہیں جس کا اثر براہ راست ذہن و دل پر پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں ایسے نازک معاملات کو کریدا ہے جس سے ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ ان کی آواز نئی ہے۔ انداز اتنا دلکش ہے کہ انکے فن کی قدر و قیمت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

4.11 مزید مطالعہ

عصمت چغتائی کے اور بھی کئی افسانے مشہور ہیں۔ انہیں پڑھیے۔

4.15 اختتامی سوالات

1. کبریٰ کے لیے رشتے نہ آنے کی وجہ کیا تھی؟
2. سروری، کبریٰ اور حمیدہ راحت کی خاطر داری میں کیوں لگے ہوئے تھے؟
3. اس افسانے میں عصمت چغتائی نے عورتوں کے کس نفسیاتی پہلو کو اجاگر کیا ہے؟
4. عصمت چغتائی کے اسلوب بیان پر روشنی ڈالیے؟

NOS\NOTE1.tif not found.

متن پر سوالات کے جوابات

4.1 1. ب 2. ج 3. ب

4.2 1. (i) خاک (ii) نازک (iii) محرم
(iv) راستہ بھول گئے (v) نمکین
2. ب
3. ب

4.3 1. (i) لا (ii) بے (iii) دور (iv) بد
2. ج

4.4 1. ب

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

5

راجندر سنگھ بیدی

مصنف کا تعارف

راجندر سنگھ بیدی کا شمار اردو کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی سیال کوٹ میں 1915ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے اور میٹرک کا امتحان پاس کر کے ڈی، اے وی کالج سے انٹر میڈیٹ کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے انگریزی، اردو اور پنجابی میں کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد 1948ء میں جموں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر بنائے گئے مگر استعفیٰ دے کر بمبئی چلے گئے اور فلموں کے لیے لکھنے لگے۔ ان کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے اور مکتی بودھ۔ ڈراموں کے دو مجموعے 'بے جان چیزیں' اور 'سات کھیل' بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تصنیف 'ایک چادر میلی سی' سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ حکومتِ ہند نے پدم شری کا خطاب بھی عطا کیا اور مودی غالب ایوارڈ بھی ملا۔

راجندر سنگھ بیدی کو کردار نگاری اور انسانی نفسیات کی مرقع کشی میں کمال حاصل تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک حقیقت نگار تھے۔ ان کے کردار انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

بیدی کا فن، زندگی کی بصیرت کا فن ہے۔ ان کے افسانوں میں جذباتیت کے بجائے خیالات اور واقعات کے پیچھے زندگی کی گہری معنویت ہے۔

مقاصد

افسانے کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد آپ:

- مشکل الفاظ کے معنی اور مطلب بیان کر سکیں گے؛
- افسانے کے اہم واقعات کو اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گے؛

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

- افسانے کے اجزائے ترکیبی کو بیان کرسکیں گے؛
- افسانے کے مرکزی خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرسکیں گے؛
- راجندر سنگھ بیدی کے اسلوب بیان پر روشنی ڈال سکیں گے؛
- مختلف توہمات سے باخبر ہوکر ان سے بچنے کی کوشش کریں گے۔

5.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

بھولا

(1)

میں نے مایا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دور کرنے کے لیے مایا نے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنوئیں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتا دیتی تھی۔ ہاں! اب مجھے یاد آیا۔ دو دن کے بعد مایا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لیے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں اپنے بھائیوں کے ہاں جا کر انہیں راکھی باندھتی ہیں۔ مگر مایا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لیے خود ہی آجایا کرتا تھا اور راکھی بندھوالیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہی یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے، اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔ ننھے بھولے نے میرے اس خیال کی تصدیق کردی۔ گنا چوستے ہوئے اس نے کہا:

کوزہ: پیالہ، آب خورہ

''بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نا؟''

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اٹھالیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم و نازک تھا اور اس کی آواز بہت سُریلی تھی، جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا تاہم میں نے زبردستی اس کے سرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کردی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

خوش الحانی: سریلی آواز (تشبیہہ)

''بھولے— تیرے ماموں جی...... تیرے ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟

تامل: سوچ بچار

بھولے نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ ''ماموں جی!''

استوتر: اشلوک جس میں ایشور کی تعریف کی گئی ہو۔

مایا نے استوتر پڑھنا چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ مایا

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتا تھا۔ میں نے بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے، کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروانہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر مایا نے ازخود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کرلیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی۔

مایا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر، ہری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

پھر اس نے اپنے لعل کو پیار سے بلاتے ہوئے کہا:

''بھولے— تم ننھی کے کیا ہوتے ہو؟''

''بھائی!'' بھولے نے جواب دیا۔

''اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں''

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا۔ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہوسکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے بابا جی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس مخمصے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اُچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی ماں سے گیتا سننے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا۔ وہ گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اور پھر جوہڑ کے کنارے اُگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے۔ بوڑھا جسم، اس پر مصیبتوں کا مارا ہوا، جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن چٹخنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولا کے سہارے ہی جیتا تھا ورنہ دراصل تو مر چکا تھا۔

رات کو میں تکان کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اونگھنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لیے آواز دی۔ اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اسے سیکڑوں دعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا:

''مجھ بوڑھے کی اتنی پروانہ کیا کرو بیٹا۔''

— بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔ بولا:

''بابا جی! آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟''

''نہیں بیٹا—'' میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا، ''میں آج بہت تھک گیا ہوں— کل دوپہر کو تمھیں سناؤں گا۔''

تلقین: تاکید
روح فرسا: جان کو تباہ کردینے والا ڈراؤنا
جوہڑ: کچّا تالاب
مخمصہ: پریشانی، اُلجھن
ادھیائے: باب، حصہ
دوب: ایک قسم کی گھاس
مزارعوں: (مزارع کی جمع) کاشت کاروں
توقف کے بعد: دیر کے بعد

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا ''میں تمہارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتا جی کا بھولا ہوں۔''

بھولا بھی جانتا تھا کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔ میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ ''بھولا بابا جی کا ہے اور ماتا جی کا نہیں۔'' مگر اس دن ہلوں کو کندھوں پر اٹھا کر چھ میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ شاید میں اتنا نہ تھکتا، اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا اور اس وجہ سے میرے پانو میں ٹیس نہ اٹھتیں۔ اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی طرح روشن تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ مدھم سا ہونے لگا— میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

صبح ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہوگا کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی؟ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو کہ اب بابا میری پروا نہیں کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت اس نے میری گود میں آنے سے انکار کر دیا اور بولا۔

''میں نہیں آؤں گا— تیرے پاس بابا!''

''کیوں بھولے؟''

''بھولا بابا جی کا نہیں— بھولا ماتا جی کا ہے۔''

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ سے منا لیا، اور چند ہی لمحات میں بھولا بابا جی کا بن گیا اور میری گود میں آ گیا۔ اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔ مایا ہری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا اور اسے کوزے میں ڈال کر کنوئیں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کٹھاس کو دھو ڈالا۔ اب مایا نے اپنے بھائی کے لیے سیر کے قریب مکھن تیار کر لیا تھا۔ میں بہن بھائی کے پیار کے اس جذبے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا، اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا: عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، خاوند بچے، سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے۔ اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔ بھولے نے دونوں ہاتھ میرے گالوں کی جھریوں پر رکھے، مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا:

''بابا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا—؟''

''کس بات کا بٹیا—؟''

''تمہیں آج دوپہر مجھے کہانی سنانی ہے۔''

''ہاں بٹیا—!'' میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا کہ بابا جی کے کہانی سنانے کا

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں، جس پر وہ بابا جی یا ماتا جی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا، میرے کھانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے لیا ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی جریب تھی۔ اس نے کہا کہ خانقاہ والے کنوئیں پر آپ کی زمین کو ناپنے کے لیے مجھے آج ہی فرصت مل سکتی ہے، پھر نہیں۔

جریب: زمین کو ناپنے کا پیمانہ
خانقاہ: درویشوں کی رہنے کی جگہ

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا کہ بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور خود پائینتی میں پانو اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خود غرضی پر مبنی تھا، تاہم مجھے خیال آیا۔

مبنی: جس پر کسی چیز کی بنیاد ہو، منحصر

''آخر مایا کا بیٹا ہی ہے نا—ایشور عمر دراز کرے۔''

میں نے پٹواری سے کہا کہ خانقاہ والے کنوئیں کو چلو اور میں تمہارے پیچھے پیچھے آجاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کو تیار ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا جس طرح گذشتہ شب کو آسمان کے ایک کونے میں مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ مایا نے کہا:

''بابا جی اتنی بھی کیا جلدی ہے—؟ خانقاہ والا کنواں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا— آپ کم سے کم آرام تو کر لیں۔''

''اؤں اؤں۔'' میں نے زیرِ لب کہا ''پٹواری چلا گیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے ادھر نہ ہو سکے گا۔''

مایا خاموش ہو گئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے کہا، ''بابا میری کہانی—میری کہانی—''

''بھولے—میرے بچے۔'' میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا، ''دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔''

''راستہ بھول جاتے ہیں؟'' بھولے نے سوچتے ہوئے کہا ''بابا تم جھوٹ بولتے ہو—میں بابا جی کا بھولا نہیں بنتا۔''

اب جب کہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا اور پندرہ بیس منٹ استراحت کے لیے نکال سکتا تھا۔ بھلا بھولے کی اس بات کو کس طرح برداشت کر لیتا۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اُتار کر چارپائی کی پائینتی پر رکھی اور اپنی دبتی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید بامشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا:

استراحت: آرام

''اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے—تو اس کے تم ذمہ دار ہو۔''

—اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سنائی۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دل کش انداز میں بیان کیا۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کرتا تھا جس کے آخر میں شہزادہ اور شہزادی کی شادی ہو جائے۔ مگر میں نے اس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی کوئی علامت نہ دیکھی، بلکہ وہ ایک افسردہ سامنہ

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنوئیں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گانو کا رُخ نہ کرلے، میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگا دیا تھا، تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی۔

خفیف: ہلکا، کم، شرمندہ

(2)

شام کو جب میں واپس آیا تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اسے بھگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''چل ماموں جی کے دیس — رے گھوڑے، ماموں جی کے دیس۔
ماموں جی کے دیس، ہاں ہاں! ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے......''

جوں ہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا، بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا اور بولا:

''بابا — آج ماموں جان آئیں گے نا — ؟''

''پھر کیا ہوگا بھولے — ؟'' میں نے پوچھا۔

''ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں کلو (کتّا) لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر مکی کے بھٹوں کا ڈھیر ہوگا نا بابا — ہمارے یہاں تو مکئی ہوتی ہی نہیں بابا، اور تو اور...... ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔''

میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس خوبی سے ''خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔'' کے الفاظ سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔ ''جیتا رہے'' میں نے دعا دیتے ہوئے کہا، ''بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کرے گا۔''

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا تا کہ ماموں جی کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔

دئیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا، دئیوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجہ میں مایا نے کہا۔

''بابا جی — بھیا ابھی تک نہیں آئے۔''

''کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں گے۔''

''ممکن ہے کوئی ضروری کام آ پڑا ہو — راکھی کے روپے ڈاک میں بھیج دیں گے۔''

gs\Administrator\Desktop Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

''مگر راکھی۔''

''ہاں راکھی کی کہو......انہیں اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔''

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجہ میں کہا'' ماتا جی — ماموں جی کیوں نہیں آئے۔''

مایا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا: ''شاید صبح کو آجائیں — تیرے ماموں جی — میرے بھولے!''

پھر بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

''میرے ماموں جی تمہارے کیا ہوتے ہیں؟''

''جو تم ننھی کے ہو۔''

''بھائی؟''

''تم جانو—''

''اور بنسی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں—''

''بھائی بھی نہیں؟''

نہیں—''

—اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آ گیا جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جانے پر تیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا سا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا مہاتم ایک دلچسپ کہانی ہوتا ہے، وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور مہاتم کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

''مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے۔'' میں نے دل میں کہا: ''اسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لیے تو آجانا چاہیے تھا۔'' میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکا یک مایا کی آواز سے میری نیند کھلی۔

وہ دودھ کا کٹورہ لیے کھڑی تھی۔

''میں نے کئی بار کہا ہے —— تم میرے لیے اتنی تکلیف نہ کیا کرو۔'' میں نے کہا۔

دودھ پینے کے بعد فرطِ شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہو کر میں مایا کو یہی دعا دے سکتا تھا کہ وہ

فرطِ شفقت: بے حد شفقت

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

سہاگ وتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا۔ مگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ تو برس ہوئے لُٹ گیا تھا، میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقّت کو دباتے ہوئے کہا:

''بیٹی تمہیں اس سیوا کا پھل ضرور ملے گا۔''

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا نتھی کو جو کہ اس کے ساتھ ہی سو رہی تھی، پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ اُٹھتے ہی اس نے کہا:

''بابا— ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟''

''آ جائیں گے— بیٹا۔ سو جاؤ، وہ صبح سویرے آ جائیں گے۔''

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لیے اس قدر بے تاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بے تاب سی ہو گئی، عین اُسی طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام بوڑھوں کی سی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹہ تک سو لیتا، پھر دو گھنٹہ جاگتا رہتا، پھر کچھ دیر اونگھنے لگ جاتا اور باقی رات اختر شماری کرتے گزار دیتا۔ میں نے مایا کو سو جانے کے لیے کہا اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

بتی جلتی رہنے دو، صرف دھیمی کر دو— میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں—'' میں نے سوئی ہوئی مایا سے کہا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلے پر جو لوگ آئے تھے ان میں ایسے آدمی بھی تھے جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ پڑوس کے ایک گانو میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں اور اسی لیے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ گھبرا کر ہاتھ پسارا تو میں نے دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ مایا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونا کونا چھانا۔ بھولا کہیں نہ تھا—!

''مایا— ہم لُٹ گئے۔'' میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

مایا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا، یہ کوئی اُسی سے پوچھے۔ اپنے سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہو گئیں اور بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگیں۔

میں عورتوں سے زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازی گر کو اپنے گھر کے اندر گھورتے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پروا نہیں کی تھی۔ آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے۔ میں نے دعائیں کیں کہ کسی وقت کا دیا کام آ جائے۔ منتیں مانیں کہ بھولا مل

سہاگ وتی: سہاگن

اختر شماری: تارے گننا، جاگنا

واردات: حادثہ، واقعہ

شق ہونا: پھٹ جانا

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

جائے۔ وہی اندھیرے گھر کا اُجالا تھا۔ اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اسی کی آس سے ہم اُڑے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی، وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا، مایا بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ گئے تھے نسیں کھچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور عورتیں اس کی ناک بند کر کے ایک چمچے سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں، ایک لمحہ کے لیے میں بھولے کو بھی بھول گیا۔ میرے پانو تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے لرزتے ہوئے ایشور کو بُرا بھلا کہا کہ ان دُکھوں کے دیکھنے سے پیشتر اس نے میری جان کیوں نہ لے لی۔ آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

بال بیکا نہ ہونا: کوئی نقصان نہ ہونا

قریب تھا کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آگئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دل میں کہا: میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں تو مایا کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا:

''مایا بیٹی— دیکھو! مجھے یوں خانہ خراب مت کرو— حوصلہ کرو۔ بچے اغوا ہوتے ہیں، مگر آخر مل بھی جاتے ہیں۔ بازی گر بچوں کو مارنے کے لیے نہیں لے جاتے، پال کر بڑا کر کے کسی کام میں لانے کے لیے لے جاتے ہیں— بھولا مل جائے گا۔''

اغوا: اٹھا کر لے جانا

ماں کے لیے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اس طرح صبر کرنے پر گمان ہوا، گویا میں اس وجہ سے چُپ ہو گیا ہوں کہ مجھے مایا کے مقابلہ میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔ مگر ''نہیں''— میں نے کہا: ''آدمی کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہیے۔

اس وقت آدھی رات ادھر تھی اور آدھی اُدھر، جب ہمارا پڑوسی اس حادثے کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لیے، جو گاؤں سے دس کوس دور شہر میں تھا، روانہ ہوا۔

باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے تاکہ دن نکلنے پر کچھ سجھائی دے۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔ اس کی گود میں بھولا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتّی تھی۔ ہمیں تو گویا دنیا کی دولت مل گئی۔ مایا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارکباد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا:

''مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر شب کی تاریکی میں راستہ بھٹک گیا۔ یکا یک مجھے ایک جانب سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوفناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتّی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس کے اس وقت وہاں ہونے کا سبب پوچھا

ششدر: حیران

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

تو اس نے جواب دیا— کہ بابا جی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا کہ تم راستہ بھول گئے ہو گے اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمہ دار ہو گے نا۔—!!''

5.2 متن کی تشریح

(1)

میں نے مایا کو۔۔۔۔۔وہ نرم مطلق نہ ہوتی

افسانے کے پہلے حصے میں مصنف نے بتایا ہے کہ مایا ایک بیوہ عورت ہے، جو اپنے بچے بھولا اور سسر کے ساتھ رہتی ہے۔ مایا اپنے سسر کا بہت خیال رکھتی ہے۔ سسر بھی اپنی بہو مایا کو بہت چاہتے ہیں۔ اور اسے خوش رنگ کپڑے پہنتے، ہنستے، مسکراتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر مایا سماج سے بہت ڈرتی ہے۔ اس لیے اپنے سسر کی اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتی۔ ہمارے سماج میں بیواؤں کا خوش رہنا، رنگین کپڑے پہننا، چوڑیاں پہننا اور لڑکی کی شادی میں شریک ہونا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟ یقیناً آپ کا جواب ہوگا 'نہیں'۔ بیواؤں کو رنگین کپڑے پہننے، ہنسنے مسکرانے اور خوش رہنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ آپ خود سوچیے کیا کوئی عورت اپنی مرضی سے بیوہ ہوتی ہے؟ اور کیا بیوہ ہو جانے کے بعد عورتوں کے شوق، ارمان اور خواہشات بھی مر جاتے ہیں؟ کیا اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ یہ سب غلط قسم کی باتیں ہیں جو تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہمارے سماج میں رائج ہیں۔ اسی لیے مایا سماج سے ڈرتی تھی اور خاموش رہتی تھی۔ بھولا، مایا کا بہت معصوم اور پیارا بچہ ہے۔ وہ اپنی ماں اور دادا سے بہت پیار کرتا ہے۔ اسے کہانیاں سننے کا بہت شوق ہے۔ ایک دن وہ اپنے دادا سے دوپہر میں کہانی سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ تو دادا اس سے کہتے ہیں۔ دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے کہانی سنانا شروع کر دیتے ہیں کہ ''اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔'' بھولا کہانی سن تو لیتا ہے مگر اس کے چہرے پر خوشی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ کیوں کہ اب اس کے دل میں یہ وہم سما جاتا ہے کہ میرے ماموں آنے والے ہیں کہیں وہ راستہ نہ بھول جائیں۔

افسانے کے اس حصے میں دراصل بچے کے کردار کو جس کا نام بھولا ہے کی نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بھولا کی ماں بیوہ ہے۔ بھولا باپ کا پیار دادا سے پاتا ہے۔ بچے کی نفسیات میں کہانی سننا ایک اہم نفسیاتی تقاضہ ہے بچے کہانیوں کے کردار کو اپنا آئیڈیل تو بناتے ہی ہیں بلکہ اس کہانی کے بعض فقروں اور زبان کو بھی اپنی زندگی کا حصہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ دادا نے پوتے کو اس کی ضد پر دن میں کہانی تو سنائی مگر اسے یہ کہتے ہوئے کہانی سنائی کہ دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اور اس کے ذمہ دار تم ہو گے اس لیے کہانی سن کر وہ پہلے کی طرح خوش نہیں ہو پاتا۔

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

5.3 زبان کے بارے میں

1. راجندر سنگھ بیدی نے اس افسانے میں ہندو سماج میں مستعمل روزمرہ کے ان الفاظ جن کا تعلق مذہبی امور سے ہے کا استعمال کیا ہے مثلاً راکھی۔ استوتر، پانو، ہری ہر ہری ہر ہری، مہاتم

2. راجندر سنگھ بیدی اکثر خوبصورت تشبیہوں کے استعمال سے افسانے کے ماحول اور کردار کو آئینہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً بھولا جو اس افسانے کا اہم کردار ہے کے بھولے پن اور اس کے نرم نرم ہاتھ اور سریلی آوازوں کو مندرجہ ذیل تشبیہہ سے اچھی طرح اجالتے ہیں مثلاً

''بھولے کا جسم بہت نرم و نازک تھا اور اس کی آواز بہت سریلی تھی، جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔

متن پر سوالات 5.1

درست جواب پر () کا نشان لگائیے۔

1. مایا رنگین کپڑے کیوں نہیں پہنتی تھی؟
   (الف) وہ سماج سے ڈرتی تھی۔
   (ب) وہ اپنے سسر سے ڈرتی تھی۔
   (ج) وہ بھولا سے ڈرتی تھی۔
   (د) کیونکہ وہ ایک بیوہ عورت تھی۔

2. کہانی سننے کے بعد بھولا خوش کیوں نہ ہوا؟
   (الف) کہانی اچھی نہیں تھی؟
   (ب) بھولا کے دل میں ماموں کے راستہ بھول جانے کا وہم سما گیا تھا۔
   (ج) دادا نے آدھی ہی کہانی سنائی تھی۔

3. مندرجہ ذیل مکالمے بولنے والے کا نام، مکالمے کے سامنے لکھ دیجئے۔
   (الف) اسی طرح تیرے ماموں جی بھی میرے بھائی ہیں۔
   (ب) بابا جی! آج آپ کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟
   (ج) ''اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے — تو اس کے ذمے دار تم ہو۔''

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

5.4 متن کی تشریح

(2)

شام کو جب میں واپس.........................بھول گیا تو تم ذمہ دار ہو گے نا

یہ کہانی کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے بتایا ہے کہ دادا جی بھولا کو کہانی سنا کر جلدی سے اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتے ہوئے پٹواری کے پاس گئے۔ پٹواری اس آدمی کو کہتے ہیں جو گاؤں کی زمینوں کے مالکانہ حقوق اور پیمائش کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ دادا جی اپنی زمینوں کی پیمائش کرواکے جب گھر واپس آتے ہیں تو بھولا انہیں کھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر کھیلتے ہوئے بھی دراصل اپنے ماموں کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ دادا سے کہتا ہے۔ ''ماموں جی ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔'' مایا بھی دن ہی سے بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر رات ہو جانے پر بھی جب بھائی گھر نہیں پہنچا تو اس نے سسر سے کہا: ''بابا جی! بھیا ابھی تک نہیں آئے۔'' سسر اسے تسلی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہاری راکھی کے پیسے ڈاک سے بھیج دیں گے۔ مایا یہ سن کر خاموش ہو جاتی ہے اور سب کے کھانے کا انتظام کرتی ہے۔ جب سب لوگ لیٹ جاتے ہیں، اور مایا چراغ بجھانے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے، تو اس کے سسر یہ کہہ کر اسے چراغ بجھانے سے روک دیتے ہیں کہ آج کل بہت سے ایسے لوگ آس پاس گھوم رہے ہیں جو بچوں کو اٹھالے جاتے ہیں۔ اس لیے دیا جلتا رہنے دو۔

1. کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دادا جی کے جوتوں سے ان کے پاؤں میں کیوں تکلیف ہو رہی تھی؟ اپنا جواب یہاں لکھیے۔

....

....

آپ نے ٹھیک لکھا۔ دادا جی کے پیروں میں اس لیے تکلیف ہو رہی تھی کہ ان کے جوتے نئے تو تھے، مگر تھوڑے سے چھوٹے تھے، جس کی وجہ سے ان کا پاؤں اس میں دبتا تھا۔ مایا نے جوتوں میں سرسوں کا تیل لگا دیا تھا۔ مگر جوتے اس سے بھی نرم نہیں ہوئے تھے۔

2. کیا آپ سمجھ گئے کہ بابا جی نے مایا کو دیا بجھانے سے کیوں منع کر دیا؟ اپنا جواب یہاں لکھیے۔

....

....

آپ نے ٹھیک لکھا۔ گانو میں میلا لگا ہوا تھا۔ اور بابا جی کو اندیشہ تھا کہ گاؤں میں باہر کے لوگ آئے ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ چور اُچکّے بھی ہو سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کو کوئی بھولا کو غائب کر دے۔ اسی لیے انھوں نے مایا کو بتّی بند کرنے سے روک دیا۔

رات کے کسی حصے میں مایا بابا جی کی آواز سُن کر جاگ اٹھتی ہے ''مایا— ہم لُٹ گئے۔'' اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ بھولا گھر میں نہیں ہے۔ تو وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مارنے اور بال نوچنے لگتی ہے۔ اور تھوڑی دیر میں بے ہوش ہو جاتی ہے۔ بابا جی کچھ تو بھولا کی وجہ سے پریشان تھے۔ اب مایا کی یہ حالت دیکھ کر اور پریشان ہو گئے۔ اور زندگی

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

میں پہلی بار انہوں نے ایشور کو بُرا بھلا کہا۔ جب انسان چاروں طرف سے پریشانیوں سے گھر جاتا ہے تو ایشور یا اللہ سے شکایت بھی کرنے لگتا ہے۔ بابا جی پہلے اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ اب ان کا چہیتا پوتا گھر سے غائب ہو گیا تھا۔ اِدھر بہو بے ہوش پڑی تھی۔ ظاہر ہے بابا جی کے اوسان کس طرح بحال رہ سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ایشور کو بُرا بھلا کہا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بھی بے ہوش ہو جائیں، مایا کو ہوش آ گیا۔ تب بابا جی کو کچھ اطمینان ہوا۔ اور انہوں نے آدھی رات کو ایک آدمی تھانے بھیجا۔ جو گاؤں سے دس میل دور تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک دروازہ کھُلا اور بھولا کو گود میں لیے ہوئے ماموں گھر میں داخل ہوئے۔ بھولا ہاتھ میں چراغ لیے ہوئے تھا۔ بعد میں ماموں جی نے بتایا کہ وہ اندھیرے میں سچ مُچ راستہ بھول گئے تھے۔ مگر بھولا کے چراغ نے انہیں راستہ دکھایا اور وہ گھر تک پہنچے۔ جب انہوں نے بھولا سے پوچھا کہ اتنی رات کو وہ راستے میں کیا کر رہا تھا۔ تو اس نے بتایا کہ آج اس نے دادا سے دن میں کہانی سُن لی تھی۔ کہانی سناتے ہوئے دادا نے کہا تھا کہ دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ جب آپ کو آنے میں دیر ہوئی تو میں ڈر گیا کہ میرے کہانی سُننے کی وجہ سے آپ راستہ بھول گئے۔ اسی لیے چراغ لے کر یہاں چلا آیا۔

3. کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آدھی رات کے وقت بھولا کہاں چلا گیا تھا؟ اپنا جواب یہاں لکھیے۔

....

....

....

آپ نے ٹھیک لکھا۔ بھولا نے دن میں کہانی سنی۔ اسی لیے اس کے دل میں یہ وہم سما گیا تھا کہ میرے ماموں بھی راستہ بھول گئے ہیں۔ اور اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ اسی لیے وہ کسی ڈر اور خوف کے بغیر آدھی رات کو چراغ لے کر ماموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

آپ نے دیکھا کہ بابا جی نے کس طرح انجانے میں معصوم بھولا کے دل میں ایک وہم، ایک بے بنیاد خیال بٹھا دیا جس کی وجہ سے بھولا کو کتنی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اسی طرح کے اور بہت سے توہمات ہیں جو ہمارے سماج میں مانے جاتے ہیں۔ مثلاً باہر جانے سے پہلے چھینک آ جائے تو باہر نہیں جانا چاہیے یا اگر بلّی راستہ کاٹ جائے تو ہم جس کام کو کرنے کے لیے جا رہے ہیں اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔ یا سونے کا کھو جانا اچھا نہیں ہوتا۔ یا اگر دوا کی شیشی ٹوٹ جائے تو مریض ٹھیک ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ باتیں غلط ہیں۔ ہمیں اپنے ذہن میں ان باتوں کو جگہ نہیں دینی چاہیے۔ یہ باتیں بھی ہماری ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

5.5 زبان کے بارے میں

راجندر سنگھ بیدی کا بیانیہ بہت جاندار ہوتا ہے۔ بیان اور بیانیہ میں باریک سا فرق ہے۔ ''بیان'' میں ہم کسی بھی شے کو جوں کا توں بیان کر دیتے ہیں لیکن بیانیے میں ہم منطق کا سہارا لے کر واقعات کو پُر تاثیر اور قابل قبول بناتے ہیں بھولا کے مکالمے میں اور اس کی حرکات وسکنات کے بیان کے لیے راجندر سنگھ بیدی نے سوچ سمجھ کر لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً ماموں جی کے بارے میں بھولا قیاس آرائیاں کرتا ہے کہ ماموجی اگن بوٹ لائیں گے۔ کلو (کتا) لائیں گے وغیرہ۔

5.2 متن پر سوالات

درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے۔

1. بابا جی لنگڑاتے ہوئے کیوں چل رہے تھے؟
   (الف) ان کے پاؤں میں تکلیف تھی۔
   (ب) دادا جی بیمار تھے۔
   (ج) ان کے جوتے چھوٹے تھے اور ان کی ایڑی کو دبا رہے تھے۔
2. بابا جی نے کیوں کہا ''بتّی جلتی رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو۔''
   (الف) انہیں چوروں کا خطرہ تھا۔
   (ب) انہیں اندھیرے سے ڈر لگتا تھا۔
   (ج) بھولا اندھیرے میں ڈر کر جاگ جاتا تھا۔
3. بھولا کے گھر سے غائب ہو جانے پر مایا کا کیا حال ہوا؟
   (الف) مایا چیخنے اور بال نوچنے لگی۔
   (ب) مایا گم سُم ہوگئی۔
   (ج) مایا گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔
4. بھولا آدھی رات کے وقت گھر سے نکل گیا تھا کیوں کہ......
   (الف) وہ اپنے ماموں سے سب سے پہلے ملنا چاہتا تھا۔
   (ب) وہ ماموں جی کو حیران کر دینا چاہتا تھا۔
   (ج) اس کے دل میں یہ وہم سما گیا تھا کہ اگر ماموں راستہ بھول گئے تو میں ذمہ دار ہوں گا۔
5. مندرجہ ذیل مکالموں کے سامنے ان کے کرداروں کے نام لکھیے۔
   (الف) ''ایسی مٹھائی لائیں گے کہ آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔''

gs\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

(ب) ''باباجی! بھیا ابھی تک نہیں آئے۔''

(ج) 'مایا——ہم لُٹ گئے۔''

6. افسانے میں کس قسم کے توہم کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کا نام کیا ہے۔

(الف) گھر کا بھیدی

(ب) اگن بوٹ

(ج) دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔

5.6 اسلوب بیان

کوئی کہانی یا افسانہ کتنا پُر اثر ہے یہ اس کے اسلوب بیان پر منحصر ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی زبان سادہ اور روزمرہ کی زبان ہے۔اسی لیے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔اس افسانے کی زبان اس کے کرداروں کے رہن سہن اور ان کے ماحول کے عین مطابق ہے۔بھولا کے گھر سے غائب ہو جانے اور مایا کی حالت خراب ہونے پر باباجی کا ایشور کو بُرا بھلا کہنا ایک نفسیاتی عمل ہے۔اس افسانے میں بول چال کی زبان میں کرداروں کے خیالات اور جذبات کو پڑھنے والے تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔اسی لیے افسانہ پڑھنے والے کے دل کو موہ لیتا ہے۔

آپ نے کیا سیکھا

☆ افسانے کی زبان سادہ، آسان اور بول چال کی زبان ہے۔

☆ تمام کردار پلاٹ کے عین مطابق ہیں۔

☆ کرداروں کی زبان اور خیالات ان کی عمر اور ان کے حالات کے مطابق ہیں۔

☆ بیدی زندگی چھوٹی بڑی سچائیوں کو افسانہ کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔

☆ بچوں کے سوالات کے غلط جوابات نہیں دینے چاہئیں۔

☆ ضعیف الاعتقادی یعنی ایمان اور یقین کی کمزوری ایسی باتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو اور جن کے بارے میں یہ گمان ہو کہ ان کے کرنے سے ایسا ہوگا جیسے ''دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں'' اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔دن میں ہزاروں کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوتا۔اگر کبھی کوئی حادثہ ہو بھی جاتا ہے تو اس کو ان باتوں سے نہیں جوڑنا چاہیے۔ہمارے سماج میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے بہت سے توہمات اور غلط باتیں رائج ہیں۔ہمیں خود بھی ان سے بچنا چاہیے اور دوسروں کو بچانا چاہیے۔

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

☆ بیواؤں کا خوش رہنا، رنگین کپڑے پہننا یا دوسری شادی کرنا بُری بات نہیں ہے۔

5.10 اختتامی سوالات

1. 'وہم' کسے کہتے ہیں؟
2. ماموں نے گھر میں آ کر کیا کہانی سنائی؟
3. بابا جی آسمان میں ایک روشن تارے کو ٹکٹکی لگا کر کیوں دیکھتے رہتے تھے؟
4. بابا نے بھولا کی کس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ بہت ذہین لڑکا ہے؟
5. افسانے کے اجزائے ترکیبی لکھیے۔

5.7 مزید مطالعہ

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے کسی ایک مجموعے کے افسانے پڑھیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

5.1
1. الف
2. ب
3. مایا
4. بھولا
5. بابا جی

5.2
1. ج
2. الف
3. الف
4. ج
5. بھولا
6. مایا
7. بابا جی

5.3
1. ج
2. ب

Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

6

کرشن چندر

مصنف کا تعارف

کرشن چندر کا شمار اردو کے عظیم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ 23/نومبر 1914ء کو پنجاب میں پیدا ہوئے۔ وہ نسلاً کشمیری تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کشمیر میں ہوئی۔ ایف۔ سی کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ پھر گورنمنٹ لاء کالج لاہور سے ایل۔ ایل۔ بی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے پہلے پہل ایک اخبار میں صحافی کی حیثیت سے ملازمت کی۔ 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ پھر فلمی دنیا سے منسلک ہوئے اور آخری عمر تک بمبئی میں مقیم رہے۔

کرشن چندر معاشرے کی بے رحمیوں اور ناانصافیوں کے خلاف کھل کر اپنے افسانوں میں اظہار کرتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ کشمیر میں گزرا اس لیے ان کو مناظر فطرت کی مصوّری سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ سماج کے ہر طبقے کی نفسیات سے واقف ہیں۔ مہاجن، ساہوکار، اعلیٰ حکام، مذہبی پیشوا اور سیاسی رہنما، حکومت کے وزراء سب ان کے طنز کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں 'زندگی کے موڑ پر'، 'بالکنی' 'کالو بھنگی' اور 'مہا لکشمی کا پل' قابل ذکر ہیں۔ ان کے ناولوں میں 'شکست'، 'ہمارا گھر'، 'پانچ لوفر' اور یادوں کے چنار وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

18 مارچ 1977ء کو وہ دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

انہوں نے ایک ہی ڈراما ''دروازے کھول دو'' لکھا ہے۔ جو بے حد مقبول ہوا۔ آج آپ اس ڈرامے کا آخری حصہ پڑھیں گے۔

ہمارا ملک مختلف رنگوں اور قوموں کا گہوارہ ہے۔ یہاں ہر جگہ کے رسوم و رواج اور تہذیب جدا ہے۔ اس اختلاف کو اگر نفرت کا سبب بنا لیا جائے تو ملک کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس ملک میں قومی ایکتا کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے پیش نظر کرشن چندر نے ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' لکھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ جب دل کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں تو مذہبی جوش جنون کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ لیکن جب کوئی آدمی اپنے دل کے دروازے کھلے رکھتا ہے تو کسی کو دکھ نہیں دیتا۔ کسی کا دل نہیں توڑتا۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ سب کا سکھ سب کی بھلائی چاہتا ہے۔

Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

کرشن چندر نے اس ڈرامے کے ذریعے قومی یکجہتی اور بھائی چارے کا پیغام دیا ہے۔ یہ ڈراما کافی طویل ہے۔ اس کتاب میں ڈرامے کا آخری حصہ شامل کیا گیا ہے۔

مقاصد

اس ڈرامے کو پڑھنے کے بعد آپ:

- ڈرامے کے تین اہم اجزاء کے بارے میں بتاسکیں گے؛
- ڈراما کے مرکزی خیال کو سمجھ کر بیان کرسکیں گے؛
- ڈرامانگار کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاسکیں گے؛
- ڈرامانگار کے اسلوب بیان پر اظہار رائے کرسکیں گے۔

6.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

دروازے کھول دو (آخری حصہ)

ڈرامے کے کردار

پنڈت رام دیال	کمل کنج بلڈنگ کا مالک
کمل کانت	پنڈت رام دیال کا بیٹا
مرزا ارشاد حسین	رام دیال کا منیجر
مس ازا بیلا کوئیلو	نوجوان لڑکی
ڈاکٹر ایڈورڈ کوئیلو	اس کا باپ
انکل رام بھروسے	ان کا پرانا نوکر

منظر

(کمل کنج بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور میں ایک مستطیل بڑا سا آفس نما کمرہ، کمرے کی دیواروں پرنئی نئی سفیدی ہوچکی ہے۔

Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

بریکٹوں سے بجلی کے تار باہر نکلے ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس بلڈنگ میں بجلی نہیں آئی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کے تختے، سیمنٹ، رنگ کے ڈبے وغیرہ رکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں ابھی تعمیر کا کام ختم نہیں ہوا ہے۔

اسٹیج کے مرکز میں سامنے کی دیوار پر گنیش جی کی ایک بڑی تصویر آویزاں ہے۔ اس تصویر کے نیچے رام دیال کی کرسی ہے۔ اس کے سامنے ایک میز رکھی ہے۔ جس پر بلڈنگ کا نقشہ، قلم دان، چند فائلیں اور ٹیلی فون وغیرہ رکھے ہیں۔

دائیں طرف آخر میں ایک تخت بچھا ہے اس پر گاؤ تکیہ لگا ہے چند کرسیاں اور اسٹول بھی ادھر ادھر بے ترتیبی سے پڑے ہیں۔)

اب تک کا خلاصہ

رام دیال ایک کٹر برہمن ہے۔ جو فلیٹس بنوا کر بیچتا ہے یا کرایے پر دیتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس نو فلیٹس خالی ہیں لیکن وہ کسی ایسے آدمی کو کرائے پر دینے کو تیار نہیں جو اس کا ہم مذہب یا ہم ذات نہ ہو۔ ایک مسلمان جوڑے کو اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ کے لیے مناسب جگہ جامع مسجد اور اردو بازار ہے۔ ایک پنجابی کو اس لیے فلیٹ نہیں دیا کہ وہ گوشت، مچھلی کھاتا ہے۔ ایک مدراسی ہوٹل والے کو مکان دینے سے اس لیے انکار کرتا ہے کہ وہ چمار کا بیٹا ہے۔ آخر میں ایک عیسائی لڑکی فلیٹ لینے آتی ہے۔ اس وقت رام دیال آفس میں نہیں ہوتا ہے اس کا بیٹا کمل کانت اسے فلیٹ دینے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ لڑکی اپنے انکل رام بھروسے کو فون کر کے بلا لیتی ہے۔ وہ سامان سمیت کمل کنج اپارٹمنٹ پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت آفس میں کوئی نہیں ہوتا ہے۔ کمل کانت لڑکی کو لے کر فلیٹ دکھانے گیا ہے۔ رام بھروسے کونے کے تخت کو اسٹیج کے مرکز میں لیتا ہے اور اس پر بڑے مزے سے دراز ہو جاتا ہے۔ آفس میں سامان ادھر ادھر پھیلا ہوا ہے (پردہ اٹھتا ہے)۔

چند لمحوں بعد لڑکی کا باپ ڈاکٹر کوئیلو داخل ہوتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں میڈیکل بیگ ہے اور کوٹ کی جیب میں اسٹیتھیسکوپ ٹھونسا ہوا ہے۔ کمرے میں آتے ہی اس کی نظر اپنے سامان پر پڑتی ہے پھر رام بھروسے پر۔ وہ ٹھوکا دے کر رام بھروسے کو جگاتا ہے۔ رام بھروسے ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے۔
اس کے بعد جو منظر دکھائی دیتا ہے اس میں رام بھروسے اور ڈاکٹر باتیں کر رہے ہیں۔

آیئے اب اصل ڈرامے کا آخری حصہ پڑھتے ہیں

(جب مزدور چلے جاتے ہیں تو انکل رام بھروسے کونے کے تخت کو اسٹیج کے مرکز میں لیتا ہے اور اس پر بڑے مزے سے دراز ہو جاتا ہے) اتنے میں چند لمحوں کے بعد کمرے میں ڈاکٹر داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا میڈیکل بیگ

دراز ہونا: لیٹ جانا

Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

ہے اور کوٹ کی جیب میں اسٹیتھیسکوپ ٹھونسا ہوا ہے۔ اور باہر نکلا ہوا ہے۔ کمرے میں آتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے تو اپنے سامان پر پڑتی ہے پھر تخت پر لیٹے ہوئے رام بھروسے پر جو آنکھیں بند کئے لیٹا ہے اور وہ حیرت سے کبھی اپنے سامان کو کبھی رام بھروسے کی طرف دیکھتا ہے پھر ٹھوکا دے کر رام بھروسے کو جگا دیتا ہے۔ رام بھروسے گھبرا کر اٹھتا ہے اور ڈاکٹر کو دیکھ کر مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے۔

مؤدب: ادب سے

ڈاکٹر : تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اور ہمارا سامان یہاں کیسے آ گیا؟

رام بھروسے : بٹیا نے ٹیلی فون کیا تھا سرکار۔ سامان لے کر فوراً یہاں آ جاؤ۔ میں آ گیا

ڈاکٹر : بلو نے ٹیلی فون کیا تھا؟

رام بھروسے : ہاں سرکار

ڈاکٹر : تو ضرور اسے یہاں فلیٹ مل گیا ہوگا۔ وہ غلط ٹیلی فون کرنے والی نہیں ہے مجھے ذرا ایک مریض کے ہاں دیر ہوگئی ورنہ اس سے پہلے آ جاتا۔ بلّو کہاں ہے؟

رام بھروسے : معلوم نہیں سرکار مگر کمل کنج تو یہی ہے؟

ڈاکٹر : بلڈنگ تو نئی معلوم ہوتی ہے اور باہر سے فلیٹ بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

بلڈنگ: عمارت

رام بھروسے : ہماری بٹیا کوئی برا فلیٹ تھوڑی پسند کریں گی۔

(پنڈت رام دیال انجینئر مکرجی کے ہمراہ واپس اندر آ رہے ہیں باتیں کرتے ہوئے)

رام دیال : اگر تین دن میں گھسائی ختم ہو جائے تو اچھا ہے؟

مکرجی : ہو جائے گا

(یکایک رام دیال سامان سے ٹھوکر کھا کر حیران ہو کر کہتا ہے)

رام دیال : ایں؟ یہ سامان کس کا ہے؟

ڈاکٹر : ہمارا ہے اور کس کا ہے؟

رام دیال : اور آپ کون ہیں؟

ڈاکٹر : (غصے سے) اور آپ کون ہیں؟

رام دیال : یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔ پہلے آپ بتایئے آپ کون ہیں اور کس نے یہاں آپ کو سامان لانے کی اجازت دی؟

ڈاکٹر : (تلخی سے) سامان تو وہی لائے گا جو فلیٹ کرایے پر لے گا۔ میری بیٹی نے غالباً یہاں فلیٹ کرایے پر لیا ہے۔

تلخی: کڑواہٹ

رام دیال : (طنزاً) غالباً

طنزاً: طنز کے ساتھ

Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

ڈاکٹر : (بھڑک کر) غالباً نہیں یقیناً۔ وہ اس قدر SURE شیور نہ ہوتی تو میرے نوکر کو ٹیلی فون کر کے سامان یہاں نہ منگا لیتی۔

رام دیال : مگر آپ کی بیٹی ہے کہاں؟

ڈاکٹر : یہی تو میں آپ سے پوچھتا ہوں میری بیٹی ہے کہاں؟

رام دیال : میں کیا آپ کی بیٹی کا رکھوالا ہوں۔

ڈاکٹر : مگر اس نے ابھی یہاں سے ٹیلی فون کیا تھا کیوں رام بھروسے؟

رام بھروسے : جی ہاں۔

ڈاکٹر: (رام دیال سے) اور تم کہتے ہو تمہیں کچھ پتا ہی نہیں؟

YOU WICKED OLD MAN

(لپک کر ڈاکٹر پنڈت رام دیال کی طرف بڑھتا ہے اور جلدی سے اس کو گردن سے پکڑ لیتا ہے۔) ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہاں ہے میری لڑکی؟ ورنہ ابھی پولیس کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔

رام دیال گردن چھڑاتے ہوئے) آ...آ...آ

لڑکی کی آواز : ڈیڈی! ڈیڈی۔

(ڈاکٹر پلٹ کر دیکھتا ہے تو اسے اپنی لڑکی مکمل کانت کے ساتھ نظر آتی ہے وہ جلدی سے رام دیال کی گردن چھوڑ دیتا ہے رام دیال زور زور سے ہانپ رہا ہے۔لڑکی بھاگ کر ڈاکٹر کے پاس آتی ہے)

لڑکی : ڈیڈی میں ابھی ابھی فلیٹ دیکھ کے آ رہی ہوں۔

IT'S A VERY NICE FLAT

TWO BIG BED ROOM

TWO BIG BATH ROOM

AND A BIG HALL AND A BIG KITCHEN

AND A BIG PANTRY OH!

IT IS LOVELY

یونو اور کرایہ صرف سات سو روپے۔

ڈاکٹر : تم نے لے لیا۔

لڑکی : یہ دیکھیے فلیٹ کی چابی۔

رام دیال : (بیٹے سے) تم نے فلیٹ ان کو دے دیا۔

sure: شیور پر یقین پر اعتماد

You wicked old man: اے بوڑھے ظالم مرد

ڈیڈی: والد

Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

کمل کانت : ہاں پتا جی۔

رام دیال : مگر یہ ہیں کون؟

کمل کانت : (گھبرا کر) یہ...... یہ...... تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔

رام دیال : نام تک نہیں پوچھا اور کرایے پر دے دیا۔

کمل کانت : ان کا نام بلو ہے شاید۔

رام دیال : بلّو؟ بلّو؟؟ کون بلّو بلّو تو بملا ہو سکتی ہے۔ بلّو تو بلونت کور ہو سکتی ہے۔ اور بلّو تو بتول بھی ہو سکتی ہے۔
کمل کانت یہ تو میں نے پوچھا نہیں۔ میرے لیے بلّو کافی ہے، بہت کافی ہے۔ (لڑکی اور کمل دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں)

لڑکی : میں بتاتی ہوں، میرا نام ازابیلا ہے۔ ازابیلا کوئیلو اور یہ میرے ڈیڈی ہیں، ڈاکٹر ایڈورڈ کوئیلو۔ ہندوستان کے مشہور ''HEART SPECIALIST''

Heart Specialist: ماہر امراض قلب، دل کا ڈاکٹر

رام دیال : (اونچی آواز میں) ایڈورڈ کوئیلو؟ ازابیلا کوئیلو؟
(دونوں باپ بیٹی سر ہلاتے ہیں)

رام دیال : (اور بلند آواز سے) تو آپ لوگ کرسٹان ہیں؟ (دونوں باپ بیٹی سر ہلاتے ہیں)

کرسٹان: عیسائی

رام دیال : ہے...... بھگوان...... میرا تو دھرم بھرشٹ ہو گیا۔ (مٹھّیاں کس کر) نکل جاؤ بدمعاشو، ابھی چلے جاؤ۔ میرے گھر سے نکل جاؤ۔

بھرشٹ ہونا: خراب

کمل کانت : پتا جی۔

رام دیال : (چیخ کر) میں مر جاؤں گا۔ مگر جیتے جی ان کو کبھی اپنی بلڈنگ میں گھسنے نہیں دوں گا۔ سنتے ہو نکل جاؤ۔
(مرزا جی داخل ہوتے ہیں اور خاموشی سے تماشا دیکھتے ہیں)

ڈاکٹر کوئیلو : جانتا ہوں مگر عدالت میں تم سے سمجھوں گا۔ میں تم سے پچاس ہزار روپے ہرجانہ وصول کروں گا۔

رام دیال : تم پچاس ہزار نہیں ایک لاکھ وصول کرو۔ پانچ لاکھ وصول کرو۔ دس لاکھ وصول کرو، مگر تم کبھی نہیں اس بلڈنگ میں...... ہائے۔
(یکا یک اپنے دل کو پکڑ کر تخت پر دھڑام سے گر جاتا ہے زور سے ''پتا جی'' کہہ کر کمل کانت ان کی طرف بڑھتا ہے۔ مکر جی اور مرزا جی بھی...... جاتے جاتے ڈاکٹر کوئیلو اور ازابیلا کوئیلو رک کر دیکھتے ہیں۔)

مرزا جی : دل کا دورہ پڑ گیا۔

ڈاکٹر : چلو بیٹی (ڈاکٹر اپنی بیٹی کو لے کر جانے لگتا ہے)
(کمل کانت اپنے باپ کو چھوڑ کر بھاگا آتا ہے۔)

Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

کمل کانت : ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر : میرا ہاتھ چھوڑ دو۔

کمل کانت : ڈاکٹر صاحب انہیں دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔HE IS COLLAPSING

ڈاکٹر : تو میں کیا کروں؟

کمل کانت : FOR GOD'S SAKE HAVE MERCY UPON HIMانہیں بچا لیجئے۔

ڈاکٹر : میں کرسٹان ہوں۔ میرے ہاتھ لگانے سے اس کا دھرم بھرشت ہو جائے گا۔ مجھے جانے دو۔

کمل کانت : واپس چلیے ڈاکٹر صاحب۔ اسے بچا لیجئے۔ وہ بڈھا آدمی ہے۔ پرانے خیالوں میں گھرا ہوا۔ مگر وہ میرا باپ ہے۔ میں اپنی جان دے کر بھی اس کی جان تم سے مانگ سکتا ہوں اسے معاف کرو ڈاکٹر۔ واپس چلو ڈاکٹر۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ (ڈاکٹر لڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ لڑکی اسے خاموش نگاہوں سے واپس جانے کا اشارہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر واپس آتا ہے۔ تخت کے آس پاس کے سب لوگ پرے ہٹ جاتے ہیں۔ پنڈت رام دیال کو اوندھے دیکھ کر رام دیال اسے سیدھا کرتا ہے جلدی سے معائنہ کرتا ہے۔ بیگ کھول کر انجکشن دیتا ہے۔ لڑکی اس کی مدد کرتی ہے۔ انجکشن دے کر وہ سب لوگوں کو اشارے سے پرے ہٹ جانے کے لیے کہتا ہے۔

پنڈت رام دیال بالکل بے حس و حرکت لیٹا ہے۔ ڈاکٹر اپنی گھڑی کی جانب دیکھ رہا ہے۔ آہستہ سے رام دیال کے جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ آہستہ سے وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ آہستہ سے وہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)۔

ڈاکٹر : اٹھیے مت لیٹے رہیے۔

رام دیال : نہیں مجھے بیٹھنے دو۔

کمل : ڈاکٹر صاحب نے آپ کی جان بچائی ہے۔ پتا جی۔

(پنڈت رام دیال چپ رہتا ہے۔)

مرزا جی : آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا آپ اپنے محسن کا شکریہ ادا نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر : اسے قدرت کا ایک معجزہ کہنا چاہیے۔ ایک منٹ پہلے میں نے دیکھا آپ کی نبض بند تھی۔ دل بند تھا۔ سانس کا عمل بند تھا۔ جسم ہر اعتبار سے مردہ تھا۔

رام دیال : مگر میں مرا نہیں تھا ڈاکٹر...... مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک بہت لمبے سفر پر جا رہا ہوں اور راستے میں مجھے اپنی بلڈنگ کی آتما ملی۔

ڈاکٹر : بلڈنگ کی آتما؟

رام دیال : ہاں ڈاکٹر بلڈنگ کی آتما! ہر بلڈنگ کی آتما ہوتی ہے۔ جیسے ہر انسان ہر قوم اور ہر دیش کی ایک آتما ہوتی

He is collapsing: وہ مر رہا ہے

for God's sake: خدا کے واسطے

have mercy upon him: اس پر رحم کرو

معائنہ: جانچ

بے حس و حرکت لیٹا: بے ہلے ڈُلے

Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

ہے۔اسی طرح ہر بلڈنگ کی بھی ایک آتما ہوتی ہے اور یہ آتما مجھے راستے میں ملی۔ میں نے اس سے کہا آؤ اکٹھے چلیں۔ ہمارا تمہارا راستہ ایک ہے۔ وہ بولی اس راستے پر چل کر نہ تم کبھی منزل کو پہنچ سکو گے نہ میں۔ کیونکہ یہ راستہ پرانا ہوگیا ہے۔اب یہ راستہ کہیں نہیں جاتا ہے۔ میں نے پوچھا تو آگے جانے کی ترکیب کیا ہے۔وہ بولی آگے وہی لوگ جاتے ہیں جو اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔

اس لیے میں واپس آ گیا (کمر بند سے چابیوں کا گچھا دیتا ہے) تم یہ چابیاں لے لو کمل اور میرے گھر کے سارے دروازے کھول دو۔اس بلڈنگ کا نقشہ ایک بنگالی انجینئر نے بنایا ہے۔ راجستھانی مزدوروں نے اس میں اینٹیں لگائی ہیں۔ ملیالیوں نے اس کو رنگ و روغن دیا ہے۔ پنجابی بڑھئی نے اس کے دروازے اور کھڑکیاں بنائی ہیں۔عبدالستار نے اس میں موزیک کا فرش بچھایا ہے۔ڈیسوزا اس میں بجلی لائے گا۔اور ڈیوڈ ابراہام پانی کے نل لگائے گا اور رستم پہلواں سینٹری فٹنگز کرے گا۔ یہ گھر جسے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی یہودی نے مل کر بنایا ہے۔اگر وہ سب مل کر اس گھر میں نہیں رہیں گے تو گھر کیسے آباد ہوگا۔اس لیے میں واپس آ گیا ہوں اور تمہیں یہ چابیاں دیتا ہوں، کمل! اب اس گھر کے سارے دروازے کھول دو اور اس کے سارے بیٹوں کو بلالو۔ کریم اللہ سائنس داں کو اور آفتاب رائے کو اور رنگا چاری کو ایڈ ورڈ کو کیلو کو اور سردار گوروو دیال سنگھ کو۔اور جس کسی نے ایک اینٹ بھی اس گھر کو دی ہے یہ گھر اس کا ہے۔اور جو کوئی اس کی دیواروں سے لگ کے رویا ہے یہ گھر اس کا ہے اور جس کسی نے اس کے صحن میں کھڑے ہو کر انسان اور اس کی امید اور اس کی حسرت اور اس کے دکھ اور اس کی مسرت اور مستقبل سے پیار کیا ہے یہ گھر اس کا ہے۔اب یہ گھر اکیلے پنڈت رام دیال کا نہیں، یہ گھر تم سب کا ہے۔(آہستہ آہستہ گھر کے تمام افراد گھر بنانے والے اور گھر پر کام کرنے والے اور گھر میں آنے والے تمام لوگ پنڈت رام دیال کے پیچھے جمع ہو جاتے ہیں۔سب کے چہرے خوشیوں سے دمک رہے ہیں اور پس منظر موسیقی میں یکجہتی، پیار، احساسات اور اخوت کا ایک خوش آیند کورس بلند ہوتا ہے اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)۔

6.2 متن کی تشریح

مصنف نے اس ڈرامے میں ہندوستانی سماج میں پھیلے ہوئے زہر، مذہبی تعصب پر ایک کڑی چوٹ لگائی ہے۔ کہانی تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ جو شخص مذہبی تعصب کا شکار تھا اس کا دل، یکجہتی پیار اور اخوت کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ یہی اس ڈرامے کا پلاٹ ہے۔اچھے پلاٹ کی ایک خوبی یہ مانی جاتی ہے کہ اس پر سچائی کا گمان ہونے لگتا ہے۔اس ڈرامے کی کہانی اتنی مؤثر ہے کہ ہمارے دل ودماغ پر بڑی دیر تک اس کا اثر رہتا ہے۔

Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

ڈرامے کے کردار ڈرامے کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ مصنف نے اس آخری منظر میں ڈرامے کے تمام کرداروں کو یکجا کر دیا ہے اور یہ کام اس نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ مصنف کہانی کے ذریعے جو تاثر قائم کرنا چاہتا ہے اس میں ان تمام کرداروں نے اہم رول ادا کیا ہے۔

اس کے مکالمے ڈرامے کی جان ہیں۔ ڈراما نگار نے مکالموں کے ذریعے وہ تمام باتیں کہہ ڈالی ہیں جو خود کہنا چاہتا ہے۔ مکالموں کی زبان بھی ماحول، حالات اور کرداروں کے عین مطابق ہے۔ اسی لیے ان کی زبان بہت جان دار، صاف اور رواں ہے۔ مصنف جو بات کہنا چاہتا ہے ان کو واضح کرنے میں مکالموں کی زبان بڑی مددگار ثابت ہوئی ہے۔

بات چیت میں کئی بار فلیٹ (FLAT) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ زمین کے ایک ٹکڑے پر کئی منزلہ (عام طور پر دو یا تین کمروں کے) مکانات بنوائے جاتے ہیں اسے فلیٹ کہتے ہیں۔ زمین کی قیمتیں چونکہ بہت زیادہ ہوگئی ہیں اور زمینیں بہ آسانی دستیاب بھی نہیں۔ اس لیے یہ طریقۂ رہائش آج کل بہت زیادہ رائج ہے۔

''بلّو'' ازابیلا کی ''عرفیت'' ہے۔ پیار میں اکثر نام کو مختصر کر کے پکارتے ہیں۔ اسے ''عرفیت'' کہتے ہیں۔

''YOU WICKED OLD MAN'' کے جملے کا مطلب ہے ''بوڑھے شیطان'' یہ جملہ رام دیال کے لیے استعمال ہوا ہے۔

It is a very nice Flat

Two big bed rooms

Two big bath rooms and a very big hall and

a big kitchen and a big pantry oh! it is lovely.

ان جملوں کا مطلب ہے:

''بہت اچھا فلیٹ ہے۔ اس میں دو بڑے بڑے سونے کے کمرے ہیں، دو بڑے بڑے غسل خانے ہیں ایک بہت بڑا ہال ہے باورچی خانہ بھی بڑا ہے اور نعمت خانہ بھی خاصا بڑا ہے۔ واقعی بہت ہی اچھا فلیٹ ہے۔''

''میرا تو دھرم بھرشٹ ہوگیا۔''

یہ جملہ سراسر تعصب پر مبنی ہے۔ پرانے خیالات کا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ کسی مسلمان یا عیسائی کو فلیٹ میں جگہ دینے سے اسکا مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔ حالاں کہ کسی مذہب نے اس طرح کی تفریق کی تعلیم نہیں دی ہے۔ انسان کے سوچنے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔

Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

''He is collapsing'' کا مطلب ہے کہ وہ قریب المرگ ہے اگر علاج نہ کیا گیا تو وہ مرجائے گا۔

For God's sake, have mercy upon him.

کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے واسطے ان پر رحم کیجیے۔

ڈاکٹر کا یہ کہنا کہ میں عیسائی ہوں میرے ہاتھ لگانے سے اس کا دھرم بھرشت ہوجائے گا۔ایک خوب صورت طنز ہے۔حالانکہ ڈاکٹر اس طرح کے خیالات کا آدمی نہیں ہے۔لیکن چونکہ رام دیال نے اس قسم کی باتیں کی تھیں اس لیے اس نے اسی کے الفاظ دوہرا دیئے ہیں۔کمل کانت ایک سمجھ دار اور روشن خیال لڑکا ہے۔وہ ڈاکٹر کو اپنے باپ کے علاج کے لیے راضی کر لیتا ہے۔ڈاکٹر کے علاج کے بعد رام دیال کے بے جان جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

6.3 زبان کے بارے میں

مصنف نے جگہ جگہ اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ اور فقروں کا استعمال کیا ہے۔آج کل عام بول چال میں بہت سے انگریزی الفاظ کا چلن ہوگیا ہے۔جیسے عمارت کے لیے بلڈنگ، دل کے ڈاکٹر کے لیے ''Heart Specialist'' قلم کے لیے ''پن'' اور گیند کے لیے بال وغیرہ۔

انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر ایڈورڈ اور ازابیلا دونوں عیسائی ہیں۔اس مناسبت سے انگریزی زبان کا استعمال ڈرامے کی خوب صورتی کو بڑھا رہا ہے۔

متن پر سوالات 6.1

درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

1. رام دیال ڈاکٹر کو فلیٹ دینے کے لیے کیوں تیار نہیں تھا؟

(i) ڈاکٹر غریب تھا۔

(ii) ڈاکٹر عیسائی تھا۔

(iii) وہ جھگڑالو تھا۔

(iv) وہ انگریزی بولتا تھا۔

Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

2. بلّو؟ بلّو؟ کون بلّو؟..... بلّو تو بملا ہو سکتی ہے۔ بلّو بلونت کور ہو سکتی ہے اور بلّو بتول ہو سکتی ہے۔ مندرجہ بالا جملہ کس نے کہا ہے؟

(الف) رام دیال

(ب) کمل کانت

(ج) مرزا ارشاد حسین

(د) رام بھروسے

3. اس ادھورے جملے کو نیچے دی ہوئی باتوں سے مکمل کیجئے۔

میں کرستان ہوں اور.................

(الف) یہ ہندو ہے یہ اس بلڈنگ کا مالک ہے۔

(ب) میرا ہاتھ لگانے سے اس کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔

(ج) یہ میری بیٹی از بیلا کو ئیلو ہے۔

(د) تم میری بیٹی سے شادی کیسے کروگے۔

6.4 متن کی تشریح

ڈرامے کا آخری حصہ قومی یکجہتی کی بڑی بھرپور اور جاندار عکاسی کرتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے ''جیسے ہر انسان، ہر قوم اور ہر دیش کی ایک آتما ہوتی ہے، اسی طرح ہر بلڈنگ کی بھی ایک آتما ہوتی ہے۔ اور یہ آتما مجھے راستے میں ملی۔ اس نے مجھ سے کہا'' بلڈنگ کی تجسیم کی ہے۔ یعنی بلڈنگ کو جسم دے دیا ہے اور اس سے کچھ باتیں کہلوائی ہیں۔

مصنف بلڈنگ کو ایک نمونہ بنا کر دراصل ہندوستانیوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ جب تک ہمارے ملک کے لوگوں میں اتحاد، میل جول، اخوت و محبت اور ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ نہیں ہوگا۔ اس وقت تک ہم ترقی کے راستوں پر آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

اس کے بعد بلڈنگ کو بنانے والوں میں مختلف مذہب کے لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ یہ کہہ کر مصنف نے ہندوستان کی مشترک تہذیب، کثرت میں وحدت اور مختلف مذاہب کی رنگارنگی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ اگر ان میں آپس میں ایک دوسرے کے مذہب کے لیے رواداری اور عزت کا جذبہ نہیں

Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

ہوگا تو یہ ملک ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔ اس لیے ہم کو آپسی رنجشوں کو بھلا کر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے۔

6.5 زبان کے بارے میں

جو عمل عادت وفطرت کے خلاف واقع ہوا ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ چوں کہ رام دیال بے حس وحرکت ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس کا دوبارہ حرکت کرنا ایک خلاف فطرت بات تھی۔ اس لیے اسے معجزہ کہا ہے۔

رام دیال کہتا ہے کہ وہ مرا نہیں بلکہ ایک لمبے سفر پر گیا تھا اور راستے میں اسے اس کی اپنی بلڈنگ کی آتما ملی۔ مصنف نے بلڈنگ کی آتما کا ذکر کر کے بڑی خوب صورتی سے اپنا مدّعا بیان کیا ہے۔ حالانکہ بلڈنگ ایک بے جان چیز ہے اور بے جان چیزوں کی روح نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کے بولنے اور سمجھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن مصنف خاص تاثر پیدا کرنے کے لیے بے جان چیزوں کے منہ میں زبان دے دیتا ہے۔ یہاں بھی بلڈنگ کہ منہ میں زبان دے دی گئی ہے اور وہ تمام باتیں کہلوائی گئی ہیں جو مصنف خود کہنا چاہتا ہے۔

متن پر سوالات 6.2

1. خالی جگہوں کو دیئے گئے الفاظ سے بھریئے۔

(i) ہر بلڈنگ کی........... ہوتی ہے۔

(الف) آتما (ب) پرماتما (ج) جان

(ii) آگے وہی لوگ جاتے ہیں جو اپنے........... کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔

(الف) دل (ب) گھر (ج) بلڈنگ

(iii) یہ گھر اکیلے........... کا نہیں ہے۔

(الف) رام دیال (ب) رام بھروسے (ج) کمل کانت

2. رام دیال نے کمل کانت کو چابیاں کیوں دیں؟

(الف) سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے کے لیے۔

(ب) سارے دروازے اور کھڑکیاں کھول دینے کے لیے۔

(ج) چابیوں کو حفاظت سے رکھنے کے لیے۔

Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

آپ نے کیا سیکھا

- کرشن چندر اردو کے مشہور ومعروف افسانہ نگار ہیں۔
- ان کے اس ڈرامے ''دروازے کھول دو'' کا مرکزی خیال قومی یکجہتی ہے۔
- یہ ڈراما تعصب وتنگ نظری کے اوپر ایک گہری چوٹ ہے۔
- تعصب وتنگ نظری ملک کی ترقی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔

6.6 اسلوب بیان

کرشن چندر کا انداز بیان نہایت خوب صورت، دلکش اور شاعرانہ ہے۔ ان کی تحریروں میں ان کے فکر، مشاہدے اور تخیل کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ ان کا مشاہدہ کافی وسیع اور گہرا ہے۔

6.7 مزید مطالعہ

آپ نے ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' کا آخری حصہ پڑھا ہے۔ اس پورے ڈرامے کو پڑھیے۔

6.11 اختتامی سوالات

1. ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟
2. رام دیال اپنی ذات برادری کے باہر لوگوں کو فلیٹ دینے سے کیوں منع کرتا تھا۔
3. اس ڈرامے کے کرداروں میں سے کون سا کردار آپ کو پسند ہے اور کیوں؟
4. کرشن چندر کے اسلوب بیان پر روشنی ڈالیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

6.1

1. ڈاکٹر عیسائی تھا۔

Print\nOTE\NOTE1.tif not found.

2. رام دیال۔

3. میرے ہاتھ لگانے سے اس کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔

6.2

1. (i) آتما (ii) دل (iii) رام دیال

2. سارے دروازے اور کھڑکیاں کھول دینے کے لیے۔

نوٹ

7

خواجہ حسن نظامی

مصنف کا تعارف

خواجہ حسن نظامی کا نام علی حسن ہے۔ان کے اجداد کا تعلق حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان سے بہت قریبی تھا۔ وہ دہلی میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں حاصل کی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں یتیم ہوگئے۔اس لیے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔گذر اوقات کے لیے دہلی کی گلیوں میں کتابوں کی گٹھری لاد کر آوازیں دے دے کر بیچنے لگے۔ وہ بیحد ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے انسان تھے۔اس لیے اس غریبی میں بھی اپنی ترقی کی راہ نکال لی۔ جب پھیری لگاتے لگاتے تھک جاتے تو ستانے کے لیے بیٹھ جاتے اور گٹھری کھول کر کوئی نہ کوئی کتاب نکال لیتے اور مطالعہ میں کھو جاتے۔ اس طرح آپ نے نہ صرف اپنی تعلیمی کمی پوری کرلی بلکہ خود اردو کے بہت بڑے ادیب بن گئے۔ساری زندگی دہلی ہی میں گزری۔فقیر منش آدمی تھے۔اس لیے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر آپ کے لاکھوں مرید تھے۔ ۱۹۵۵ء میں دہلی میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ نظام الدین اولیاء میں دفن کیے گئے۔

آپ کی تحریر میں بے حد بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ ہر بات نہایت دلچسپ اور دلکش انداز میں کہتے ہیں۔عبارت اتنی آسان ہوتی ہے کہ معمولی سے معمولی پڑھا لکھا بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔معمولی سے معمولی لفظ میں طرح طرح کے معنی پیدا کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔فطرت کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ایک جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔اسی وجہ سے آپ کو مصوّرِ فطرت کہا جاتا ہے۔ یہ خصوصیات آپ کو اس مضمون میں بھی ملیں گی جو آپ کے نصاب میں شامل ہے۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

1. مشکل الفاظ کے معنی سمجھ کر اپنی گفتگو میں استعمال کرسکیں گے؛

NOS\NOTE1.tif not found.

2. مختلف محاوروں کے معنی سمجھ کر اپنی تحریر و گفتگو میں استعمال کر سکیں گے؛

3. ''اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔'' اس کہاوت کو سمجھ کر اسے مشعل راہ بنا سکیں گے؛

4. تمثیل کسے کہتے ہیں۔ یہ سمجھ سکیں گے؛

5. خواجہ حسن نظامی کے اسلوب بیان اور زندگی کے حالات کو بیان کر سکیں گے۔

7.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق بڑھ لیں۔

مِس چڑیا کی کہانی

ایک چڑے چڑیا نے نئی روشنی کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ اس کوٹھی میں ایک مسلمان رہتے تھے۔ جو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے اور ایک میم کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کی بیرسٹری کچھ چلتی نہ تھی۔ مگر گھر کے زمیندار تھے گزارہ خوبی سے ہو جاتا تھا۔ ولایت سے آنے کے بعد خدا نے ان کو ایک لڑکی بھی عنایت کی تھی جو ماشاءاللہ چلتی پھرتی تھی اور باپ کی طرف سے مسلمان اور ماں کی طرف سے مِس بابا تھی۔

نئی روشنی: مغربی تہذیب

چڑے چڑیا نے کھپریل کے اندر ایک سوراخ میں گھر بنایا۔ تنکوں اور سوت کا فرش بچھایا۔ یہ سوت پڑوس کی ایک بڑھیا کے گھر سے چڑیا لائی تھی۔ وہ بچاری چرخہ کاتا کرتی تھی۔ الجھا ہوا سوت پھینک دیتی تو چڑیا لاتی اور اپنے گھر میں اسے بچھا دیتی۔

خدا کی قدرت ایک دن انڈا پھسل کر گر پڑا اور وہ ٹوٹ گیا۔ ایک ہی باقی رہا۔ بچاری چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا۔ جس دن انڈا گرا ہے تو چڑیا گھونسلے میں تھی۔ چڑا باہر دانہ چگنے گیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو چڑیا کو چپ چپ اور مغموم دیکھ کر سمجھا میرے دیر میں آنے کے سبب خفا ہو گئی۔

مغموم: اداس

لگا پھدک پھدک کر ''چوں چوں چیں، چڑ چوں چیں، چڑ چوں چیں، چڑ چوں چڑ چوں'' کرنے۔ کبھی چونچ مار کر گدگدی کرتا کبھی خود اپنے پروں کو پھلاتا، ناچتا اور مٹکتا مگر چڑیا اسی طرح پھولی بھری خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے مردذات کی خوشامد کا کچھ بھی جواب نہ دیا۔ چڑا سمجھا بہت ہی خفگی ہے، مزاج حد سے زیادہ بگڑ گیا۔ خوشامد سے کام نہ چلے گا۔ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر خوشامد درآمد کی، بیگم صاحبہ نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ خیال کر کے چڑا بھی منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور چڑیا سے بے رُخ ہو کر بیرسٹر صاحب کو جھانکنے لگا جو اپنی لیڈی کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ چڑے نے خیال کیا یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں! یہ دونوں خوش وبشاش زندگی کاٹ رہے ہیں۔ ایک میں بدنصیب ہوں سویرے کا گیا دانہ چگ کر اب گھر میں گھسا

پھولی بھری: ناراض

خوش وبشاش: ہنسی خوشی

نوٹ

ہوں۔ مگر چڑیا صاحبہ کا مزاج ٹھکانے نہیں ہے۔ کاش میں چڑا نہ ہوتا کم سے کم آدمی بنایا جاتا۔

چڑا اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ چڑیا نے غمناک آواز نکالی ''چوں''۔ چڑے نے جلدی سے مڑ کر چڑیا کو دیکھا اور کہا ''چوں چوں چڑ چوں۔ کیا ہے آج تم کو ایسی چپ کیوں ہے؟'' چڑیا بولی ''انڈا گر کر ٹوٹ گیا۔''

انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو ذرا سا رنج ہوا۔ مگر اس نے صدمہ کو دبا کر کہا، تم کہاں چلی گئی تھیں، انڈا کیوں گر پڑا؟ چڑیا نے کہا ''میں اڑ کر ذرا چمن کی ہوا کھانے چلی گئی تھی، جھپٹے سے انڈا اپھسل گیا۔'' یہ سن کر چڑا آپے سے باہر ہو گیا، اس کے مردانہ جوش میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کڑک دار گرجتی ہوئی چوں چوں میں کہا ''پھوہڑ'' بدسلیقہ تو کیوں اڑی تھی؟ تجھ کو چمن کی ہوا کے بغیر کیا ہوا جاتا تھا۔ کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے۔ جو گھر کا کام چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے۔ تو ایک چڑیا ہے، تیرا کوئی حق نہیں ہے۔ آج کل تو انڈوں کی نوکر تھی۔ تجھے یہاں سے ہٹنے کا اختیار نہ تھا تو نے میرے ایک انڈے کا نقصان کر کے اتنا برا قصور کیا ہے کہ اس کا بدلہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو نے میرے بچے کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔ میں نے پہلے دن منع کر دیا تھا کہ اری کمبخت اس کوٹھی میں گھونسلا نہیں بنا۔ ایسا نہ ہو ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے۔ ہم بچارے پرانے زمانے کے دیسی چڑے ہیں، خدا ہم کو نئے زمانے کے چڑے چڑیا سے بچائے رکھے۔ کیوں کہ پھر گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ مگر تو نہ مانی اور کوٹھی میں رہوں گی! کوٹھی میں گھر بناؤں گی!! کہہ کر ناک میں دم کر دیا۔ اب لا میرا بچہ۔ میں تجھ سے لوں گا، نہیں تو مارے ٹھونگوں کے کچلا بنا دوں گا۔ بڑی صاحب نکلی تھیں ہوا کھانے۔ اب بتاؤں تجھ کو ہوا کھانے کا مزہ؟''

ادھیڑ بن: الجھن

خصلت: عادت

ہوا خوری کرنا: گھومنا پھرنا

چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چپ چاپ چڑے کی باتیں سنتی رہی لیکن جب چڑا حد سے بڑھا تو اس نے زبان کھولی اور کہا ''بس بس سن لیا، بگڑ چکے۔ زبان کو روکو، انڈے بچے پالنے کا مجھ ہی پر ٹھیکہ نہیں ہے۔ تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے گئے تھے یہ وقت آ گیا ہے۔ خبر نہیں اپنی کس سگی کے ساتھ گلچھرے اڑاتے پھرتے ہوگے۔ دوپہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں اور آئے تو مزاج دکھاتے آئے، انڈا گر پڑا۔ مگر میرے پنجے کی نوک سے، میں کیا کروں؟ میں انڈے کی خاطر اپنی جوان جان کو گھن لگا دوں؟ دو گھڑی باہر کی ہوا بھی نہ کھاؤں؟ صبح سے یہ وقت آیا۔ ایک دانہ حلق سے نیچے نہیں اترا۔ تم نے پھوٹے منہ سے یہ نہ پوچھا کہ تو نے کچھ نگلا یا مزاج ہی کھانا آتا ہے؟ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ ہو۔ اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو، آدھا میں کروں۔ دیکھتے نہیں میم صاحب کو سارا کام نہیں کرنا پڑتا ہے اور بچہ کو آیا کھلاتی ہے۔ تم نے ایک آیا رکھی ہوتی۔ تمہارے انڈوں بچوں کی آیا نہیں ہوں۔''

گل چھرّے اڑانا: موج مستی کرنا

میم: میڈم کا مخفف

آیا: بچے کھلانے والی عورت

چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سن ہو گیا اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔ بیچارہ غصہ کو پی کر خوشامد کرنے لگا اور اس دن سے چڑیا کے ساتھ آدھی خدمت انڈے بچوں کی اس نے اپنے ذمہ لی۔

ایک انڈا ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے انڈے سے ایک بچہ نکلا جو مادہ یعنی چڑیا تھی۔ جب یہ بچہ ذرا بڑا ہوا اور اس نے صاحب کے

NOS\NOTE1.tif not found.

بچہ کو دیکھا کہ وہ کاٹھ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے، ٹب میں بیٹھ کر نہاتا ہے نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنتا ہے تو اس چڑیا زادی نے باپ سے کہا۔

چیں چیں چیں۔ ابا مجھ کو گھوڑا منگادو، ابا میں بھی ٹب میں نہاؤں گی۔ ابا مجھ کو بھی ایسے رنگ برنگ کے کپڑے لادو۔ چڑے نے چڑیا سے کہا ''لےسن۔ دیکھا مزا کوٹھی میں گھر بنانے کا؟ اب لا اپنی لاڈلی کے واسطے گھوڑا، ٹب منگا، کپڑے بنا۔'' چڑیا نے کہا'' دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں، ایک کی تو تمہاری اس کل کل سے جان گئی، یہ نگوڑی بچی ہے تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے؟ بچہ ہے کہنے دو۔ یہ کیا جانے ہم غریب ہیں اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے۔ بڑی ہو گی تو آپ سمجھ لے گی کہ چڑیوں کو آدمی کی ریس سے کیا سروکار؟'' مس چڑیا نے ماں کی بات سن کر کہا۔''واہ بی اماں واہ! تم غریب تھیں، تم چڑیا تھیں تو امیر کی کوٹھی میں آکر کیوں رہی تھیں۔ گاؤں کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔ میں ہرگز نہ مانوں گی اور میم صاحبہ کے بچے کی سی سب چیزیں منگوا کر رہوں گی۔ نہ لاؤ گے تو لو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں، زندہ نہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہو گا۔''

ریس: نقل، مقابلہ

چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا۔'' ہے ہے! ایسا غضب نہ کیجیو، ہم سب کچھ منگا دیں گے۔'' یہ کہہ کر اور مس چڑیا کو دلاسا دے کر دونوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ روتے تھے اور یہ کہتے تھے۔''ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔ یہ بیرسٹر صاحب اچھے سہی مگر ان کی صحبت سے تو ہمارا ستیاناس ہو گیا۔ ہائے ہماری لاڈلی ہاتھوں سے نکل گئی یہاں تو اور کوئی چڑیا بھی نہیں جو ہمارے دکھ میں شریک ہو۔'' چڑے چڑیا روتے تھے اور مس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی کہ نئے زمانے کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔

دلاسا دینا: تسلی دینا

بیرسٹر: وکیل

7.2 متن کی تشریح

ایک چڑیا چڑے نے ۔۔۔۔۔ بچّوں کی آیا نہیں ہوں

خواجہ حسن نظامی نے اپنے اس انشائیے میں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر طنز کیا ہے۔ مصنف نے اس سبق میں انسانوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو چڑیا چڑے کی زبانی کہلوایا ہے۔ اسے تمثیل کہتے ہیں۔

آپ نے پڑھا، چڑیا چڑے نے ''نئی روشنی'' کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلہ بنایا تھا۔ یہاں نئی روشنی سے مصنف کی مراد انگریزی تہذیب سے ہے۔ کیونکہ اس کوٹھی میں اک مسلمان بیرسٹر اور اس کی عیسائی بیوی اور بیٹی رہتے تھے۔ وہ اپنی بچی کو مس بابا کہتے تھے۔ انگریزی میں ''مس'' بغیر شادی شدہ لڑکی کو کہتے ہیں۔ اور ''بابا'' ہر چھوٹے بچے کو خواہ وہ لڑکی ہو یا لڑکا ہو بابا کہتے ہیں۔

آپ نے پڑھا۔'' اس نے مردذات کی خوشامد کا کچھ جواب نہ دیا۔ مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر خوشامد درآمد کے بعد بھی بیگم صاحبہ نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔'' ان جملوں میں مصنف نے مردوں کی اس غلط فہمی اور حاکمانہ ذہنیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ عورتوں سے برتر ہیں۔ مصنف کہتا ہے جب چڑے نے دیر سے گھر آنے پر چڑیا کی خفگی کو محسوس کر لیا تھا اور

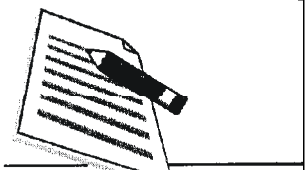

نوٹ

اس کی خوشامد کرلی تھی تو چڑیا کو مان جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ نہ مانی۔ اس لیے چڑے کو بڑی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اور اب وہ چڑیا سے ناراض ہوگیا۔

اس طرح جب چڑیا انڈے کے گرجانے اور ٹوٹ جانے کی خبر دیتی ہے۔ تو چڑا غصہ کے مارے دیوانہ ہوجاتا ہے اور چڑیا کو ہزاروں باتیں سناڈالتا ہے۔ مثلاً۔ پھوہڑ۔ بدسلیقہ۔ تو کیوں اڑی تھی۔ آج کل تو انڈوں کی نوکر تھی اب لا میرا بچہ میں تجھ سے لوں گا ورنہ مارے ٹھونگوں کے بچلا بنادوں گا۔ کیا یہاں آپ کو چڑے کی شکل میں ایک مرد بولتا ہوا دکھائی نہیں دیتا؟ آپ نے ٹھیک کہا۔ ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ مرد اپنے آپ کو حاکم اور عورت کو محکوم سمجھتے ہیں۔ اور اسے ایک نوکر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اور اگر عورت کبھی اپنی مرضی یا اپنی خواہش کے مطابق کوئی کام کرنے لگے تو اسے طعنے تشنے اور مارنے پیٹنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جیسا کہ چڑا کہہ رہا تھا۔ ''چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چپ چاپ چڑے کی باتیں سنتی رہی۔ لیکن جب چڑا حد سے بڑھا تو اس نے زبان کھولی۔'' اس جملے کے ذریعہ مصنف یہ بتانا چاہتا ہے۔ کہ نئی روشنی والی کوٹھی میں رہ کر اور اس عیسائی عورت کو دیکھ دیکھ کر اپنے حقوق سے خوب واقف ہوگئی تھی۔ اسی طرح آج کل کے زمانے میں عورتوں نے تعلیم حاصل کر کے اور کچھ مغربی تہذیب کی نقل کر کے اپنے حقوق کے لیے آوازیں اٹھانا شروع کردی ہیں۔ وہ بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں جو چڑیا نے کہیں۔ مثلاً۔ انڈے بچے پالنے کا مجھ ہی پر ٹھیکہ نہیں ہے۔ تم بھی برابر کے شریک ہو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ ہو۔ اب آزادی اور برابری کا حق ہے۔ آدھا کام تم کرو آدھا کام میں کروں۔ میں تمہارے انڈوں بچوں کی آیا نہیں ہوں۔'' آپ نے غور کیا؟ مصنف نے چڑیا کی زبان سے وہ مخصوص جملے کہلوائے ہیں جو عام طور پر گھروں میں لڑائی ہوجانے پر عورتیں کہتی ہیں۔

7.3 زبان کے بارے میں

''کاش'' حرف تمنا ہے۔

''ادھیڑ بن میں ہونا'' محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کسی الجھن میں گرفتار ہونا۔

''گھر کے رہے نہ گھاٹ کے'' کہاوت ہے۔ جس کے معنی ہیں دوسروں کی نقل کرنے کے چکر میں اپنی اصلی حالت کو بھی بھول جانا۔

سبق میں ایک جگہ آیا ہے کہ ''کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے۔ جو گھر کا کام کاج چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے۔'' اس جملے میں مصنف مغربی عورت کے طور طریقوں پر طنز کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتا ہے کہ مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب میں بہت فرق ہے۔ مشرقی عورت گھر کی چار دیواری میں رہ کر شوہر اور بچوں کی خدمت کرنا اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔ مگر مغرب میں ایسا نہیں ہے وہاں عورت اپنے آپ کو مردوں کے برابر سمجھتی ہے اور مردوں سے گھر کے کاموں میں برابر کی حصہ داری کا مطالبہ کرتی ہے۔

''آپے سے باہر ہوجانا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں غصہ پر قابو نہ رکھ پانا۔''

''اس کے مردانہ جوش میں طوفان کھڑا ہو گیا۔'' کا مطلب ہے کہ چڑیا کے باہر نکلنے پر چڑے کو بہت غصہ آیا۔ کیوں کہ وہ تو اسے آج کل انڈوں کا نوکر سمجھے ہوئے تھا۔ اس کے خیال میں چڑے کے حکم کے بغیر اسے کہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس لیے اس نے چڑیا کو خوب ڈانٹا۔ اکثر مرد بھی اپنی برتری جمانے کے لیے عورتوں کے اوپر پابندی لگایا کرتے ہیں۔ اور عورتوں کے پابندی نہ کرنے پر اسی طرح ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔

چڑیا نے کہا ''خبر نہیں اپنی کس سگی کے ساتھ گلچھرے اڑاتے پھرتے ہوگے۔'' یعنی کسی دوسری چڑیا کے ساتھ گھومتے ہوگے۔ جب عورتیں اپنے شوہر کو بہت سخت بات کہنا چاہتی ہیں تو اس طرح کا طعنہ دیتی ہیں۔

آپ نے پڑھا۔ ''اب آزادی اور برابری کا حق ہے۔'' آج کل کی پڑھی لکھی عورتوں کا یہ محبوب نعرہ ہے۔ اس کے ذریعہ مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ پڑھی لکھی عورتیں اب گھروں میں بند ہو کر نہیں بیٹھنا چاہتی بلکہ باہر نکل کر مردوں کی طرح کام کرنا اور انہیں کی طرح آزاد رہنا چاہتی ہیں۔

''میرے پنجے کی نوک'' مصنف نے چڑیا کی مناسبت سے عورتوں کے خاص محاورے ''میری جوتی کی نوک پر'' کی جگہ استعمال کیا ہے۔

متن پر سوالات 7.1

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے۔

1. نئی روشنی سے مصنف کی کیا مراد ہے۔
   (i) مغربی تہذیب
   (ii) نیا گھر
   (iii) مس بابا

2. اس کے مردانہ جوش میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا سے کیا مراد ہے۔
   (i) چڑیا کی من مانی پر چڑے کو غصہ آ گیا۔
   (ii) احساس برتری سے چڑا غصہ میں بھر گیا۔
   (iii) چڑا غصہ کے مارے دیوانہ ہو گیا۔

3. ''گھر کے رہے نہ گھاٹ کے'' کیا ہے؟
   (i) محاورہ ہے۔
   (ii) روزمرہ ہے۔
   (iii) کہاوت ہے۔

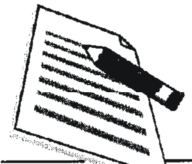

نوٹ

7.6 متن کی تشریح

چڑیا کی اس تقریر سے۔۔۔۔۔اولاد اپنی ہی ہوتی ہے

آپ نے پڑھا کہ دوسرے انڈے میں سے جو بچہ نکلا وہ چڑیا تھی۔اس نے نئے زمانے میں آنکھیں کھولی تھیں اور بیرسٹر صاحب یعنی وکیل صاحب کی مس بابا کے ناز نخرے وہ بھی ویسی ہی نیا اور وہی چیزیں استعمال کرنا چاہتی تھی۔لہٰذا اس نے کپڑوں اور نہانے کے ٹب وغیرہ کی فرمائش کرنا شروع کر دی۔ یہاں مصنف نے بچے کی اسی نفسیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔کہ بچے میں اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی نقل کرنے لگتے ہیں۔انہیں اچھے اور برے میں فرق بتانا، اچھی باتوں کی نقل کرنے اور انہیں اپنانے میں مدد کرنا ماں باپ کی ذمے داری ہے۔

چڑیا نے کہا: بڑی ہوگی تو آپ سمجھ لے گی کہ چڑیوں کو آدمی کی ریس سے کیا سروکار؟'' چڑیا کی زبان سے یہ بات کہلوا کر مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ غریب لوگ امیروں کی نقل کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے۔

آپ نے پڑھا کہ چھوٹی چڑیا نے اپنی ماں کے اوپر طنز کرتے ہوئے کہتی ہے ''تم غریب تھیں تو امیر کی کوٹھی میں گھونسلہ کیوں بنایا؟'' کسی غریب کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا'' یہ کہہ کر مصنف نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہر آدمی کو اپنے حالات کے مطابق ہی زندگی گزارنی چاہیے۔اپنے سے امیر اور خوشحال لوگوں کی نقل نہیں کرنا چاہیے۔کیوں کہ آمدنی اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان جیسے تو بن نہیں پاتے۔اور نقل کرنے کے چکر میں اپنے حالات بہتر بنانے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔اس لیے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔اور ہم نہ ادھر کے رہتے ہیں اور نہ ادھر کے۔

چھوٹی چڑیا کے منہ سے مرنے کی دھمکی سن کر چڑیا چڑے کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔اور وہ کہتے ہیں ''اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔'' یعنی اچھے لوگوں کے ساتھ رہنے سے کوشش کیے بغیر خود بخود ہمارے اندر اچھی باتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ بالکل یہی بات برے لوگوں کے ساتھ رہنے سے ہوتی ہے۔ چڑیا چڑے سوچتے ہیں کہ آج اگر ہم نے دوسری چڑیوں کے ساتھ مل کر گھونسلہ بنایا ہوتا تو ہماری بچی مس بابا کی نقل نہ کرتی۔ بلکہ اپنی ساتھی چڑیوں جیسی بننے کی کوشش کرتی۔

سبق کے آخر میں آپ نے پڑھا کہ ''چڑے اور چڑیا روتے تھے اور مس چڑیا قہقہے لگاتی تھی کہ نئے زمانے کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔''

اس جملے میں مصنف نے مغربی تہذیب پر تیکھا طنز کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب میں رشتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ان کے دل میں ماں باپ کے لیے ادب واحترام اور عزت ومحبت کے جذبات نہیں ہوتے۔انہیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ انہیں پالنے اور پرورش کرنے میں ماں باپ نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں، بلکہ وہ تو اسے ان کی اخلاقی

NOS\NOTE1.tif not found.

ذمہ داری سمجھتے ہیں۔اسی لیے مغربی تہذیب میں دن بدن اخلاقی گراوٹ آتی جارہی ہے۔

7.4 زبان کے بارے میں

مصنف نے چھوٹی چڑیا کے منہ سے ماں چڑیا کو نصیحت کرا کے والدین کو یہ سبق دیا ہے کہ بچے کو بڑا ہو کر کیسا انسان بننا ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری ماں باپ پر ہے۔ والدین کو معلوم ہونا چاہیے کہ بچے کی تربیت میں ماں باپ اور آس پاس کے ماحول کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے وہ بچوں کی جیسی تربیت اور پرورش کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے انہیں پہلے خود نمونہ بن کر دکھانا ہوگا۔ بچے کا ذہن تو سادے کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔ بچپن سے جو کچھ اسے سکھایا جاتا ہے اور جو کچھ وہ خود دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن کے سادے کاغذ پر نقش ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ نقوش بڑے گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ اس لیے ماں باپ کو اپنی ذمے داری کو پوری طرح سمجھنا چاہیے۔ اور دیانت داری کے ساتھ نبھانا چاہیے۔

متن پر سوالات 6.2

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے۔

1. تم غریب تھیں تو امیر کی کوٹھی میں گھونسلہ کیوں بنایا؟ گاؤں کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔
   مصنف چھوٹی چڑیا کے منہ سے یہ کہلوا کر بتانا چاہتا ہے کہ..................
   (i) والدین اپنی ذمہ داری کو سمجھیں
   (ii) چھوٹی چڑیا بہت سمجھ دار ہوگئی تھی
   (iii) چڑے نے چھوٹی چڑیا سے ماں کو طعنہ دلوایا تھا

2. ''اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے۔ بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے'' اس سے مصنف کی مراد ہے کہ......
   (i) جیسے لوگوں کے ساتھ رہیں گے ان کی عادتیں خود بخود ہمارے اندر پیدا ہو جائیں گی
   (ii) اچھے لوگ زبردستی اچھا آدمی بنانے کی کوشش کرتے ہیں
   (iii) برے لوگ ہمیشہ بری ہی باتیں بتاتے ہیں

3. چھوٹی چڑیا نے مرنے کی دھمکی دی، کیوں کہ
   (i) میر سٹر صاحب کی بچی کی چیزیں دیکھ کر وہی چیزیں حاصل کرنا چاہتی تھی
   (ii) مس بابا کو دیکھ دیکھ کر ضدی ہوگئی تھی
   (iii) مرنے کی دھمکی دے کر ماں باپ کو ڈرانا چاہتی تھی

7.5 اسلوب بیان

خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بے حد بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ ہر بات نہایت دلچسپ اور دلکش انداز میں کہتے ہیں۔ عبارت اتنی آسان ہوتی ہے کہ معمولی سے معمولی پڑھا لکھا بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ معمولی سے معمولی لفظ میں طرح طرح کے معنی پیدا کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ فطرت کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ایک جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی وجہ سے خواجہ حسن نظامی کو مصور فطرت کہا جاتا ہے۔ یہ خصوصیات آپ کو اس مضمون میں بھی ملیں گی جو آپ کے نصاب میں شامل ہے۔

آپ نے کیا سیکھا

- ......خواجہ حسن نظامی نے اس انشائیے میں گھروں میں انسانوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کو چڑیوں کی زبان سے ادا کرایا ہے۔ اسے تمثیل کرنا کہتے ہیں۔
- ......اس سبق کے ذریعے خواجہ حسن نظامی نے یہ نصیحت کی ہے کہ انسان پر صحبت کا بہت اثر ہوتا ہے۔ اچھے لوگوں کے ساتھ رہ کر انسان خود بخود نیک بن جاتا ہے۔ اور برے لوگوں کے ساتھ غیر ارادی طور پر برا بن جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں بُری صحبتوں سے بچنا چاہیے اور ہمیشہ اچھی صحت اختیار کرنی چاہیے۔
- ......بچوں کی تربیت میں والدین اور آس پاس کے ماحول کی بہت اہمیت ہے۔ بچہ بڑا ہو کر اچھا انسان بنے اس کا تمام تر دارومدار والدین کی اچھی تربیت پر ہے۔
- ......تعلیم حاصل کر کے ہماری عورتیں نئی نسوانی تحریکوں میں ان کی آزادی کے سلسلے میں بلند کیے جانے والے کھوکھلے نعروں سے متاثر ہو گئی ہیں اور اس کی نقل میں لگ گئی ہیں۔
- ......خواجہ حسن نظامی کا لقب ''مصور فطرت'' ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا انداز بیان دلکش، آسان، دلچسپ اور بے تکلف ہے۔ معمولی باتوں میں طرح طرح کے معنی پیدا کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔

7.10 اختتامی سوالات

1. ''نئی روشنی کی کوٹھی'' سے مصنف کی کیا مراد ہے؟
2. ''اب آزادی اور برابری کا حق ہے'' اس جملے کی روشنی میں عورتوں کے جائز حقوق پر ایک مضمون لکھیے۔
3. ''اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔'' کیا آپ اس قول سے اتفاق کرتے ہیں؟ دس جملوں میں اپنا جواب لکھیے۔

NOS\NOTE1.tif not found.

4. بچوں کو اچھا انسان بنانے کی ذمہ داری کس کی ہے؟

5. خواجہ حسن نظامی کے اسلوب بیان پر چند جملے لکھیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

7.1   1. (i)   2. (i)   3. (iii)

7.2   1. (i)   2. (i)   3. (iii)

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

8

کنہیالال کپور

مصنف کا تعارف

کنہیالال کپور ہمارے عہد کے بہت کامیاب طنز وظرافت نگار ہیں ان کی تصانیف کی تعداد کافی ہے۔اس کے باوجود ان کی تحریریں معیاری ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کا ادب کس طرح وجود میں آتا ہے۔

کنہیالال کپور 1910 میں لائل پور (موجودہ: فیصل آباد) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔لائل پور مغربی پنجاب کا ایک ضلع ہے،اور اب پاکستان میں شامل ہے۔یہیں ایک پرائمری اسکول میں تعلیم پائی۔موگا سے انٹرمیڈیٹ اور لاہور سے بی۔اے کے امتحانات پاس کیے۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف کالجوں میں لکچرار اور پرنسپل رہے۔تقسیم ملک کے بعد فیروز پور اور موگا میں ملازمت کی وہیں قیام رہا۔1980ء میں انتقال ہوا۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔انگریزی ادب کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے مطالعہ کا شوق تھا۔اس لیے وہ ان تمام تدابیر سے بخوبی واقف ہیں۔جن سے طنز وظرافت میں حسن اور اثر پیدا ہوتا ہے۔انسانی فطرت سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔اس لیے انسان کی کمزوریوں پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ہر زمانے اور ہر مقام کے لوگ ان کی تخلیقات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

کنہیالال کپور کے طنز میں تیزی بھی ہے اور سلیقہ بھی۔ان کا موضوع ادب ہے اس لیے وہ اکثر ادبی موضوعات کو طنز وظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔مثلاً ''چینی شاعری'' اور غالب جدید شعراء کی مجلس میں معیاری مضامین ہیں۔زبان پر ان کو پورا عبور ہے اور وہ اپنے مضامین میں صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں۔رفتہ رفتہ ان کی تحریروں میں مزید سادگی اور روانی پیدا ہوتی چلی گئی۔کنہیالال کپور خیال و کردار کے ذریعے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔

سنگ وخشت، شیشہ وتیشہ، چنگ ورباب، نوکِ نشتر، بال و پر، نرم گرم اور کامریڈ شیخ چلی ان کے مشہور مجموعے ہیں۔

s\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

- کنہیا لال کپور کے منفرد طنزیہ مزاحیہ اسلوب کو سمجھ سکیں گے؛
- خاکہ ایک نثری صنف ہے اس کے بارے میں جان سکیں گے؛
- اردو زبان کی تاریخ کو مختصر طور پر بیان کر سکیں گے؛
- ''برج بانو'' کی کہانی اپنے الفاظ میں تحریر کر سکیں گے؛
- ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے حوالے سے اردو زبان کی خوبیوں کو جان سکیں گے؛
- برج بانو کون ہے؟ یہ جان سکیں گے۔

8.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

برج بانو

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ آج کل کہاں ہے؟ اس کے عجیب و غریب نام کی وجہ کیا ہے۔ یہ تمام سوالات جس آسانی سے کیے جا سکتے ہیں۔ شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دیئے جا سکیں، تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرادوں۔ برج بانو ایک خوبصورت عورت ہے۔ جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان آئی ہے۔ کیا میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں؟ نہیں صاحب میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوبصورت عورت تو کجا بدصورت پنواڑن کو بھی اغوا کرنا گناہِ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیا اسے مجھ سے محبت ہے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے...... اگر آپ یہ پوچھتے کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے تو میں یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا۔ وہ آج کل کہاں ہے؟ وہ میرے گھر میں رہ رہی ہے اسے برج بانو کیوں کہتے ہیں؟ یہ سوال مجھ سے کئی اشخاص نے کیا ہے۔ آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔ بہر کیف وجہ بیان کیے دیتا ہوں۔ اسے برج بانو کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ آپ کو یقین نہیں آتا۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی سند پیش کرنی پڑے گی جو ایک باریش بزرگ ہے جسے اس عورت کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں جسے میری طرح اس عورت سے عشق ہے۔ آپ نے غلط سمجھا۔ یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی موہنی کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جان سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجیے۔ میری عمر تیس برس کی تھی جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں باتیں کرتے ہوئے سنا مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر ہمارے ملک میں عشق کرنے کے لیے

روشناس: پہچان

کُجا: کہاں

اثبات: ہاں

سند: ثبوت

موہنی: خوبصورت عورت

گرویدہ: فریفتہ

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

نہایت غیر موزوں ہے۔لیکن میں مجبور تھا اور مجھ پر ہی کیا منحصر ہے لکھنؤ میں ایک شخص رتن ناتھ سرشار ہوا کرتا تھا وہ اس عورت کی زبان کے چٹخارے پر ایسا مر مٹا کہ ساری عمر اس کا نطق اس کی زبان کے بوسے لیتا رہا۔ کہتے ہیں اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی کہی تھی۔ جس کا ہر مصرع پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ہمراہ آئی ہے۔لیکن چند دنوں سے اداس سی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پچھلے دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے ایسی لمبی چوٹی والے پنڈت جی جو میرے ہمسایہ ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے ''لالہ جی کیا مجاک ہے۔ آپ کے گھر میں ایک ایسی عورت رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا'' اور میرے کئی لمبے بالوں والے دوست مجھ سے بار بار کہہ چکے ہیں آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ سرحد پار کرنے سے پہلے اسے ستلج کی لہروں کی نذر کر دیتے۔ میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔لیکن برج بانو کے دل پر جو گزر رہی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ بچاری ہر روز جلی کٹی سن سن کر تنگ آ گئی ہے آج دوپہر کے وقت جب وہ ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی تو میں نے اس سے کہا ''برج بانو'' میرا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔لیکن کیوں؟ برج بانو نے چونک کر کہا ''میرا قصور؟'' تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا۔لیکن میری ماں ہندو تھی'' ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پوچھتا ''یہ عجیب منطق ہے جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں وہاں منطق کی دال نہیں گلی''۔ وہ اور بھی اداس ہو گئی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا برج بانو تمہیں اب یہاں سے اوشیہ چلے جانا ہوگا۔ایک لمحہ کے لیے وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔اور پھر کہنے لگی۔ اوشیہ کسی شہر کا نام ہے کیا؟ شہر کا نام نہیں۔ اوشیہ ہندی زبان میں ضرور کو کہتے ہیں۔ وہ کھِل کھلا کر ہنسنے لگی۔ میری پرنانی بھی ضرور کو اوشیہ کہا کرتی تھی۔ میں نے پوچھا تم ضرور کو اوشیہ کیوں نہیں کہتیں۔ برج بانو نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ کہنے کی کوشش کرتی ہوں۔لیکن زبان لڑکھڑانے لگتی ہے بس اسی لیے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ یک لخت برج بانو کے چہرے پر غیظ وغضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلا کر کہا کہ ہندوستان میرا گھر ہے میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟ تمہارا گھر پاکستان ہے۔ یہ بالکل غلط ہے پاکستان میری فتوحات میں سے ہے میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دلّی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپنا جھونپڑی میں اور شباب لال قلعہ دلّی میں بسر ہوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ لگایا۔ دیوانِ عام میں مجھے سب سے اونچی مسند پر بٹھایا گیا اور جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بنگالی، گجراتی سندھی حسینہ میرے حسن، میری بھڑک اور طنطنے کی تاب نہ لا سکی۔ میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں رہوں گی یہ درست ہے پرنتو کیا بلا ہوتی ہے جی؟ برج بانو نے شرارت سے کہا پرنتو ہندی میں لیکن کو کہتے ہیں۔ ہاں یاد آیا میری نانی بھی لیکن کو پرنتو کہا کرتی تھی۔ تمہیں بھی اب لیکن کو پرنتو کہنا ہوگا۔ معاف کیجیے میں تو لیکن ہی کہوں گی۔ یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ اگر لیکن کو پرنتو نہیں کہو گی تو تمہیں یہاں سمجھے گا کون؟ ہر وہ شخص...... معاً ایک قلفی بیچنے والا میری ڈیوڑھی کے آگے ٹھہر گیا۔ برج بانو اپنا آخری فقرہ مکمل کیے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور ہاتھ کے اشارے سے قلفی والے کو بلاتی ہے۔ قلفی کھائیں گے آپ؟ وہ مجھ سے پوچھتی ہے، کیا یہ قلفی کھانے کا وقت ہے میں تم سے نہایت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں؟ پہلے قلفی کھا لیجیے اس کے بعد ٹھنڈے دل سے آپ کے مشورے پر غور کریں گے اور وہ قلفی والے کو مخاطب کر کے پوچھتی ہے

منطق: وہ علم جو عقلی دلائل سے حق اور ناحق میں تمیز کر دیتا ہے

اوشیہ: ضرور

معاً: اچانک

s\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

کیسی ہے یہ قلفی تمہاری، میرا مطلب ہے کچھ ٹھکانے کی ہے یا یوں ہی سی! قلفی والا کن انکھیوں سے برج بانو کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے" اجی کیا پوچھتی ہیں آپ، میری قلفی؟ میری قلفی بےنظیر، لاجواب، شاندار"۔

برج بانو کے مغموم لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے اور قلفی کھائے بغیر قلفی والے کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتی ہے اور اس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔ قلفی والا چلا جاتا ہے۔ میں اسے بیٹھنے کے لیے کہتا ہوں لیکن وہ بدستور کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

کن انکھیوں: ترچھی نگاہ سے دیکھنا

کیا فیصلہ کیا تم نے پاکستان جا رہی ہونا؟ وہ میری بات اَن سُنی کر کے ایک سکھ ڈرائیور کی لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ دیکھیے۔ میں لاری کی طرف نظر دوڑاتا ہوں لاری کے فریم پر چند اشعار اردو میں لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لاری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھابڑی والا زور سے چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوتا ہے وہ "چنا زور گرم" بیچ رہا ہے۔

میرا چنا بنا ہے اعلیٰ
اس میں ڈالا گرم مسالہ
چنا لایا میں بابو مزیدار
چنا زور گرم

اب ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دس بارہ مختلف اردو روزنامے اور رسائل ہیں۔ برج بانو ایک اردو روزنامہ خریدتی ہے لیکن جونہی اس کی نظر پہلی سرخی پر پڑتی ہے، اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے جلی حروف میں لکھا ہے۔ "برج بانو ہندوستان میں نہیں رہ سکے گی۔" ایک لمحے کے لیے گویا اس پر بجلی سی گرتی ہے وہ دھم سے گرا چاہتی ہے لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور مبہوت کھڑے رہتے ہیں اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں "ضد نہ کرو بانو تمہیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے" میں نہیں جاؤں گی ہرگز نہیں جاؤں گی۔ لیکن حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم...... حکومت قانون بنا سکتی ہو۔ لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں قلفی والے۔ سکھ ڈرائیور اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ "خدا کی قسم بڑی ضدی ہو تم"

مبہوت: حیران، ہکّا بکّا

برج بانو تو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیرِ لب دہرا رہا ہوں۔

بےنظیر، لاجواب، شاندار!!!

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

8.2 متن کی تشریح

یہ برج بانو کی داستان ہے..................میری قلفی بے نظیر، لاجواب، شاندار

مصنف نے سبق کے اس حصے میں برج بانو کا تعارف کرایا ہے اور اس کی دکھ بھری داستان بیان کی ہے۔ برج بانو کو ایک خوبصورت عورت کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی ماں ہندو اور اس کا باپ مسلمان تھا اسی لیے اس کا نام برج بانو پڑا۔ یہاں مصنف نے تمثیلی انداز میں گفتگو کی ہے۔ دراصل اردو زبان کو ہی برج بانو کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہی برج بانو ہے جو مصنف کے ساتھ پاکستان سے ہندوستان تشریف لائی ہیں۔ اور اسی کے گھر میں رہ رہی ہے۔ لیکن یہاں کے لوگوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ایک مسلمان پاکستانی عورت اس ملک (ہندوستان) میں رہے۔ برج بانو ان لوگوں کی باتیں سنکر بہت غم زدہ ہو جاتی ہے۔ اور اس پر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ آخر مصنف بھی برج بانو پر یہی زور ڈالتا ہے کہ اس کو واپس پاکستان جانا ہی پڑے گا۔ لیکن وہ سوال کرتی ہے کہ آخر میں کیوں جاؤں واپس؟ میری ماں تو ہندوستانی تھی لیکن افسوس ہمارے سماج میں نسل ماں سے نہیں باپ سے چلتی ہے اور چونکہ اس کا باپ مسلمان تھا اس لیے اس کو واپس جانا ہی ہوگا۔ وہ مصنف کو یہ بھی سمجھاتی ہے کہ میری پیدائش تو دلّی کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی اور لال قلعہ میں میری نوجوانی کی عمر گزری۔ میں اپنا گھر، اپنا وطن چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟ اسی گفتگو کے دوران مصنف نے کچھ ہندی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن برج بانو ہندی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ کو ہی ترجیح دیتی ہے۔ اور مصنف اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اگر تم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو اسے ہندی لفظوں کو استعمال کرنا پڑے گا۔ ورنہ تمہارا راستہ پاکستان ہے اسی دوران ایک قلفی والا آجاتا ہے یا نہیں وہ جواب میں کہتا ہے کہ میری قلفی کے بارے میں آپ کیا پوچھتی ہیں۔ میری قلفی تو ایسی لذیذ اور شاندار ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔

دراصل مصنف نے سبق کے اس حصے کو برج بانو کی گفتگو سے بہت دلچسپ اور مؤثر بنا دیا ہے۔ اور اس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو زبان کا گھر تو حقیقت میں ہندوستان ہی ہے۔ پھر اس زبان کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں ہو رہی ہے؟ اس کو اپنے ہی گھر سے بے دخل کیوں کیا جا رہا ہے؟ جب کہ ایک عام انسان ہی نہیں معمولی اشیاء بیچنے والے بھی اس زبان کا کتنا خوبصورت استعمال کر رہے ہیں۔

مذکورہ بالا جملوں میں بیان کیے گئے واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاکہ اس طرح کا خاکہ نہیں کیونکہ خاکہ عام طور پر کسی شخصیت پر لکھے گئے مضمون کو کہتے ہیں۔ لیکن اس سے الگ ہٹ کر شہر، جگہ اور اشیاء کے بھی خاکے لکھنے کی ایک اہم روایت اردو میں ہے۔ یہ خاکہ دراصل شخصیات سے الگ ہٹ کر دراصل اردو زبان کا خاکہ ہے۔ اس خاکے میں اردو زبان کی تمام تر خصوصیات، اس کی عصری تاریخ اور اس کی جڑوں کی تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً پاکستان سے مصنف کا اسے لانا موجودہ تاریخ میں اردو کو دراصل پاکستان کی زبان بتانا ہے یعنی یہ خاکہ جو اردو کی ایک صد سالہ مگر مختصر تاریخ ہے۔

s\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

بٹوارے کے بعد اس زبان پر جو کچھ بھی بیتی اس کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس حصے میں مصنف نے اردو کو ہندوستان کی زبان ہونے کی دلیل کے سلسلے میں چھوٹے چھوٹے ایسے واقعات بھی قلمبند کیے ہیں جن سے اردو کے ہندوستان میں زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے مثلاً قلفی والے کا بیان۔

8.3 زبان کے بارے میں

1. کنہیالال کپور خاکہ نگاری میں بڑی مہارت رکھتے ہیں ان کے خاکے مختصر اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان کے خاکوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خاکہ نگار سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اس بات چیت کے دوران وہ بہت آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔
2. کنہیالال کپور نے اس حصے میں کہیں ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ جیسے اوشیہ جس کے معنی میں ضرور۔ ایک اور لفظ ہے پرنتو جس کے معنی ہیں لیکن۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک ساتھ دو لفظوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ بے نظیر اور لاجواب ان دونوں الفاظ کے معنی ہیں ایسی کوئی بھی چیز جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو۔ اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے زبان میں زیادہ زور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اور زیادہ پر کشش اور خوبصورت ہو جاتی ہے۔
3. برج بانو ایک مرکب لفظ ہے یعنی برج + بانو - برج کا اپنا ایک خاص تہذیبی اور مذہبی سیاق ہے مثلاً برج سے برج بھاشا، بہت سے ہندوستانی پنڈتوں کے نام میں ہم اس کا استعمال دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً پنڈت برج نرائن چکبست، برج لفظ کرشن سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی یہ خاص ہندی زبان کا لفظ ہے۔ وہیں پر بانو مسلم عورتوں کے نام کا ٹائٹل ہے مثلاً شہر بانو، حسن بانو وغیرہ۔ اس ترکیب کے ذریعے مصنف نے اردو کے مخلوط اور مشترکہ انداز کو ظاہر کیا ہے۔ یعنی اردو نہ صرف بانو ہے نہ فقط برج، اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی اور ہماری مشترکہ کوششوں کی علامت ہے۔

متن پر سوالات 8.1

صحیح جملوں کے سامنے () کا نشان لگائیے۔

1. برج بانو کے عجیب وغریب نام کی وجہ ہے۔

(الف) اس کا باپ ہندو اور اس کی ماں مسلمان تھی۔

(ب) برج بانو انگلستان سے تعلق رکھتی تھی۔

(ج) اس کی ماں ہندو اور اس کا باپ مسلمان تھا۔

(د) برج بانو پاکستان سے ہندوستان آئی تھی۔

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

2. اوشیہ کے معنی ہیں۔
(الف) ضرور
(ب) لیکن
(ج) سب
(د) چلو

3. برج بانو ایک مرکب لفظ ہے ایسے پانچ مرکبات بتائیں۔

4. کالم 'الف' اور 'ب' میں دیئے گئے غیر مکمل جملوں کو دونوں کالموں کی مدد سے مکمل کریں۔

کالم 'الف'		کالم 'ب'	
(i)	تاہم کوشش کروں گا	(i)	وہ بدستور کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے
(ii)	میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ	(ii)	آپ کو برج بانو سے روشناس کرادوں
(iii)	یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی	(iii)	لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں
(iv)	میں اسے بیٹھنے کے لیے کہتا ہوں لیکن	(iv)	خوبصورت عورت تو کُجا بدصورت پنواڑن کو بھی اغوا کرنا گناہِ عظیم سمجھتا ہوں

5. بےنظیر کے معنی ہیں۔
(الف) بے مثال
(ب) بدصورت
(ج) خوبصورت
(د) پرکشش

8.4 متن کی تشریح

کیا فیصلہ کیا تم نے پاکستان جا رہی ہونا؟......................لاجواب! شاندار!! بے نظیر!!!

مصنف نے سبق کے اس حصے میں یہ بتایا ہے کہ اردو زبان کو شعوری طور پر ہندوستان سے ختم کرنے کی مختلف کوششیں کی جا رہی ہیں اس کے باوجود وہ لوگ اپنی اس پالیسی میں کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ یہ زبان عوام کی زبان ہے جس کو اتنی آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا یہ وہ زبان ہے جس سے ہندوستان کے لوگ عشق کرتے ہیں۔ان کے دلوں سے اس زبان کی محبت کو اتنی آسانی سے دور نہیں کیا جا سکتا۔خاص طور پر وہ طبقہ جو اپنے جذبات کا اظہار اسی زبان میں کرتا ہے۔اگر کوئی لاری والا اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے وہ بھی اسی زبان میں شعر لکھتا ہے تا کہ ہر خاص و عام اس کی بات کو آسانی سے

s\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

سمجھ سکے۔ اگر کسی چنے والے کو چنے فروخت کرنے ہیں تو وہ بھی اردو زبان کو ہی اپنی طاقت اور اپنا سہارا بنا کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ یہی قلفی والے، اخبار بیچنے والے، اور لاری چلانے والے اردو زبان کی طاقت ہیں۔ برج بانو حکومت کے ہر فیصلے، اور ہر قانون کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ جب تک میرے ساتھ یہ تمام لوگ موجود ہیں۔ حکومت یا اور کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ مجھے اس ہندوستان سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ میں یہاں کے لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ راج کرتی رہوں گی۔

یعنی اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوا کہ زبان کو سیاسی سرپرستی ملے یا نہ ملے لیکن وہ اپنے بولنے والوں اور چاہنے والوں کی بدولت زندہ رہتی ہے۔ اس خاکے کا خاتمہ ہندوستان میں اردو کی موجودہ صورتِ حال کی منہ بولتی تصویر ہے۔

8.5 زبان کے بارے میں

1 زبان سادہ اور پرکشش ہے۔ ایک عام آدمی اردو زبان کا کتنا خوبصورت استعمال کرتا ہے۔ ایک چنے بیچنے والے کی زبان کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے زبان میں غضب کی مٹھاس ہے جب اس کی آواز ہماری سماعت سے ٹکراتی ہے تو اس وقت وہ ہمارے دل کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

میرا چنا ہے اعلیٰ
اس میں ڈالا گرم مسالہ
چنا لایا میں بابو مزیدار
چنا زور گرم

مصنف نے یہاں ایک اچھا محاورہ بھی استعمال کیا ہے جو عام بول چال کی زبان میں اکثر استعمال ہوتا ہے ''بال بھی بیکا نہ کر سکنا'' کے معنی ہیں کچھ نہیں بگاڑ سکنا۔

2. اس حصے میں ایک لفظ ''مجاک'' استعمال ہوا ہے جو دراصل ''مذاق'' کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ اسی طرح دوسرے الفاظ جیسے سبزی کو ''سبـ جـی'' غالب کو ''گالب'' غزل کو ''گجل'' خوشی کو ''کھوشی'' وغیرہ غلط تلفظ کے ساتھ پڑھ لیا جاتا ہے یا بولا جاتا ہے۔

8.2 متن پر سوالات

1. صحیح جملوں پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(الف) برج بانو پاکستان جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔

(ب) برج بانو انگلینڈ جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔

and
s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

(ج) برج بانو ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

(د) برج بانو کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔

2. اخبار فروش کیا فروخت کر رہا ہے؟

(الف) اخبار اور رسائل

(ب) کتب

(ج) کیلنڈر

(د) مذہبی کتابیں

3. روزنامے کی پہلی سرخی پر کیا لکھا ہوا ہے؟

(الف) برج بانو کو خودکشی کر لینی چاہیے۔

(ب) برج بانو اب ہندوستان میں نہیں رہ سکے گی۔

(ج) برج بانو پاکستان واپس جاؤ۔

(د) برج بانو کو ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

4. ''لا'' کے معنی ہیں نہیں۔ جب یہ کسی لفظ کے پہلے لگتا ہے تو نہیں کے معنی دیتا ہے۔ جیسے لا جواب جس کے معنی ہیں جس کا کوئی جواب نہ ہو۔ اس طرح کے پانچ الفاظ لکھیے۔

آپ نے کیا سیکھا

1. اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔

2. اردو ہندوستان میں جنمی، پلی بڑھی، اور یہیں پھل پھول رہی ہے۔

3. اردو ایک سیکولر زبان ہے یعنی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔

4. اردو ہندوستانی عوام کی روزمرہ کی زبان ہے۔

5. زبانیں اپنے بولنے والوں کی وجہ سے زندہ رہتی ہیں۔

6. زبان کا کسی ملک، کسی مذہب، کسی فرقے سے تعلق نہیں ہوتا۔

7. خاکہ ایک نثری صنف ہے جس میں کسی ایسے شخص کا حلیہ، مزاج، کام، حیثیت، انفرادیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس نے خاکہ نگار پر اثر ڈالا ہو۔

8. برج بانو خاکے کی روایت میں ایک اضافہ ہے۔

9. برج بانو اردو کا تمثیلی خاکہ ہے۔

s\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE1.tif
not found.

8.6 اسلوب بیان

1. کنہیا لال کپور کا اندازِ بیان سادہ، شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ انہوں نے برج بانو کا خاکہ خوبصورت اور پر کشش انداز میں پیش کیا ہے۔
2. ان کے اسلوب کی ایک خاصیت ہے کہ وہ بات چیت کے انداز میں ہی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس سے ان کی نثر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔
3. اپنے اس خاکہ میں کہیں کہیں ہندی الفاظ کا استعمال کر کے ہندی اور اردو زبان کی مشترکہ تہذیب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔
4. اس مختصر سے خاکے میں انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اردو زبان کی اہمیت اور اس کی شہرت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔
5. کنہیا لال کپور کا یہ خاکہ ''برج بانو'' بطور عنوان بھی انوکھا اور نیا ہے اور بہ اعتبار اسلوب بیان بھی۔
6. کنہیا لال کپور سیدھی سادی بات کو اپنے بیان سے موثر اور پر کشش بنانے کا فن جانتے ہیں۔

8.10 اختتامی سوالات

1. برج بانو کہاں سے اور کس کے ساتھ آئی ہے؟
2. ہندوستان کے لوگ برج بانو سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟
3. برج بانو کی کہانی اپنے الفاظ میں لکھیے؟
4. قلفی والا اپنی قلفی کی تعریف کن الفاظ میں کرتا ہے؟
5. اخبار پڑھ کر برج بانو کا رنگ زرد کیوں پڑ گیا؟
6. ہندوستانی حکومت برج بانو کے متعلق کیا فیصلہ کرتی ہے؟
7. ہندوستان کے لوگ برج بانو سے عشق کیوں کرتے ہیں؟
8. برج بانو کی پیدائش کہاں ہوئی اس کا شباب کہاں گزرا؟

8.7 مزید مطالعہ

''برج بانو'' جو کنہیا لال کپور کے خاکوں کا مجموعہ ہے اس میں سے ان کے خاکے پڑھیے جو خاکہ آپ کو سب سے زیادہ پسند آئے اس کو اپنے ساتھی کو سنائیے۔

کچھ دوسرے خاکہ نگاروں کے خاکے بھی پڑھئے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

9

امتیاز علی تاج

مصنف کا تعارف

امتیاز علی تاج کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ ستر سال کی عمر میں ان کا انتقال ۱۹۷۰ء میں ہوا۔

طنز و مزاح اور ڈرامہ نگاری میں امتیاز علی تاج کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اردو زبان میں بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں اور مزاحیہ فیچر لکھے ہیں۔ مثلاً ''چچا چھکن نے تصویر ٹانگی''۔ ''چچا چھکن نے تیمارداری کی'' یہ انہیں کا اک مزاحیہ فیچر ہے جو ڈرامہ کے انداز پر ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء بچوں کے ادب سے کی۔ وہ کافی عرصہ تک رسالہ ''پھول'' جو لاہور سے شائع ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر رہے۔ یہ رسالہ ان کے والد ممتاز علی تاج نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے خیال سے جاری کیا تھا۔ امتیاز علی تاج اپنی تحریروں کے ذریعہ ہنسی ہنسی میں بڑے کام کی باتیں بتا جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے پر ان کو عبور حاصل تھا۔ انہوں نے نہ صرف بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے لکھے ہیں بلکہ عورتوں کے لیے بھی اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں لکھ کر شہرت حاصل کی ہے۔

اگرچہ امتیاز علی تاج نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کی شہرت کو چار چاند لگانے والی تصنیف ''انارکلی'' ہے اس کے علاوہ انہوں نے ''گونگی جورو'' ''چچا چھکن'' اور ''کمرہ ۵'' ڈرامے لکھے۔ امتیاز علی تاج کو مغلیہ عہد کی درباری زبان، آداب و لہجہ سے پوری طرح واقفیت تھی۔

ڈرامہ ''انارکلی'' ان کا ادبی شاہکار ہے جس میں انارکلی اور شہزادہ سلیم کی عشقیہ داستان کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مزکورہ بالا دونوں مزاحیہ فیچر کے علاوہ ''چچا چھکن نے دھوبن کو کپڑے دیئے''۔ ایک بہترین مزاحیہ فیچر ہے۔ ان تینوں مزاحیہ فیچر میں چچا چھکن کا کردار نا قابلِ فراموش ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو اس سبق سے ہو جائے گا۔

NOS\NOTE1.tif not found.

مقاصد

آپ اس سبق کو پڑھنے کے بعد:

- امتیاز علی تاج کی ادبی حیثیت اور زندگی کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے؛
- الفاظ اور محاوروں کے معنی سمجھ کر انہیں اپنے جملوں میں استعمال کر سکیں گے؛
- امتیاز علی تاج کے اسلوب تحریر سے آگاہ ہو سکیں گے؛
- سبق میں آئے ہوئے مزاحیہ جملوں کے ذریعہ آپ نہ صرف لطف اندوز ہوں گے بلکہ نثری صنف طنز و مزاح کے مفہوم کو بھی سمجھ سکیں گے۔
- تیمارداری کے مفہوم اور طریقے کو سیکھ سکیں گے اور اپنے اندر کسی بیمار کی تیمارداری کرنے کا جذبہ پیدا کر سکیں گے۔

9.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

چچا چھکن نے تیمارداری کی

کردار:

چچی

ننھا چچا کا چھوٹا لڑکا

ماما

امامی نوکر

چچا

چھٹن چچا کا منجھلا لڑکا

پہلا حصہ

دالان میں ایک چار پائی پر للو لیٹا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہینوں سے بیمار ہے۔ سرہانے چچی بیٹھی اس کا سر دبا رہی ہیں۔ دو تین بار اٹھنے کی کوشش کرتی ہیں مگر للو فوراً اٹھنے لگتا ہے۔ چار پائی کے پاس تپائی پر گلاس، پیالی،

NOS\NOTE2.tif not found.

دوا کی شیشیاں اور گھڑی رکھی ہے۔ بائیں جانب ایک نعمت خانہ ہے۔ ذرا آگے کو گھڑونچی پر گھڑا ہے جس پر ایک کٹورا رکھا ہے وہیں پاس ایک لوٹا اور بالٹی فرش پر رکھے ہیں۔ پیچھے دیوار کے پاس ایک میز پر پائیدان اور پانوں کی ٹوکری رکھی ہے۔ زمین پر اگالدان رکھا ہے۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ باورچی خانے اور بائیں کا چچا کے کمرے میں کھلتا ہے۔

ماما : (باورچی خانے سے) بیوی دال دے جائیں کہ میں بین لیتی نہیں تو کرکل رہ جائے گی۔

چچی : ابھی آئی بڑی بی، یہ للوا ٹھنے بھی تو دے۔

ماما : (اندر آتی ہے) بیوی چابی دے دیجئے میں خود نکال لے لیتی ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی اور دال کھانے تک گل پائے گی۔ صبح سے یہ وقت آ گیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔

چچی : بڑی بی آخر تم ہی کہو، کیا کروں، گھر اٹھاؤں، ہنڈیا چولھا کروں، بچے سنبھالوں یا بیمار کی پٹی سے لگی بیٹھی رہوں (للو سے) میرے چاند میں ابھی آئی۔ ذرا بڑی بی کو دال نکال کر دے آتی۔

ننھا : نہیں اماں مت جا۔

چچی : میں ابھی آئی میرے لال (اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ ماما سے) چلو تمہیں تو نبٹا ہی دوں۔ پھر دیکھا جائے گا (داہنے ہاتھ کے دروازے سے جاتی ہیں)

ماما : (للو ٹھنکنے لگتا ہے) میاں ابھی آتی ہوں گی اماں (للو کی بلائیں لے کر) میں صدقے گئی اپنے میاں کے۔ دیکھوں تو کیسا ستُ گیا ہے منہ (للو ٹھنکتا ہے) روؤمت میاں دل ہلکان ہو جائے گا۔

ننھا : اماں پانی (چچی دال کی تھالی ہاتھ میں لے آتی ہیں)

چچی : لو بس آ گئی۔

ننھا : اماں پانی۔

چچی : ابھی لائی (تھالی ماما کو دیتے ہوئے) لو بڑی بی اچھی طرح بین لینا۔ اب کے دال ایسی لائے ہیں جیسے گھوڑے کا دانہ۔ خدا جانے گلے گی بھی یا نہیں (ماما دال لے کر چلی جاتی ہے)

ننھا : پانی۔

چچی : (جلدی سے جا کر پانی لاتی ہیں) لو میرے لال (پانی پلانے کے بعد پائینتی پر بیٹھ جاتی ہیں اور تولیہ اٹھا کر للو کے پاؤں میں جھانواں کرتی ہیں)

امامی : (چچا کی پانوں کی ڈبیہ لے کر آتا ہے اور چچی کے پاس جا کر) میاں نے ڈبیہ بھیجی ہے اور کہا ہے خوب اچھی طرح بھر دیں۔ میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔

چچا : (باہر سے) امامی او بے امامی بٹوے میں چھالیا اور تمبا کو بھی بھروالینا۔

بنی لیتی: چُن لیتی

کرکل: کنکر وغیرہ

ست: کمزور، دبلا، پریشان

جھانواں: بخار کم کرنے کے لیے کپڑے سے پیر کے تلوے کو ہلکے ہلکے رگڑنا

NOS\NOTE1.tif not found.

چچی : (امامی سے) بس آ گئے جرنیلی حکم لے کر۔ میں خود پریشان ہوں۔ مجھ سے نہیں بھری جاتی ڈبیا۔ لے جا اٹھا کر پاندان۔ بھرتے رہیں گے۔ آپ ہی۔ ہونہہ۔

امامی : بہت خوب (پاندان اٹھا کر بائیں دروازے سے چلا جاتا ہے)۔

چچا : (اندر آ کر) وہ پاندان بھیج دیا تم نے۔

چچی : (غصے کو ضبط کرتے ہوئے) تو اور کیا بیمار کی چارپائی اٹھوا کر بھیجتی۔

چچا : تم تو ہر سیدھی بات کا جواب الٹا دیتی ہو۔ مزاج ہی نہیں ملتا کسی وقت جناب کا۔

چچی : تمہیں خدا کا خوف نہیں کہ آج بچے کو بیمار ہوئے آٹھواں دن ہے بخار ہے کہ کسی وقت پیچھا نہیں چھوڑتا۔ رات یونہی آنکھوں میں کٹتی ہے، پھر ایک دن نہ دو دن آٹھ دن ہو گئے۔ ذرا دیکھنا تو بچے کی حالت، نیک بخت بالکل ہڈی چمڑا ہو رہا ہے۔ (پھر جھانواں کرنے لگتی ہے)

چچا : بھئی میعادی بخار تو اسے ہی کہتے ہیں۔ یہ تو اپنی میعاد پوری کر کے ٹلے گا۔

چچی : تو یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ آج آٹھواں دن تھا۔ خیال تھا کہ آج ٹوٹ جائے گا۔ مگر آج کا دن بھی صاف نکل گیا۔ ایک اور ہفتہ پہاڑ کی طرح سر پر کھڑا ہے۔

چچا : (للو سے اپنا پیٹ کھجاتے ہوئے) کیوں بے یار للو؟ راوی چین لکھتا ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے کروا رہے ہو جھانواں میرے استاد۔ یہ کہو تم اٹھتے کب ہو؟

چچی : (غصے سے بیتاب ہو کر) جلدی اٹھ بیٹھ بیٹے۔ ابا فکر کے مارے دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔

چچا : (تاب نہ لاتے ہوئے) یعنی آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے سوا کسی کو بچے کی فکر ہی نہیں۔

چچی : (روکھی ہنسی ہنستی ہیں) یہ تو وہی مثل ہوئی کہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔

چچا : (غصے میں) بڑا تیر مارا کہ روز تیمارداری کر لی۔ سمجھ بیٹھیں کہ، ہمچو من دیگرے نیست جناب نے تو ایک بچے کی تیمارداری کی ہے میں بیسیوں جوانوں کی تیمارداری کر چکا ہوں۔

چچی : اس میں شک کسے ہے۔

چچا : اور اب بھی میں نے زیادہ دخل نہیں دیا۔ اور دل مار کر چپکا بیٹھا رہا تو کسی خیال سے۔

چچی : ذرا میں بھی تو سنوں۔

چچا : بس تمہارے لیے، کہ بھئی ماں ہے۔ اسے بچے کی ممتا ہے۔ جو جی چاہے کر لینے دو۔ ورنہ مجھے کب گوارا تھا کہ بیمار بچے کو تمہارے ہاتھ میں چھوڑ دیتا۔

چچی : ایسا پتھر دل پر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

چچا : لیجئے یک نہ شد دو شد۔ بھئی کہہ تو دیا کہ تمہارے خیال سے میں الگ الگ رہا۔ ورنہ۔

جرنیلی: سخت حکم

ہڈی چمڑا ہونا: بہت کمزور ہونا، دبلا ہونا

چور کی ڈاڑھی میں تنکا: محاورہ مجرم کو اپنے کیئے پر ہر لمحہ یہ خوف رہتا ہے کہ میرے عمل سے کسی کو شک نہ ہو جائے۔

ہمچو من دیگرے نیست: ہمارے جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے

دل مار کر چپکا بیٹھا: برداشت کر کے

یک نہ شد دو شد: ایک مصیبت تو تھی ہی دوسری اور آ پڑی

NOS\NOTE2.tif not found.

چچی : (سر پھیر کر) بس رہنے دو۔ کبھی اتنی توفیق تو ہوئی نہیں کہ گھڑی دو گھڑی آ کر بیمار کے پاس بیٹھ جائیں۔ آ جاتے ہیں صبح شام ناک پر دیا جلانے اُتر گیا بخار؟ کیا بات اب تک اُترا کیوں نہیں؟ او ہو یہ کریں گے تیمارداری۔

چچا : ’’دیکھو بیوی ہم وشنام سن لیں گے مگر طعنہ سننے کی ہمارے دل میں جان نہیں‘‘

چچی : ’’ایسے ہی نکیلے ہیں۔‘‘

چچا : آپ جب بات کرتی ہیں اس طرح کرتی ہیں گویا مجھ سے شادی کر کے آپ نے صرف میرے نہیں بلکہ میری سات پشت پر احسان کیا ہے۔

چچی : احسان نہیں کیا تو اور کیا کیا۔ جیسے مل ہی تو جاتی مجھ سی بیوی۔

چچا : ملنے کو کیا بیویوں کا کال پڑا ہے۔

چچی : تو پھر روکا کس نے۔

وشنام: گالی

ہمارے دل میں جان نہیں ہے: ہمارے پاس ہمت نہیں

سات پشت: سات نسلوں پر یعنی باپ دادا پر

کال: قحط، کمی

دوسرا حصہ

چچا : ڈپٹی صاحب نے مہینوں میرے ابا کی خوشامدیں کیں۔ دوست، یاروں سے کہلوایا۔ نواب صاحب بیچارے اسی تمنا میں مر گئے کہ ان کی بیٹی سے ہماری شادی ہو جائے۔ مگر وہ تو یہ کہو کہ ابا مرحوم آپ کے والدین کو زبان دے چکے تھے ورنہ قیامت تک نہ ہوتی تم سے شادی۔

چچی : اجی ایسے ہی تیس مار خاں تھے آپ۔

چچا : جی تیس مار خاں نہ تھے تو ایسے کوئی گھس کھدے بھی نہ تھے۔ اجی ایک ڈپٹی صاحب اور نواب صاحب پر کیا موقوف، ہم جدھر سے نکل جاتے لوگ بیٹیاں دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔

چچی : گویا یوسف ثانی تو آپ ہی ہیں۔

چچا : جایئے جایئے۔ جا کر اپنا باورچی خانہ سنبھالیے۔ میں آپ کر لوں گا تیمارداری۔ کوئی بات ہے بھلا! (کچھ سوچ کر) اور جناب ایسی کچھ بری صورت بھی نہیں ہماری۔

چچی : خیر وہ تو سب کو دکھتی ہے۔ مگر جو آتی وہ چولھا ہنڈیا نہ کرتی اور نہ تمہارے بچوں کے پیچھے اپنی جان ہلکان کرتی۔

چچا : تو جایئے آپ باورچی خانے میں تشریف لے جایئے۔ اور چولھا ہنڈیا کیجئے۔ میں کرلوں گا بچوں کی دیکھ بھال۔

چچی : کیا کروں پتھر تلے ہاتھ ہے۔

چچا : جی صرف آپ ہی کا ہے اور ہم تو غیر ہیں۔ ہمیں تو جیسے بچے سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔

چچی : ڈاکٹر صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ ایک سے زیادہ تیماردار بچے کے پاس نہ رکھیے۔ گھر میں شور وغل نہ ہو، ورنہ مجھے انکار نہیں یہ ارمان بھی نکال لو۔

زبان دے چکے تھے: وعدہ کر چکے تھے

گھس کھدے: حقیر، معمولی

یوسف ثانی: حضرت یوسف علیہ السلام تو حسن میں یکتا تھے ہی آپ اپنے کو دوسرا یوسف سمجھے ہیں

چولھا ہنڈیا: گھر گرہستی کے کام

پتھر تلے ہاتھ ہونا: کسی وجہ سے مجبور اور بے بس ہونا

NOS\NOTE1.tif not found.

چچا : تو تم ایک تیماردار ہو اور میں ایک سے زیادہ ہو گیا۔

چچی : تو اور کیا۔

چچا : وہ کیسے؟

چچی : اس لیے کہ گھر بھر کو اکٹھا کر لو گے، اور وہ غل۔

چچا : اور تم جیسے چپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھی رہتی ہو۔

چچی : چپ شاہ کا روزہ نہیں رکھتی تو سب کو پکار پکار کر گھر بھر کو سر پر اٹھاتی۔

چچا : (بگڑ کر) بہت اچھا جائیے۔ مودے اور امامی اور بندو کو بھی باورچی خانے میں گھٹنے سے لگا کر بٹھا رکھیے۔ میں ان کے بغیر بھی دکھا دوں گا کیونکر کرتے ہیں تیمارداری۔

چچی : (فوراً اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور تولیہ چچا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) لو یہ رہا تولیہ (دائیں ہاتھ کے دروازے سے باہر چلی جاتی ہیں)۔

چچا : ہائیں (کبھی بے کسی سے تولیے کو دیکھتے ہیں کبھی للو کو۔ پھر دائیں ہاتھ کے دروازے کو۔ پھر للو سے) دیکھتا ہے ان کی باتیں۔ سمجھتی ہیں بس انہیں کو کرنی آتی ہے تیمارداری۔ اور سب تو اپاہج ہیں۔

ننھا : (ٹھنک ٹھنک کر) اماں، اماں۔

چچا : اماں چلی گئیں تو کیا۔ ہم جو ہیں۔

ننھا : اماں، اماں۔

چچا : کیوں بھئی کیا بات ہے ہم کیے دیتے ہیں جھانواں، اماں ہی آکر کون سا تیر مار لیں گی۔ تو جھانواں کریں اپنے بیٹے کے؟

(للو منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ سر ہلا دیتا ہے)

ہم آپ کریں گے اپنے بیٹے کے جھانواں (تکلف سے پائینتی پر بیٹھتے ہیں۔ دو چار پینترے بدلنے کے بعد ذرا اطمینان ہوتا ہے) لو بھئی ہم تو کرتے ہیں جھانواں اور تم کرو باتیں۔

(تولیے کی گدی بناتے ہیں۔ کئی طریقوں سے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ساتھ منہ بھی ٹیڑھا کر رہے ہیں)

چچا : یہ چپ سادھنے کی شرط نہیں (تولیہ ٹھیک کرتے ہیں۔ یوں تمہارا دل گھبرا جائے گا (پھر تولیہ درست کرتے ہیں) باتیں کرنی ہوں گی ہم سے (تولیہ تہہ کر کے) ہاں! اچھا یہ بتاؤ تم کھاؤ گے کیا؟ (تولیہ تہہ کرنے کے بعد بڑے اطمینان اور فخر سے اسے دیکھتے ہیں) اب بنی گدی جھانوے کی۔ جناب اسے کہتے ہیں گدی۔ کبھی دیکھی بھی نہ ہوگی۔ بیگم صاحبہ نے۔

(چچا بڑے زور وشور سے جھانواں کرنا شروع کرتے ہیں گویا پالش کر رہے ہیں۔ امامی کٹورے میں پانی لینے

چپ شاہ کا روزہ رکھنا: خاموشی اختیار کرنا

گھٹنے سے لگا کر بیٹھانا: اپنے قریب رکھنا

کون سا تیر ماریں گی: کون سا کمال کر لیں گی

آتا ہے)

چچا : کیوں بے امامی دیکھا جھانواں کرنا اسے کہتے ہیں۔ یوں نہیں جیسے تمہاری چچی کرتی ہیں، معلوم ہوتا ہے مکھیاں اُڑا رہی ہیں۔ ذرا پانی تو پلا۔

امامی : (پانی لا کر دیتا ہے) لو۔

چچا : کٹورا وہیں گھڑے پر رکھ دے۔ کہیں ادھر ادھر مت رکھ دینا۔

(پھر زور زور سے جھانواں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ امامی ان کی اس حرکت کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔)

چچا : پاجی کہیں کا بدتمیز۔ (جھانواں زور سے کرتے ہیں۔) جایئے یہاں سے (امامی جاتا ہے) اب مزا آیا ہوگا جھانویں کا (تیزی میں یہ فقرہ گیت کی تانیں سنائی دیتی ہیں) بڑی محنت کا کام ہے (پینترا بدل کر) ایک طرح کا فن ہے۔ بہت آرام ملتا ہے مریض کو (ہاتھ آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے داہنے بازو کو دباتے ہیں)

ننھا : اُوں اُوں (گویا کہہ رہا ہے ہاتھ مت روکو)

چچا : لو بھئی لو (پہلا سا جوش و خروش نہیں) دیکھا! (ذرا دیر کے بعد اٹھنا چاہتے ہیں) بس۔

ننھا : (ٹھنک کر) اُوں اُوں۔

چچا : (پھر بیٹھ جاتے ہیں اور جھانواں کرتے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ اٹھنے کا بہانہ تلاش کر رہے ہیں) بھئی پیاس تو نہیں لگی؟

ننھا : (ٹھنکتا ہے) اوں۔

چچا : تو پانی لاؤں (للو خاموش ہے۔ چچا ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔) اچھا انار کے دانے لاؤں (کھڑے ہو جاتے ہیں)

ننھا : (ٹھنک کر) اوں (چچا پھر بیٹھ جاتے ہیں)

چچا : ارے ہاں للو، وہ جو تو نے پودا لگایا تھا نہ کیاری میں اس میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ لاکر دکھا دوں؟ (للو خاموش ہے)

(چچی اندر آتی ہیں۔ جنہیں دیکھتے ہی چچا جھانواں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور کنکھیوں سے چچی کو دیکھتے ہیں۔ چچی چچا کی طرف نہیں دیکھتیں۔ گھڑے میں پانی انڈیل کر پلٹتی ہیں اور پھر دائیں دروازے سے باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں۔ چچا مایوس ہو جاتے ہیں)

چچا : ہونہہ۔ معائنہ فرمانے تشریف لائی ہیں۔ گویا (للو سے) کیوں بے یار ہم تمہاری اماں سے اچھا جھانواں کرتے ہیں نا؟

ننھا : اوں (کروٹ بدلتا ہے)۔

چچا : بھلا بیگم صاحبہ کیا جانیں جھانواں کرنا۔

(تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ پھر رک جاتا ہے کبھی ایک ہاتھ سے کبھی دوسرے سے باری باری اپنے بازو کو دباتے ہیں۔ پھر اپنی پنڈلیوں پر مکے مارتے ہیں۔ گویا سوئے ہوئے پاؤں کو جگا رہے ہیں)۔

ننھا : اماں، اماں۔

چچا : (للو کو چپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں) ابھی کرتے ہیں اپنے بیٹے کے جھانواں (جھانواں کرتے ہیں) بس بھئی زیادہ جھانواں نہیں کرتے ضعف ہو جاتا ہے۔

چھٹن : (اندر آ کر) ابا کیسے ہو جاتا ہے ضعف؟

ضعف: کمزوری

چچا : پاجی! مریض کو اور کیا مجھے (یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور آرام کرسی پر دراز ہو جاتے ہیں۔ تیمارداری کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ منہ بنا بنا کر اپنے ہاتھ دباتے ہیں)

چھٹن : ابا تھک گئے، پاؤں دبادوں؟

چچا : (کھسیانے ہو کر غصے میں) تختی لکھ لی۔ آموختہ دہرایا۔ نالائق کہیں کا۔ سال بھر ہو گیا۔ مولوی صاحب سے پڑھتے ہوئے ابھی تک لکھنا نہیں آیا۔ بس کام نہ کرنے کا کوئی بہانہ چاہیے۔ پاؤں دبادوں۔ چل یہاں سے جا کر اپنی کتاب پڑھ۔

آموختہ: پچھلا سبق دہرانا

(چھٹن منہ بسورتا ہوا چلا جاتا ہے۔ چچا ٹانگیں پھیلا کر تھکن اتارتے ہیں)

چچا : سو گئے للو۔ للو بھیا۔ اے للو، او للو۔ نیند آ گئی کیا؟ اچھا سو رہو۔

امامی : (اندر آتا ہے) بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں، سونے نہ دینا۔ سرہانے میز پر دوا کی شیشی رکھی ہے۔ ایک خوراک دے دو۔

چچا : کسے دے دوں۔

امامی : للو کو۔

چچا : لاؤ ہم دیتے ہیں اپنے للو کو دوا۔ اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے (دوا دینے کو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شیشی کو غور سے دیکھ کر خوراکیں گنتے ہوئے) گویا پوری پانچ خوراکیں ہیں اس میں۔ کیوں بے امامی اور اس میں سے ایک خوراک دینا ہے۔ پوری ایک۔ ناپ کر ٹھیک ہے نا؟

امامی : جی میاں۔

چچا : ایک وقت میں مریض کو صرف ایک خوراک دی جاتی ہے (ایک ہاتھ میں پیالی ہے دوسری میں شیشی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ پھر شیشی ٹھوڑی کے نیچے دبا کر کاک نکالتے ہیں۔ بے خیالی میں کاک سے گویا دوا پیالی میں انڈیل

NOS\NOTE2.tif not found.

رہے ہیں۔ پھر چونک کر) لاحول ولا قوۃ (کنکھیوں سے امامی کو دیکھتے ہیں۔ جوللو کی مکھیاں جھل رہا ہے۔ پھر چندھیا کر خوراک کا نشان پڑھتے ہیں) کم بختوں کو کبھی کام کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔ بڑے حسین نشان لگائے ہیں۔ گدھے کے بچے۔

امامی : میاں!

چچا : (بوند بوند دوا انڈیلتے ہیں۔شیشی اچھل جاتی ہے) ذرا دیکھ تو امامی (شیشی دکھا کر) نکل آئی نہ ایک خوراک۔

امامی : (شیشی تھام کر) میاں یہ تو ڈیڑھ نکال لی آپ نے۔

چچا : (عینک اتار کر شیشی لیتے ہوئے) دیکھو تو۔اجی میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ سب نشان غلط لیں (عینک لگا کر) تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدھی خوراک واپش شیشی میں لوٹنی ہوگی۔ کیوں امامی کیا رائے ہے۔

امامی : لوٹ دو میاں۔

چچا : (پیالی کو شیشی کے ساتھ لگاتے ہوئے پھر سوچ کر) اونہہ ہونہہ میں نے کہا امامی۔اگر ہم آدھی خوراک جو زائد ہے بجائے شیشی میں لوٹنے کے پھینک دیں تو کوئی حرج تو نہیں؟

امامی : کوئی حرج نہیں میاں۔شیشی میں تو ابھی ساڑھے تین خوراک اور ہے۔

چچا : یہی تو ہم کہتے ہیں (پیالی لے کر دوا کو پھینکنے لگتے ہیں) آں ہاں! نہیں بھائی اگر آدھی خوراک سے زیادہ پھک گئی تو حساب کتاب گڑ بڑ ہوجائے گا۔تم جانو دوا کا معاملہ نہایت نازک ہوتا ہے۔بس مریض کی زندگی دوا اور دعا پر ہی تو ہے۔باقی جھانواں وانواں سب مہمل ہیں۔ کیوں بے امامی؟

مہمل: بے معنی، بے مقصد

امامی : جی میاں۔

چچا : اچھا تو اب تو کھڑا رہیو۔ ہلیو مت۔ میں ابھی آدھی خوراک شیشی میں واپس لوٹے دیتا ہوں۔بس ذرا ہاتھ کی صفائی چاہیے تم ہلنا جلنا مت۔

امامی : جی میاں (امامی دم سادھے کھڑا ہے اور چچا کو دیکھ رہا ہے)

دم سادھے: بالکل خاموش

چچا : یار امامی اپنا تو یہ خیال ہے کہ ایسے ایسے کام مرد بہت اچھے کرتے ہیں۔ یہ عورتوں کے بس کا روگ نہیں (پیالی شیشی کے منہ کو لگا کر) بس تھوڑی دیر اور یوں ہی دم سادھے رہیو۔ میرا بھیا۔

بس کا روگ: بس کا کام

امامی : میاں۔

چچا : اور بس دیکھتا جا (پیالی سے شیشی میں دوا انڈیلتے ہیں۔ دوا باہر بہہ جاتی ہے۔) اصل میں بات یہ ہے کہ اس پیالی میں چونچ نہیں۔ ورنہ تو دیکھتا کہ میں کس صفائی سے لوٹتا دوا (پیالی کے اندر دوا کو دیکھ کر) میرے خیال میں جو دوا پیالی میں رہ گئی ہے وہ بھی شیشی میں ہی لوٹ دیں۔اور پھر نکالیں نئے سرے سے ایک خوراک۔ کیوں کیسی کہی؟

امامی : بہت ٹھیک۔

NOS\NOTE1.tif not found.

چچا : ہے نا (اب جو باقی دوا انڈیلتے ہیں تو ساری دوا بہہ جاتی ہے)

چچی : (باہر سے) اے میں نے کہا۔ دوا پلا دی؟

چچا : بس یہی سمجھو۔

چچی : (باہر سے امامی تو وہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ لے یہ انار کے دانے لے جا۔

چچا : یا میں خود لاؤں؟
(گھبرا کر) نہیں نہیں (امامی سے) جا بے جلدی سے (بیوی سے) نہیں یہ آیا امامی (امامی سے) ذرا جانا میرے بھیا لپک کر۔

امامی : (چچا کی گھبراہٹ دیکھ کر ہنستا ہے) ہی ہی۔

چچا : بدتمیز کہیں کا۔ ہنستا کا ہے پر؟ اور یہ کیا موقع تھا ہنسی کا؟ پیٹ پیٹ کر اُلو کر دوں گا پاجی کو۔

چچی : (باہر سے) ارے بھئی کب تک لیے بیٹھی رہوں یہ نگوڑے انار کے دانے۔

نگوڑے: عورتوں کی ایک گالی ہے

امامی : ابھی آیا (گھبراہٹ میں پہلے دائیں کو پھر بائیں کو چلا جاتا ہے)

تیسرا حصہ

چچا : (غصے میں) ہونہہ ہر آدمی اس گھر کا اپنے آپ کو بقراط سمجھتا ہے اور گویا ہم تو۔

بقراط: ایک مشہور حکیم کا نام

چچی : (باہر سے) ارے او پاجی (چچا چونکتے ہیں) آئے گا بھی کہ نہیں۔

امامی : (بائیں سے اندر آتا ہے) ابھی آیا (دائیں دروازے سے باہر جاتا ہے)

چچا : (ہاتھ پونچھ پانچھ کر شیشی کو دیکھتے ہیں) بس اب لو ایک خوراک۔

امامی : (پرچ میں انار کے دانے لیے اندر آتا ہے) یہ لو میاں انار کے دانے۔

چچا : دیکھتا نہیں کام کر رہے ہیں اندھا کہیں کا۔ ''یہ لو انار کے دانے'' رکھ دے میرے سر پر۔ پاجی بدتمیز۔

امامی : اجی میں تو۔

چچا : میں تو کیا، دیکھتا نہیں کس مشکل میں ہیں ہم۔ اب آدھی خوراک سے آدھی خوراک تک دوا نکالنا ہے۔ اور آپ آ گئے انار کے چار دانے لے کر۔ گویا بڑا کارنامہ کیا (رازداری کے لہجے میں) سن تو امامی اگر آدھی خوراک ضائع کر دی جائے اور اگلی پوری خوراک صاف صاف نکال کر مریض کو پلا دی جائے تو......

امامی : بہت ٹھیک رہے گا میاں۔

چچا : ہم تو پہلے ہی کہتے تھے مگر کوئی سنے بھی ہماری (آگے فٹ لائٹ کے پاس آ کر تھوڑی سی دوا گرا دیتے ہیں۔ پھر واپس جا کر بڑی احتیاط سے ایک خوراک نکال کر) دیکھا میرے یار اسے کہتے ہیں ہاتھ کی صفائی بیگم صاحب

NOS\NOTE2.tif not found.

قیامت تک نہ کرسکتیں۔ یہ حساب کتاب اور دعوے دیکھو مسیحائی کے۔

امامی : جی۔

چچا : (للو سے) اے للو، بھیا لو دوا پی لو (للو خاموش ہے) اماں انار کے دانے بھی ہیں اور......

ننھا : (ٹھنک کر) ہم نہیں پئیں گے دوا۔

چچا : (چمکار کر) بس بس میرا بیٹا۔ ابھی لاویں گے ایک موٹر اور ایک لٹو اور جناب دو پہیئے کی سائیکل۔

ننھا : ہم نہیں پئیں گے۔

چچا : سن تو للو۔ ارے وہ پتنگ آئی ہے۔ اور جناب من ہم نے تمہارے لیے ڈور کی پوری ریل منگوائی ہے۔ اور سن لو گلشن سے کہا ہے کہ ایک درجن رنگ برنگ کی کنکیاں بنا کر لائے۔ بس ادھر تم اچھے ہوئے اور ادھر پینچ لڑانے کا سامان ہوا۔

کنکیاں: پتنگیں

امامی : (للو سے) میاں پی لو دوا۔ پھر ہم بھی آپ سے پینچ لڑائیں گے۔

چچا : (امامی کو آنکھ مار کر) کیوں کیسی کہی۔ بس اب پی لو دوا (چچا چارپائی پر چڑھ کر للو کو سہارا دے کر اٹھاتے ہیں۔ امامی سے دوا کا پیالہ لے کر للو کے منہ کو لگاتے ہیں۔

چچا : ارے پاجی پانی تو لا۔ اچھا تو رہنے دے میں خود لاؤں گا پانی۔ تو یہ پیالی تھام (پیالی امامی کو دے کر اور للو کو لٹا کر پانی لینے جاتے ہیں۔ للو ٹھنکنے لگتا ہے۔ (پانی لا کر) لو بس آ گیا میں (پانی کا کٹورا للو کے منہ کو لگا دیتے ہیں اور کلی کے لیے دوا کی پیالی دوسرے ہاتھ میں تھام لیتے ہیں) بس اب پی لو دوا۔ اور کلی کر کے انار کے دانے کھا لو۔

ننھا : (کٹورے کو دیکھ کر) مگر یہ تو پانی ہے۔

چچا : (امامی سے) اندھا ہو گیا ہے۔ اس وقت سے کھڑا دیکھ رہا ہے اور کہتا نہیں کہ میاں دوا نہیں پانی ہے۔ احمق۔ حرام خور۔

امامی : میاں میں۔

چچا : چپ رہ میاں کا بچہ۔ ہم خوب جانتے ہیں۔ یہ سب تم لوگوں کی سازش ہے۔ سارا گھر ایک طرف ہو جاتا ہے۔ مگر ہم کوئی میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں نہیں۔ سب کو دکھا دیں گے کہ یوں کرتے ہیں تیمارداری۔ لاؤ دوا کی پیالی (للو کو دوا پلاتے ہیں۔)

ننھا : یہ تو کڑوی ہے (تھوکتا ہے) یہ تو کڑوی ہے۔ اماں اماں (رونے لگتا ہے)

چچی : (باہر سے) آئی بچے۔

(اتنے چچی آئی للو رو رو کر برا حال کر لیتا ہے ہچکی بندھ جاتی ہے۔ چچا کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ کبھی پنکھا کرتے ہیں۔ کبھی للو کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ کبھی گھبراہٹ میں گھڑی اٹھا کر اس کے کان کو لگا دیتے ہیں۔ پھر

NOS\NOTE1.tif not found.

تھک کر سراسیمہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں پھر رک جاتے ہیں۔ آگے بڑھ کر بچے کو لپٹاتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں۔ بائیں دروازے کی طرف دیکھ کر ذرا زور سے)

سراسیمہ: خوف زدہ

چچا : اب ہم نے تو دوا میں کڑواہٹ ملا نہیں دی۔ ایسی ہی ہوتی ہیں ان ڈاکٹروں کی دوائیں۔ ہمارا کوئی قصور ہو تو ہم ذمہ دار۔ یوں اماں ہی کے بلانے کو جی چاہ رہا ہو تو تم جانو (للو اور زور سے روتا ہے)

چچی : (اندر آتی ہیں۔ پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں ہے۔ بٹوا اور ڈبیا میز پر رکھ دیتی ہیں اور للو کے سرہانے بیٹھ کر) لو بس میں آ گئی (للو کا سر اپنی گود میں رکھ کر سہلانے لگتی ہیں) بس میرا لال۔ لو کلی کرلو (امامی کا کٹورا لے کر للو کو پانی پلاتی ہیں۔ للو کلی کرتا ہے)۔

چچا : ہونہہ (ڈبیا اٹھا کر پان کھاتے ہیں) رٹ ہی لگ جائے ماں کی تو تیماردار غریب کیا کرے (تمبا کو اور چھالیہ نکال کر پھانکتے ہیں)

چچی : (للو کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر) اے ہے اسے تو ضعف کا دورہ پڑ گیا ہے۔ پنڈا ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے۔ رنگت تو دیکھو کیسی پیلی پڑ گئی۔ ارے دودھ لاؤ دودھ۔

امامی : ابھی لایا۔

چچی : نعمت خانے میں رکھا ہے بالائی ہٹا کر لانا۔

چچا : (امامی کو روک کر) تو رہنے دے۔ ہم خود لائیں گے۔

چچی : نہیں بس رہنے دو۔ یہی لے آئے گا۔

چچا : (پیک منہ میں بھرے) اوں اوں (سر کے اشارے سے منع کرتے ہیں۔)

نعمت خانے میں سے دودھ کی پتیلی نکالتے ہیں۔ دودھ انڈیلنے لگتے ہیں۔ بالائی ہٹانے کے لیے پھونک جو مارتے ہیں تو ساری پیک دیگچی کے اندر چلی جاتی ہے۔ نہایت پریشان ہیں۔ دیگچی کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں پھر ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کام میں ہیں۔ دیگچی رکھ کر داڑھی کھجاتے ہیں۔ پھر غور سے دیگچی کو دیکھتے ہیں۔ چارپائی کی طرف بڑھتے ہیں پھر لوٹ جاتے ہیں۔ دیگچی کو نعمت خانے پر رکھ کر جلدی سے بائیں ہاتھ کے دروازے میں گھس کر اندر سے کنڈی چڑھا لیتے ہیں۔

چچی : ارے امامی وہ دودھ نہیں آئے گا۔ ذرا جا تو۔

امامی : ابھی لایا (دودھ کی پتیلی کو دیکھ کر) یہ تو چائے ہے۔

چچی : ہئی ہے! پیک۔

(چچا دروازہ کھول کر باہر آتے ہیں اور دودھ کی پتیلی اٹھا کر اندر گھس جاتے ہیں۔)

(پردہ)

NOS\NOTE2.tif not found.

9.2 متن کی تشریح (پہلا حصہ)

ابتداء سے.......................................تو پھر روکا کس نے ہے۔)

1. اس سبق کے شروع میں ہی آپ ''کردار'' لکھا ہوا ملے گا۔''کردار'' جسے انگریزی میں ''کیرکٹر'' کہتے ہیں جو کسی ڈرامہ کے پلاٹ کو اسٹیج پر ادا کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے شروع میں ہی ان چھ اشخاص کے نام پڑھے جو اس مزاحیہ ڈرامے کے کردار ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور مزاحیہ کردار ''چچا'' کا ہے۔
2. ''ہمچو من دیگرے نیست'' یہ فارسی زبان کا ایک مقولہ ہے جس کے معنی ہیں ہمارے جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔
3. ''دل مار کر جھکا بیٹھا رہا۔'' مجبوراً اپنے اوپر ضبط کر کے برداشت کرتا رہا۔

9.3 زبان کے بارے میں

عموماً عورتوں کی زبان یا ان کی بول چال میں وہ الفاظ شامل ہو جاتے ہیں جو مردوں کے یہاں نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی لیے بیگماتی محاورات روزمرہ کا ذکر اہل زبان نے کیا ہے اس طرح امتیاز علی تاج نے ''چچی'' کی زبان سے اس طرح کے کچھ بیگماتی ''الفاظ محاورات اور روزمرہ ادا کرائے ہیں مثلاً۔

''گھر اٹھاؤں۔ ہنڈیا چولھا کروں یا بیمار کی پٹی سے لگی بیٹھی رہوں۔''

''میرے چاند! میں ابھی آئی۔''

''نگوڑے۔ موئے۔'' وغیرہ۔

متن پر سوالات 9.1

درست جواب پر صحیح کا نشان لگایئے۔

1. ''کردار'' انہیں کہتے ہیں جو۔
   - (i) اسٹیج کے پردے اور دوسرے سامان فراہم کرتے ہیں۔
   - (ii) ڈرامے کے پلاٹ کو اسٹیج پر ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔
   - (iii) ڈرامے کے آخری سین میں جو کچھ دکھایا جائے۔
   - (iv) ڈرامہ لکھنے کے لیے جو مخصوص انداز اختیار کیا جاتا ہے۔
2. ''ہڈی چڑا ہو رہا ہے۔'' اس کا مطلب ہے۔
   - (i) جسمانی طور پر طاقتور ہو رہا ہے۔

(ii) بہت دبلا اور کمزور ہو رہا ہے۔

(iii) جسم کی ہڈی بڑھتی جا رہی ہے۔

(iv) ایک جسمانی بیماری کا نام ہے۔

3. ''ہمچو من دیگرے نیست'' کے معنی ہیں۔

(i) دوسرے کو تکلیف نہ دو۔

(ii) دنیا میں اپنا کوئی نہیں

(iii) ہمارے جیسا کوئی دوسرا نہیں۔

(iv) ہر انسان بھائی ہے۔

9.4 متن کی تشریح (دوسرا حصہ)

ڈپٹی صاحب نے مہینوں میرے ابا کی خوشامد............ بڑے حسین نشان لگائے ہیں گدھے کے بچے۔''

1. ''زبان دے چکے تھے۔'' ''زبان دینا'' محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ''وعدہ کر لینا''

2. ''گھس کھدے بھی نہیں تھے'' ایسے بھی حقیر اور گئے گذرے بھی نہیں تھے۔

3. ''گویا یوسف ثانی تو آپ ہی ہیں۔'' یوسف علیہ السلام ایک پیغمبر تھے جو نہایت خوبصورت تھے۔حسن یوسف ایک تلمیح ہے۔ یہاں پر چچی نے چچا کو طنزیہ طور پر یوسف ثانی کہا ہے۔

4. ''پتھر تلے ہاتھ ہیں'' کسی بہت بڑے دباؤ میں آ کر کے بے بس ہو جانا۔ یہ بھی اردو زبان کا ایک محاورہ ہے۔

5. ''چپ شاہ کا روزہ نہیں رکھتی تو سب کو پکار پکار کر گھر بھر کر سر پر اٹھاتی۔''

اگر میں خاموش رہنے کا عہد نہ کر چکی ہوتی تو شور شرابہ کر کے گھر بھر کو پریشان کرتی۔

9.5 زبان کے بارے میں

''حسن یوسف'' اردو زبان کی ایک تلمیح ہے۔

تلمیح کی تعریف۔نظم یا نثر میں کسی مشہور واقعہ یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنے والے لفظ کو تلمیح کہتے ہیں۔تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں۔لیکن اس کے پیچھے وہ پورا قصہ ہوتا ہے جس کی طرف شاعر یا نثر نگار اشارہ کرنا چاہتا ہے۔تلمیح کے پیچھے جو واقعہ پوشیدہ ہوتا ہے۔اس کو جانے بغیر نظم یا نثر کا مطلب پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اردو زبان میں تلمیحات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔حضرت یوسف علیہ سے متعلق ذہن نشین کر لیجیے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

ماہ کنعاں، چاہ کنعاں۔ یہ مخفف ہے جس کے معنی ہیں۔حضرت یوسفؑ کے

''لاحول ولاقوۃ'' یہ مخفف ہے 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' جس کے معنی ہیں۔نہیں ہے کوئی طاقت اللہ کے سوا۔مگر حقارت ونفرت کے اردو بولنے والے اس کا استعمال کرتے ہیں۔

متن پر سوالات 9.2

ان میں سے درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے۔

1. ''لاحول ولاقوۃ'' اکثر ایسے موقعوں پر کہتے ہیں جب۔
   - (i) کسی سے بہت خوش ہوتے ہیں۔
   - (ii) کسی کی تعریف کرنی مقصود ہوتی ہے۔
   - (iii) کسی بات پر نفرت اور حقارت کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔
   - (iv) کسی کے لیے دعا کرنی ہوتی ہے۔
2. ''زبان دے چلے تھے'' کا مطلب ہے۔
   - (i) کسی بات کے لیے وعدہ کرلیا تھا۔
   - (ii) کسی سے بہت لگاؤ تھا۔
   - (iii) کسی کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔
   - (iv) کسی کے لیے قربانی پیش کرنا۔
3. آپ کا یہ سبق نثری اصناف کے اعتبار سے۔
   - (i) انشائیہ ہے۔
   - (ii) سوانح عمری ہے۔
   - (iii) افسانہ ہے۔
   - (iv) طنز ومزاح ہے۔

9.6 متن کی تشریح (تیسرا حصہ)

1. ''اپنے آپ کو بقراط سمجھتا ہے۔'' 'بقراط' ایک مشہور حکیم کا نام ہے۔ یہاں مراد قابل اور پڑھے لکھے شخص سے ہے۔
2. ''دعوے دیکھو مسیحائی کے''۔اس جملہ میں ایک تلمیح کی طرف اشارہ ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ کے اس معجزہ کی طرف

NOS\NOTE1.tif not found.

اشارہ کیا گیا ہے جس میں وہ مردوں کو زندہ اور بیماروں کو شفا بخشتے تھے۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''مسیحا'' کہا جاتا ہے۔

3. ''ہم کوئی میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہیں۔''

ننھے کو دوا پلانے کے سلسلہ میں چچا بڑے فخریہ انداز سے گھر والوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ہم ہار مان کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ''میدان چھوڑ کر بھاگنا'' ایک محاورہ ہے۔ جس کے معنی شکست کھا کر بھاگ جانا۔

4. ''چچا کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔'' ''ہاتھ پاؤں پھولنا'' محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ ''گھبراہٹ طاری ہونا۔'' بیمار بچے للّو نے جب رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تو چچا میاں گھبرا گئے کہ اب میں کیا کروں۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔

9.7 زبان کے بارے میں

1. آپ کے سبق میں حضرت عیسیٰ علیہ کو ''مسیحا'' کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ کو ''ابنِ مریم'' بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی مریم کا بیٹا۔ انہیں سے متعلق یہ دوسری تلمیح ہے۔ غالبؔ کا یہ شعر آپ نے پڑھا ہوگا۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

متن پر سوالات 9.3

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے۔

1. ''مسیحا'' ان میں سے کس کو کہتے ہیں؟
   (i) حضرت یوسف علیہ السلام کو۔
   (ii) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔
   (iii) حضرت موسیٰ السلام کو۔
   (iv) حضرت خضر علیہ السلام کو۔

2. ''ہاتھ پاؤں پھول جانے کے معنی ہیں۔''
   (i) صحت مند ہونا۔
   (ii) بیمار ہو جانا۔
   (iii) گھبرا جانا۔

(iv) جسم کا وزن بڑھ جانا۔

3. امتیاز علی تاج ایک بہترین

(i) افسانہ نگار ہیں۔

(ii) مزاح نگار ہیں۔

(iii) تنقید نگار ہیں۔

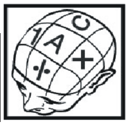

آپ نے کیا سیکھا

1. طنز و مزاح کسے کہتے ہیں۔
2. طنز و مزاح سے کس طرح سماجی خرابیوں کب ابھار کر مثبت کام کیا جا سکتا ہے۔
3. طنز و مزاح میں کیا فرق ہے۔
4. ہم طنز و مزاح سے کس طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔
-5 سماجی خدمت کا جذبہ ہوا ہوا۔
6. -1 بیمار کی تیمار داری کرنا ہر صحت مند انسان کا فرض ہے۔ ہمیں اپنے اندر جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ گھر اور پاس پڑوس کے بیمار لوگوں کی تیمار داری ثواب اور خدمت کے جذبے سے کرنی چاہیے۔
7. -2 تیمار داری عورت اور مرد، لڑکے اور لڑکیاں سبھی کر سکتے ہیں۔ اس میں جنس کی قید نہیں ہے۔ اور نہ یہ کام ایسا ہے کہ اسے عورت نہ کر سکے۔ بلکہ گھر میں تو ایک لڑکا اپنی، بہن، ماں، پھوپھی، چچی، داری، خانہ، ممانی وغیرہ رشتے داروں کی تیماری بغیر کسی رکاوٹ کے کر سکتا ہے۔ اور ایک لڑکی بھائی، باپ، بچا، دادا، ماموں، خالو، پھوپھا وغیرہ کی تیمار داری کر سکتی ہے۔ لیکن گھر سے باہر محلے اور پڑوس میں اگر پردے کا لحاظ و خیال ہو تو عورت، عورت کی، مرد، مرد کی تیمار داری کر سکتا ہے۔ تیمار داری کرنے میں مذہب، ذات، پات، بڑے چھوٹے یا امیر غریب کی تفریق نہیں کرنی چاہیے بلکہ پورے جذبہ اور خلوص کے ساتھ بغیر تفریق کے تیماری داری کرنی چاہیے۔
8. سبق میں آئی ہوئی تلمیحات سے واقفیت ہوئی۔
9. تلمیح کسے کہتے ہیں۔
10. محاورات کے معنی کو سمجھ کر جملوں میں استعمال کرنا آیا۔

9.8 اسلوب بیان

امتیاز علی تاج کو مزاحیہ فیچر لکھنے پر عبور حاصل ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے آسان اور مزاحیہ انداز میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ان

NOS\NOTE1.tif not found.

کے اسلوب بیان میں چبھتے ہوئے طنز اور کھلکھلا کر ہنسنے والے مزاحیہ جملے خاص خوبیوں کے حامل ہیں۔

انہوں نے اپنی تحریر میں عورتوں کی زبان، بچوں کی زبان، درباری زبان، کے بہترین نمونوں کے ساتھ ساتھ تلمیحات اور محاوروں کا بہترین استعمال کیا ہے۔

9.9 مزید مطالعہ

1. امتیاز علی تاج کے اسلوب بیان پر مختصر نوٹ لکھئے۔
2. ''چچا چھکن نے تیمارداری کی'' ڈرامہ کی شکل میں ایک مزاحیہ فیچر ہے۔ اس کے کردار اور ان کے کام کے متعلق تھوڑا ذکر کر کے بتائیے کہ ان میں سب سے اچھا کردار آپ کو کون سا لگا۔
3. سبق میں آئے ہوئے محاورات کو جملوں میں استعمال کیجئے۔

متن پر سوالات کے جوابات

9.1 .1 (i) (×)
(ii) (✓)
(iii) (×)
(iv) (×)

.2 (i) (×)
(ii) (✓)
(iii) (×)

.3 (i) (×)
(ii) (×)
(iii) (✓)
(iv) (×)

9.2 .1 (i) (×)
(ii) (×)
(iii) (✓)
(iv) (×)

NOS\NOTE2.tif not found.

10

سرسید احمد خاں

مصنف کا تعارف

سرسید احمد خاں 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان تشریف لائے اور شاہی دربار سے وابستہ ہوکر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں سرسید کے دادا کو ''جوادالدولہ'' کا خطاب دیا گیا۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کے والد میر تقی کو عہدۂ وزارت کی پیشکش کی مگر اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انہوں نے انکار کردیا۔ سرسید کی والدہ نہایت مذہبی، خوش سلیقہ اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اولاد کی تربیت میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ سرسید کی تربیت خالص مشرقی اور مذہبی ماحول میں ہوئی۔ قرآن شریف پڑھنے کے بعد انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور 22 سال کی عمر میں عدالت صدر امینی دہلی کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو اکیاسی برس کی عمر میں رحلت فرمائی اور مسلم یونیورسٹی کی مسجد کے بیرونی حصے میں دفن ہوئے۔

سرسید بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف، ممتاز مفکر، عظیم المرتبت مصلح اور مدبر تھے۔ انہوں نے ملک وقوم کی بیداری کا مشکل فریضہ انجام دیا۔ مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ تاریخ، دینیات اور اخلاقیات ان کے خاص موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مشہور زمانے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں علمی اور فلسفیانہ مضامین لکھے۔ اردو ادب کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ انہوں نے اردو میں علمی نثر کو فروغ دیا۔ تصنع اور مشکل پسندی کو تحریر وتقریر سے دور رکھا اور اپنی ہر بات سادگی اور صفائی کے ساتھ کہتے رہے۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ قوم کی بھلائی کے لیے جو پیغام پہنچانا ہے وہ سادہ اور آسان زبان میں بیان کردیا جائے۔ اسی وجہ سے انہیں جدید اردو نثر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ قوم کی بھلائی میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ اے۔ ایم۔ یو کالج علی گڑھ کا قیام ہے جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ :

- سبق میں پڑھے ہوئے مشکل الفاظ کے معنی سمجھ کر اپنی گفتگو میں استعمال کر سکیں گے؛
- سبق میں پڑھی ہوئی تلمیحات کو سمجھ کر ان کی تشریح کر سکیں گے؛
- امید کی اہمیت کو سمجھ کر زندگی میں اس کی افادیت پر روشنی ڈال سکیں گے۔

10.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

''امید کی خوشی''

(1)

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک! اے آسمان کے تارو تمہاری خوشنما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو! اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے کہ ہم سے بہت دور ہو، اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے! تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں؟ کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہر گز نہیں! اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے۔

رسائی: پہنچ

او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے، تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل سے مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، نیکی کے لیے تیار ہے انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

خوابیدہ: سوتے ہوئے

NOS\NOTE2.tif not found.

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی۔ تو ہی نے اس نا امید کو نا امید ہونے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا تو ہی نے اس کو ذلت سے نکالا اور پھر اس کو اسی اعلیٰ درجے پر پہنچایا جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔ اس نیک نبی کو جس نے برس ہا برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوب صورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا نا خدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ تو ہی طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔

زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

پہلا گنہگار انسان: تلمیح مراد! حضرت آدم علیہ السلام، جنہیں شیطان نے بہکا کر خدا کی حکم عدولی پر تیار کیا اور جنت سے نکلوادیا۔

نیک نبی: (مراد) حضرت ابراہیم علیہ السلام

پہلا نا خدا: (مراد) حضرت نوح علیہ السلام

ناخدا: کشتی کھینچنے والا ملاّح

جودی پہاڑ: پہاڑ کا نام جہاں حضرت نوح کی کشتی رکی تھی

(2)

اے آسمانوں کی روشنی اور اے نا امیدوں کی تسلی امید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے، تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے، تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈھتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانے کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

خوش الحان: دلکش اور اچھی آواز والا

دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارے میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے۔ اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے، سورہ میرے بچے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے، کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے، سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا، تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا آخرکار ہمارے دل کو تسلی دیں گی۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی، تیری آواز ہمارے لیے خوش آیند راگنیاں ہوں گی۔ سورہ میرے بچے سورہ، اے ہماری امیدوں کے پودے سورہ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جائیں گے تو تم کیا کرو گے؟ تم روؤ گے اور ہم کچھ رحم نہ کر سکیں گے۔

خصلت: عادت

لیاقت: قابلیت

اے میرے پیارے رونے والے! تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کرو گے، آہ ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری یاد میں آنسو بہاؤ گے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ، اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کرو گے۔ آہ ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کے تم رنجیدہ ہو گے۔ سورہ میرے بچے سورہ، میرے بالے سورہ۔ یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں۔ جبکہ بچہ

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

غوں غاں بھی نہیں کرسکتا تھا۔مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا اور اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی، آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا، رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا، اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھوکر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل سے، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں۔ اس کے ماں باپ اس معصوم پسر سے سچی ہمدردی دیکھ کر کیسے خوش ہوتے ہیں، او ہماری پیاری امید تو ہی ہے۔ جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

آتش محبت: مامتا کی آگ
ریا: دکھاوا
پسر: بیٹا
مہد: پالنا
لحد: قبر

(3)

دیکھ وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کی ریوڑ میں سے غائب ہوگیا ہے، وہ اس کو ڈھونڈتا ہے۔ پر وہ نہیں ملتا، مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی، لہو بھرا دانتوں پھٹا کرتا دیکھتا ہے، پھر بھی ملنے سے ناامید نہیں۔ فاقوں سے خشک، غم سے زار نزار ہے، روتے روتے آنکھیں سفید ہوگئی ہیں، کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا: تلمیح (مراد) حضرت یعقوب

دیکھ وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہہ خانوں میں بند ہے۔اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دیار باغی قوم و مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے، بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے، عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانے کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس گھر کا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

بے گناہ قیدی: تلمیح (مراد) حضرت یوسف

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے، ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہوکر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے، جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو اور اے بہادری کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے، ان کا کان نقارے سے تیری ہی آواز سنتا ہے۔ وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے، دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ مشکل کے وقت بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔

تقویت: طاقت، ہمت
بگل: قرنا: ایک قسم کا باجا جو منہ سے بجایا جاتا ہے
قومی بھلائی کا پیاسا: مراد! سرسید

NOS\NOTE2.tif not found.

جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو دشمن پاتا ہے، شہری وحشی بتاتے ہیں، دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں، عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند، عزیز و اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو جاتے ہے۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دِوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں۔ مگر ہاں ہاں کر کے محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں پر کوٹھی کٹھلے سے الگ ہو کر دل ہر وقت بے قرار ہے، کسی کو اپنا سا نہیں پاتا، کسی پر دل نہیں ٹھہرتا، مگر اے بے قرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت! تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے، تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے، تیری قوت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچیں گے، تیرے ہی سبب گو ہر مراد کو پاویں گے اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری ''امید''، تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منہ پر مردنی چھا جاتی ہے، ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے، تو تیرے سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہو جاتی ہے۔

اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہو جاتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یاد ہی مددگار رہتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لیے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو صبح کی خوشی سے بدل دیتی ہے، گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوف ناک چیز ہے اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانے کی لہر بھی نہیں پہنچتی، تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے، ایمان کے توشہ اور امید کے ماوی اور موت کی سواری سے مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام ''امید'' ہے۔

(سرسید احمد خان)

توشہ: وہ کھانا جو مسافر ساتھ لے جائے

10.2 متن کی تشریح (پہلا حصہ)

سبق ''امید کی خوشی''، مضمون نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ مضمون میں کسی ایک موضوع کی اہمیت و افادیت پر ٹھوس دلائل کے ساتھ علمی طریقے سے زور دیا جاتا ہے۔ سرسید سے قبل اردو زبان عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے بہت مشکل اور

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

بوجھل ہوگئی تھی۔ سر سید نے اس مشکل رویہ کو ترک کر کے اپنی بات کو سیدھی، صاف اور سادہ زبان میں پیش کیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کی رغبت دلائی۔مضمون نگاری کو اردو کے غیر افسانوی ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔

سبق کے پہلے حصے میں مصنف نے دھنک، ستاروں اور پہاڑ کی اونچی اونچی چوٹیوں وغیرہ کی مثال دے کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو چیزیں ہماری پہنچ سے دور ہوتی ہیں وہ ہمیں اپنے قریب کی چیزوں سے زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ ہماری زندگی میں بھی جو چیزیں بہت دور ہے، وہی ہمیں سب سے زیادہ خوشی دینے والی ہے۔ پھر وہ سوال کرتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے؟ پھر پہیلی بوجھنے کے سے انداز میں ہمیں سے سوال کرتا ہے کہ کیا وہ عقل ہے؟ کیوں کہ عقل ہی کی بنیاد پر انسان کو دنیا کی تمام مخلوق سے افضل مانا گیا ہے۔ پھر خود اس سے انکار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ چیز عقل نہیں ہے کیونکہ عقل تو صرف قدرت کے جلوؤں ہی کو دکھا سکتی ہے۔اس تمہید کے بعد مصنف اصل مطلب کی طرف آتا ہے اور صاف صاف لفظوں میں ہمیں بتاتا ہے کہ وہ چیز جو ہم سے دور تو ہے مگر ہماری زندگی کے مشکل سے مشکل حالات میں ہمیں سہارا دیتی ہے۔اس کا نام ''امید'' ہے۔ امید ہی کی بنیاد پر ہم اپنی پوری زندگی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔اور امید ہی سے قوت اور طاقت لے کر ان منصوبوں کو پورا کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔

آپ نے پڑھا ''تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لیے۔ نام آوری نام آوری کے لیے۔ بہادری بہادری کے لیے۔ فیاضی، فیاضی کے لیے۔محبت، محبت کے لیے۔نیکی، نیکی کے لیے تیار ہے۔'' کیا آپ نے غور کیا کہ مصنف نے تکرار لفظی سے اپنی بات میں کتنا زور پیدا کر دیا ہے۔ یہاں ایک ہی لفظ کو دوبار استعمال کر کے امید کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر امید نہ ہو تو خوشی، خوشی نہ رہے۔ نام آوری بے معنی ہو جائے۔ بہادری کوئی مہم سر نہ کر سکے، فیاضی میں کوئی کشش باقی نہ رہ جائے۔امید ہی محبت کو پروان چڑھاتی ہے اور نیکی پر اکساتی ہے۔اگلے پیراگراف میں آپ نے پڑھا''وہ پہلا گنہگار انسان شیطان کے چنگل میں پھنسا'' تلمیح ہے۔ یہاں پہلا گنہگار انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ یہاں مصنف نے حضرت آدم کا ذکر کر کے پھر امید کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ جب حضرت آدم کو سزا کے طور پر سنسان اور بیاباں دنیا میں اکیلے بھیج دیا گیا تو یہ امید ہی تھی جس کا دامن تھام کر حضرت آدم نے خدا کے حضور میں گریہ وزاری کی اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ یہاں تک کہ خدا نے انہیں معاف کر کے پھر اسی اونچے مقام پر پہنچا دیا یعنی اپنا نبی بنایا۔

اسی پیراگراف میں آپ نے پڑھا''وہ پہلا ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا'' یہاں پھر تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں پہلا ناخدا سے حضرت نوح مراد ہیں۔حضرت نوح کے زمانے میں اتنا بڑا سیلاب آیا تھا جس میں پوری دنیا غرق ہوگئی تھی۔مگر ایسے مشکل وقت میں حضرت نوح صرف اس امید پر اپنی کشتی کھیتے چلے جاتے تھے کہ کبھی نہ کبھی ساحل پر ضرور پہنچ جائیں گے۔اگر ان کے دل میں پکا یقین نہ ہوتا تو ساری دنیا کے ساتھ حضرت نوح بھی اسی سیلاب کی نذر ہو جاتے۔

آپ نے پڑھا۔ ''زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔'' یہاں مصنف نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے جب حضرت نوح اور ان کے ساتھی بھوکے پیاسے سیلاب میں بہے جا رہے تھے، کہ اچانک اندھیرے میں امید کی کرن کی طرح چند کبوتر چونچ میں زیتون کی ٹہنیاں دبائے انہیں نظر آئے اور لوگ خوش ہو گئے۔ کہ اب ہم جلد ہی خشکی پر پہنچ جائیں گے۔

10.3 زبان کے بارے میں

ناخدا کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔ حضرت نوح چونکہ سیلاب میں تنہا کشتی کھیتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اس لیے انہیں ناخدا کہا گیا ہے۔

''نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی امید'' کہہ کر مصنف نے امید کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

متن پر سوالات 10.1

درست جواب پر صحیح کا نشان لگایئے۔

1. سب سے زیادہ خوش کرنے والی چیز سے مصنف کی مراد ہے۔
   (i) عقل
   (ii) امید
   (iii) دور سے خوب صورت نظر آنے والی چیزیں۔

2. ''تیرے ہی سبب ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔'' اس جملے میں کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟
   (i) امید کی روشنی ہماری پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔
   (ii) ہمارے حیوانی جذبات ابھر آتے ہیں۔
   (iii) خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

3. تلمیح ایسی عبارت کو کہتے ہیں جس میں۔
   (i) کسی مشہور واقع یا مشہور شخصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔
   (ii) کوئی استعارہ استعمال کیا گیا ہو۔
   (iii) امید کی فضیلت بیان کی گئی ہو۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

10.4 متن کی تشریح (دوسرا حصہ)

امید کو آسمانوں کی روشنی اور ناامیدوں کی تسلی بتاتے ہوئے مصنف یہ کہتا ہے کہ امید کے سہارے ہی ہر ایک کو اپنی محنت کا پھل ملتا ہے، امید ہی ہر درد کی دوا ہے اور امید ہی ہر غم کو دور کرتی ہے۔

عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکنے والوں سے مصنف کی مراد علمی کام کرنے والوں اور سائنس دانوں سے ہے جو اپنی کوششوں میں جب کہیں لڑکھڑاتے ہیں تو امید ہی انہیں سہارا دیتی ہے اور ناکامی کے چٹیل میدان میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر ان کے تھکے ہارے خیالات میں ایک نئی زندگی اور نئی امنگ پیدا کر دیتی ہے اور وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔

اگلے پیراگراف میں مصنف نے ایک لوری کے سہارے نادان بچے سے وابستہ ماں باپ کی تمام امیدوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مصنف نے ماں باپ کی موجودہ اور مرنے کے بعد کی زندگی اور بچے کی زندگی کے تینوں ادوار کو امید کے رسے سے باندھا ہے۔ اسی پیراگراف کے آخر میں مصنف نے ''اور ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔'' اس سے مصنف کی مراد یہ کہ انسان تمام عمر امید ہی کے بل بوتے پر زندگی کی مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے کڑی محنت کرتا ہے۔

10.5 زبان کے بارے میں

''مہد سے لحد تک'' کے معنی ہیں ''پالنے سے قبر تک''، یعنی پیدائش سے لے کر موت تک جو چیز ہمیں ہر لمحے زندگی کو بھرپور طریقے سے جینے کی امنگ عطا کرتی ہے وہ امید ہے۔

10.2 متن پر سوالات

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے۔

1. وہ کون سی طاقت ہے جو انسان سے مشکل ترین کام انجام دلواتی ہے۔
   (i) عقل مندی
   (ii) دور اندیشی
   (iii) امید

2. ماں باپ اپنی تمام تر خواہشات نادان بچے سے وابستہ کر لیتے ہیں کیونکہ......
   (i) وہ ان کی تمام تر امیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔
   (ii) وہ بھولا بھالا ہوتا ہے۔

(iii) وہ ان کے بس میں ہوتا ہے۔

3. ''مہد سے لحد تک'' سے مراد ہے۔

(i) بڑھاپے کی آخری منزل تک۔

(ii) قبر کے عذاب تک۔

(iii) پالنے سے قبر تک۔

10.6 متن کی تشریح (تیسرا حصہ)

سبق کے اس حصے میں مصنف نے پھر کچھ تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ آپ نے پڑھا۔ ''دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں غائب ہو گیا ہے۔''

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ''وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا'' سے مصنف کی مراد حضرت یعقوب سے ہے۔ حضرت یوسف کے گم ہو جانے کے غم میں روتے روتے ان کی آنکھوں کی پتلیاں بہہ گئیں تھیں جسے مصنف نے ''آنکھیں سفید ہو گئی'' کہا ہے۔ غم واندوہ کی اس انتہائی کیفیت کے باوجود حضرت یعقوب کے دل کے کسی کونے میں یہ امید پھر بھی باقی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ کبھی نہ کبھی میرا بیٹا مجھ سے مل ہی جائے۔
اگلے پیراگراف میں آپ نے پڑھا۔ ''دیکھو وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنویں میں سات تہہ خانوں میں بند ہے۔'' یہ بھی تلمیح ہے۔ ''بے گناہ قیدی'' سے حضرت یوسف مراد ہیں۔ جنہیں ان کے سوتیلے بھائیوں نے کنویں میں دھکیل دیا تھا جنگل کے اس اندھیرے کنویں میں انہیں بہت ڈر لگ رہا تھا۔ مگر یہ امید ہی تھی جس نے انہیں ڈر کے مارے مرنے سے بچا لیا کہ شاید کبھی کوئی قافلہ ادھر آنکلے اور مجھے کنویں سے باہر نکال لے۔

اسی پیراگراف میں ''بہادروں کی قوت بازو'' اور ''بہادری کی ماں'' امید کو کہا گیا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ سپاہیوں میں ایسی بہادری کیسے پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جنگ کے میدان میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ سب امید کی قوت ہی ہے جو ان کے اندر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔
اس کے بعد مصنف نے سبق میں اپنا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو پستی سے نکالنے کے لیے جی جان سے محنت کی مگر ان کی قوم ایسی ناسمجھ اور نادان تھی کہ بھلائی کے کاموں میں ان کی مدد کرنے کے بجائے انہیں کبھی دیوانہ کہتی تھی کبھی کافر ٹھہراتی تھی۔ سرسید کے عزیز و اقارب انہیں سمجھاتے تھے کہ تم کن جاہلوں کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر وہ اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں اتنا برا بھلا کہا جاتا تھا کہ کبھی کبھی وہ خود بھی ہمت ہار بیٹھتے تھے مگر ایسے نازک وقت میں امید ہی انہیں سہارا

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO not found.

دیتی تھی اور ان کی ہمت بندھاتی تھی کہ ایک نہ ایک دن میری یہ نا سمجھ قوم میرے نیک جذبات کو ضرور سمجھ لے گی اور میرے مشوروں پر عمل کرے گی۔

سبق کے آخری حصے میں مصنف نے انسانی زندگی کے آخری دور کے سب سے مشکل وقت یعنی موت کو بھی امید کے سہارے آسان کر دکھایا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ جب انسان کے اوپر جاں کنی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اس کا سب سے مشکل وقت ہوتا ہے۔ مگر اس وقت بھی انسان اس یقین اور بھروسے سے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے کہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے وہ مجھے بھی بخش دے گا۔ اور یہی امید اور یقین اس کے اس کڑے وقت کو آسان کر دیتی ہے۔

سرسید نے اس سبق کے شروع میں امید کو ''نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی'' اور سبق کے آخر میں امید کو ایمان کی خوب صورت بیٹی'' کہہ کر امید کی فضیلت بیان کی ہے۔

10.7 زبان کے بارے میں

''قومی بھلائی کا پیاسا'' سے مراد خود سرسید ہیں۔

1857ء کے غدر کے بعد سرسید نے نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے تعلیمی اور اصلاحی کوششیں شروع کیں جو سرسید تحریک کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی اور سائنس کے تعلیم حاصل کریں اور انگریزی حکومت کے سہارے اپنی زندگی کو سدھاریں اور سنواریں۔ جب کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں سے نفرت کرتا تھا اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو دین کے خلاف سمجھتا تھا۔ سرسید نے جس قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا وہی قوم ان کی اصلاحی کوششوں میں رکاوٹیں پیدا کر رہی تھی۔ انہیں دیوانہ اور کافر تک گردانا گیا۔ مگر وہ قوم کی بھلائی کے کاموں میں لگے رہے اور اس کے لیے علی گڑھ میں محمڈن انگلو اورینٹل کالج کھولا جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ سرسید کی اس تحریک نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

''تیری راہ'' سے مصنف کی مراد مرنے کے بعد کی زندگی یعنی دوسری دنیا سے ہے۔

''ایمان کا توشہ'' سے مصنف کی مراد یہاں پختہ ایمان ہے۔

''امید کا ماوی'' سے امید کی روشنی ہے۔

''موت کی سواری'' سے جان کنی کی حالت مراد ہے۔

''ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے'' سے مصنف کی مراد یہ ہے کہ انسان چار چیزوں یعنی آب، باد، خاک اور آتش یعنی ہوا، پانی، مٹی اور آگ سے مل کر بنا ہے۔ مرنے کے بعد یہ چاروں چیزیں انہیں چیزوں میں مل جاتی ہیں۔ اس بات کو چکبست نے اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب

NOS\NOTE2.tif not found.

موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا۔

متن پر سوالات 10.3

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے:

1. ''دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا گھر میں بیٹھا روتا ہے۔''میں بڈھے سے مراد ہے۔
   (i) حضرت یوسف
   (ii) حضرت نوح
   (iii) حضرت یعقوب
2. ''وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں۔ بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں۔''میں سرسید کو دیوانہ کہنے سے مصنف کی مراد ہے۔
   (i) سرسید قوم کے غم میں پاگل ہو گئے تھے۔
   (ii) سرسید رشتہ داروں کے سمجھانے کے باوجود دیوانوں کی طرح قوم کی بھلائی کے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔
   (iii) سرسید بہت ضدی تھے اور کسی کی بات نہیں مانتے تھے۔
3. ''ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، ہوا ہوا میں، مٹی مٹی میں، پانی پانی میں ملنے کو ہوتی ہے۔''اس جملے سے مصنف کی مراد ہے۔
   (i) آب، باد، خاک، نور۔
   (ii) آگ، خاک، باد، برف۔
   (iii) آب، باد، خاک، آتش۔

10.8 اسلوب بیان

سرسید سے قبل اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے اردو زبان بہت مشکل اور پیچیدہ ہو گئی تھی۔ سرسید کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے اردو میں ایک نئی طرح کی علمی نثر کا رواج شروع ہوا۔ جو تصنع اور مشکل پسندی سے پاک تھا۔ سرسید اپنی سادگی۔ صفائی اور بے تکلفی سے کہتے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ قوم کی بھلائی کے لیے جو پیغام پہنچانا ہے وہ سادہ اور آسان زبان میں بیان کر دیا جائے۔ اور لمبی لمبی تحریروں کے بجائے مفید صفحات میں کام کی بات کہہ دی جائے۔

سرسید کا ذہن ایک عمل پسند کا ذہن تھا جسے ادبی حسن سے زیادہ ٹھوس حقائق، زور بیان اور سادہ طرز اظہار عزیز تھا۔ اس لیے ان کی نثر ایک الگ اسلوب اور وزن رکھتی ہے۔ ان کا یہ اسلوب پڑھتے ہوئے سائنسی میدان اور عقلی رجحان سے ہم آہنگ ہو گیا اور کسی نہ کسی شکل میں آج بھی اردو نثر کا اسلوب ہے۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

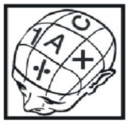

آپ نے کیا سیکھا؟

مضمون نگاری، غیر افسانوی ادب کی ایک صنف ہے۔ مضمون نگاری میں کسی ایک موضوع پر معروضی طریقے سے بحث کی جاتی ہے۔ جس میں معلومات اور سنجیدہ دلائل پر سارا زور ہوتا ہے۔ مضمون عام طور پر علمی انداز لیے ہوئے ہوتا ہے۔

- اس سبق میں سرسید نے مختلف مثالوں کے ذریعے امید کی اہمیت وافادیت بیان کی ہے۔
- سبق میں بہت سی تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔
- انسان امید کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے اور پیدائش سے لے کر موت تک امید کے سہارے ہی مشکل حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔
- امید انسان کے جینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے اور اسے زندگی میں مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔
- ترقی کی ساری منزلیں امید کے سہارے ہی طے ہوتی رہی ہیں۔
- امید ہی نے سائنس دانوں کو نئی نئی ایجادات کے لیے اکسایا ہے۔ جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ بخشا ہے۔
- نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی اور ایمان کی خوب صورت بیٹی کہہ کر مصنف نے امید کی فضیلت بیان کی ہے۔
- سرسید کا یہ مضمون ان کی صاف، سادہ اور سنجیدہ تحریر کا نمونہ ہے۔

10.9 اختتامی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی میں لکھیے۔

1. اس سبق میں مصنف نے کس چیز کی اہمیت وافادیت پر زور دیا ہے۔ مختصر لکھئے۔
2. سبق میں کون کون سی تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھئے۔
3. مصنف نے یقین کی اکلوتی بیٹی اور ایمان کی خوب صورت بیٹی کسے کہا ہے؟ وہ انسان کو کہاں کہاں سہارا دیتی ہے؟
4. ''ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے۔'' اس جملے کی تشریح کیجیے۔
5. سرسید کے اسلوب بیان پر روشنی ڈالئے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

11

نظم کا ارتقاء

تاریخ

اردو شاعری کی عمر تقریباً سات سو سال ہے اور اردو کے پہلے قابل ذکر شاعر امیر خسرو ہیں۔ حضرت امیر خسرو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ اردو شاعری میں امیر خسرو نے ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا کہ ایک مصرع فارسی لکھا اور ایک اردو، دوسرا یہ کہ آدھا مصرعہ فارسی کا اور آدھا اردو کا لکھا۔ تیسرا طریقہ یہ کہ دونوں مصرع اردو کے لائے۔ بہت سی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، بابل اور پنگھٹ کے گیت ان سے منسوب ہیں۔

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے
بھائیوں کو دینو محل دو محلے ہم کو دیا پردیس.................. لکھی بابل مورے

وقت گزرتا گیا اور اردو زبان اپنا راستہ تلاش کرتی ہوئی عادل شاہی دور تک پہنچ گئی۔ بیجاپور میں عادل شاہی دور کی تخلیقی سرگرمیوں میں فن تعمیر، خطاطی اور شعر و ادب کو خاص اہمیت حاصل تھی لیکن سب سے زیادہ اہمیت شاعری کو حاصل ہوئی۔ شاعری ہر قسم کے خیالات و جذبات کے اظہار کا سب سے مقبول وسیلہ تھی۔ اس رجحان کے سبب شاعری اپنے دامن میں ہر قسم کے موضوعات سمیٹنے لگی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب 'نورس' اس کے ذوق شاعری اور ذوق موسیقی کا اظہار ہے۔ 'کتاب نورس' میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق الگ الگ گیت ترتیب دیئے گئے ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علم پروری کی وجہ سے دکنی 'زبان' نے خوب ترقی کی اور اسی زمانے میں ''عبدل'' نے ''ابراہیم نامہ'' کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی جس میں ابراہیم کی ذات و صفات کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔

NOS\NOTE1.tif not found.

محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی دونوں ہی ادب دوست تھے۔ دونوں ہی شاعر تھے اور ایسا تہذیبی ماحول پیدا کرنے کے خواہش مند تھے جہاں اہل قلم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ محمد قلی قطب شاہ کا دور فنی اور تخلیقی کاموں کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ قطب شاہی سلطنت کے اس زریں دور پر اردو اور تلنگی شاعری کی تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ اسی دور سلطنت میں شہر حیدرآباد بسا۔

محمد قلی قطب شاہ پُرگو اور اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اس سے پہلے بھی شعراء کا کلام ملتا ہے مگر ان میں سے کسی نے اپنا دیوان باعتبار حروف تہجی ترتیب نہیں دیا تھا۔ اس کا اردو دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ اس میں اس نے زندگی کی ہر چھوٹی بڑی، اہم اور غیر اہم بات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس کی کلیات میں نظمیں بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ وجہی کی قطب مشتری اردو کی قدیم ترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ قطب مشتری محمد قلی قطب شاہ اور مشتری کے عشق کی داستان ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام قطب مشتری رکھا گیا ہے۔ یہ مشتری وہی ہے جو بھاگ متی کے نام سے مشہور تھی۔

ولؔی دکنی تک آتے آتے اردو شاعری کی روایت تین سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہوگئی تھی۔ دکنی ادب میں مثنویات، غزلیات اور قصائد کا ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود تھا۔ ولؔی ایک باشعور شاعر تھا۔ اس نے ریختہ کے مزاج کے مطابق فارسی اور عربی سے مناسب بحریں تلاش کیں اور انہیں اردو کے قالب میں ڈھال دیا اور ساتھ ہی انتخاب الفاظ سے اردو شاعری کا مزاج مقرر کیا۔

دکن سے جب غزل شمالی ہندوستان پہنچی تو اسے سجانے سنوارنے کے لیے بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ آبرؔو، یگانؔہ، حاتؔم، شاہ مبارکؔ، میر تقی میرؔ وغیرہ۔ غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی لکھی جارہی تھیں۔ شاہ مبارک کی نظمیں نگم بودھ گھاٹ اور میلا قابل ذکر ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ نظم کے بارے میں کچھ بات کرلیں۔ شاعری کا وہ حصہ جو غزل کے زمرے میں نہیں آتا نظم کہلاتا ہے۔ نظم میں بہت سی اصناف ہیں مثلاً مثنوی، قصیدہ، مسدّس، مخمّس، نظم معریٰ آزاد نظم وغیرہ۔

جدید دور کے شعراء نے مثنوی کی صنف کو خوب استعمال کیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی کی مثنوی 'حبّ وطن' موضوعات کے اعتبار سے ایک اضافہ ہے۔

حالی کے بعد اقبال کے یہاں مثنوی کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ ان کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' مثنوی کی ہی صنف ہے۔ بیانیہ شاعری کے لیے مثنوی کی صنف سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی اقبالؔ کے بعد آنے والے شاعروں میں جوشؔ نے اس صنف کو نئی عظمت بخشی ہے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

اردو نظم کی ایک بہت مشکل اور طاقتور صنف قصیدہ ہے۔قصیدہ عموماً کسی کی تعریف میں لکھا جاتا ہے۔
نظم کی یہ صنف 'مسدّ س' بہت مشہور ہوئی ہے۔اس میں ہر بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیے مسدّس کے بہترین نمونے ہیں۔

پہلے تیروں سے کمان داروں نے چھاتی چھانی
نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی
سر پہ تلواریں چلیں، زخمی ہوئی پیشانی
خون سے تر ہوگیا حضرت کا رخ نورانی
جسم سب چور تھا پرزے تھے زرہ جامے کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

مولانا الطاف حسین حالیؔ کی نظم ''مدوجزر اسلام' مسدّس کی ہی شکل میں ہے اور اسے عام طور پر ''مسدّس حالی کہا جاتا ہے۔
پنڈت برج نارائن چکبستؔ کی نظم ''رامائن کا ایک سین' مسدّس کی ہی مثال ہے۔
مخمس میں پانچ مصرعوں کا ایک بند ہوتا ہے۔نظیر اکبر آبادی کی نظم آدمی نامہ اس کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیہ نہ ہو نظم معرّا کہلاتی ہے شروع میں اسے نظم غیر مقفّی یا بے قافیہ نظم کہا جاتا تھا۔کچھ لوگوں نے اسے نظم عاری بھی کہا ہے۔آج کل اسے نظم معرّا ہی کہا جاتا ہے۔فیض احمد فیضؔ کی یہ نظم، نظم معرّا ہے۔

پھر کوئی آیا دل راز، نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی گئی ہو اور نہ بحر کے استعمال میں مروجہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، یعنی جس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوں آزاد نظم کہلاتی ہے۔آزاد نظم میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوسکتے ہیں۔قافیے کی پابندی بھی نہیں، لیکن وزن ضروری ہے۔مثال کے طور پر مخدوم محی الدین کی نظم ''چاند تاروں کا بن''۔

NOS\NOTE1.tif not found.

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کی تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر............
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مردوزن............
....

نظم معرّا اور آزاد نظم کو فروغ دینے والے اہم شعراء میؔراجی، ن۔م۔راشدؔ، فیض احمد فیضؔ اور اختر الایماؔن وغیرہ ہیں۔آج کل ہر قابل ذکر شاعر اس صنف میں طبع آزمائی کرتا ہے۔آج کے نظم گو شعراء میں سردار علی جعفری، ساغؔر نظامی، کیفی اعظمی، بلراج کوملؔ وغیرہ کے مجموعے اٹھا کے دیکھیے تو آزاد نظم کے نمونے زیادہ ملیں گے۔ان کے بعد کے شعراء میں شہریار، ندا فاضلی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

طویل نظم کی روایت اردو شاعری میں بہت پرانی ہے اور اس کی مثالیں ہیں ہماری مثنویاں اور مرثیے۔جن میں ایک ہی موضوع پر طویل بیان ملتا ہے لیکن جدید طویل نظم مثنویوں اور مرثیوں سے مختلف ہے۔آج طویل نظم کا شاعر ایک ہی نظم میں موضوع کے اتار چڑھاؤ کے اعتبار سے ایک سے زیادہ بحریں اور اصناف استعمال کرتا ہے۔علی سردار جعفرؔی کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام' اس کی ایک اچھی مثال ہے۔

طویل نظم ریاضت چاہتی ہے اس لیے اس صنف کی طرف کم شعراء توجہ دیتے ہیں۔
سانیٹ انگریزی سے مستعار لی گئی ہے چوتھی اور پانچویں دہائی میں اس کا چلن خوب تھا پوری نظم میں ۱۴ (چودہ) مصرعے ہوتے ہیں۔اس کے شروع کے تین بند چار چار مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں جس میں پہلا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ اور دوسرا تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

''ہائکو' یہ جاپانی شاعری کی صنف سخن ہے۔اردو والوں نے اسے اپنانے کی کوشش کی مگر یہ صنف زیادہ مقبول نہ ہوسکی، اس میں کل تین مصرعے ہوتے ہیں پہلا اور تیسرا ہم قافیہ ہوتا ہے۔

اس جائزے سے ہمیں معلوم ہوا کہ اردو نظم کا دامن بہت مالا مال ہے اور نظم کا سفر جاری ہے نظم گو شعراء کی نئی نسل آرہی ہے اور

NOS\NOTE2.tif not found.

نئے نئے تجربے کر رہی ہے اور اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں بیسویں صدی نظم کی صدی ہے۔

اقبالؔ کے بعد نظم گو شعراء کا ایک بڑا قافلہ نظر آتا ہے جن میں مولانا اسمٰعیلؔ میرٹھی، تلوک چند محرومؔ، پنڈت برج نارائن چکبستؔ، اکبرالہٰ آبادی کے نام سرفہرست ہیں اور ایک نمایاں نام اردو کے بڑے شاعر جوشؔ ملیح آبادی کا ہے۔ جس نے نظم گوئی کو عام کیا ان کے ہم قدم ہم جن شعراء کو دیکھتے ہیں وہ ہیں فراق گورکھپوری، سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، اور روش صدیقی وغیرہ۔

اس کے بعد زمانہ آتا ہے ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کا جب موضوع اور ہیئت کے بے پناہ تجربے ہوئے اور اردو نظم کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ یہاں اس شاعر کا نام لینا ضروری ہے جو غزل گوئی کے عروج کے دور میں پیدا ہوا لیکن جس نے عوامی موضوعات پر اس قدر نظمیں کہیں کہ وہ خود اپنے آپ میں ایک تحریک ہے۔ وہ ہے نظیرا کبرآبادی' آدمی' روٹی، عید، بنجارہ وغیرہ ان کی اہم نظمیں ہیں۔

جو صفات نظیرا کبرآبادی کی شاعری میں تھیں یعنی عوام کا دکھ درد، اور ان کی جدوجہد۔ اس کو وقت کے نئے پیمانے میں ڈھال کر جدید انداز سے ترقی پسند تحریک نے پیش کیا۔ ترقی پسند شاعری نے عوامی مسائل کے علاوہ ملک کی آزادی کی جدوجہد اور عالمی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا اور اس طرح بیداری کی ایک نئی لہر آئی، اور ترقی پسند شعراء کا قافلہ ایک طے شدہ پروگرام کو ذہن میں رکھ کر آگے بڑھا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی، اور وہ سب شعراء جو اپنے اپنے طور پر وطنی اور انقلابی شاعری کر رہے تھے ایک پرچم تلے جمع ہو گئے۔
اس تحریک نے خاص طور پر نظم گوئی اور مقصدیت پر زور دیا، مجازؔ، جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ، ساحرؔ لدھیانوی، مخدومؔ محی الدین، فیض احمد فیضؔ، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، نیاز حیدرؔ، وامقؔ جونپوری، احمد ندیم قاسمی، وغیرہ سرفہرست ہیں ان لوگوں نے اردو نظم کے موضوع اور ہیئت کے نئے نئے تجربے کیے اور رفتہ رفتہ اردو نظم کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

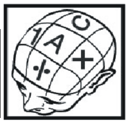

آپ نے کیا سیکھا

اردو شاعری کی عمر تقریباً سات سو سال ہے۔

اردو کے پہلے قابل ذکر شاعر امیر خسرو ہیں۔ انہوں نے بہت سی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور لوک گیت لکھے۔ محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علم پروری کی وجہ سے دکنی زبان نے خوب ترقی کی اور اسی زمانے میں ابراہیم نامہ کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی گئی۔

شمالی ہندوستان میں ولی دکنی کے اثر سے جدید دور کے شعراء نے مثنوی کی صنف کو خوب استعمال کیا ہے۔ حالیؔ کی حب الوطنی

NOS\NOTE1.tif not found.

اور اقبال کا ساقی نامہ اس کی مثالیں ہیں۔

انیسؔ اور دبیرؔ نے مسدّس کی شکل میں مرثیے لکھے۔

نظیر اکبر آبادی کی نظم 'آدمی نامہ' مخمس کی خوب صورت مثال ہے۔

جس نظم کے تمام مصرعے برابر ہوں مگر ان میں قافیہ ہو نظم کہلاتی ہے۔

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی ہو اور نہ بحر کی۔ جس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوں آزاد نظم کہلاتی ہے۔ لیکن ان نظموں میں وزن ضروری ہے۔

اقبالؔ، اسماعیل میرٹھی، تلوک چند محرومؔ، چکبستؔ، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ، سیمابؔ، ساغر نظامی اور روش صدیقی نے جدید دور میں نظم گوئی کو عام کیا۔

ترقی پسند تحریک کے زمانے میں موضوع اور ہیئت میں بہت تجربے ہوئے۔ عوامی مسائل کے علاوہ ملک کی آزادی اور عالمی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔

اختتامی سوالات 11.3

1. امیر خسروؔ کی شہرت کے اسباب لکھئے۔
2. دکن میں میں اردو شاعری کی ترقی کس دور میں ہوئی؟
3. شمالی ہند میں اردو شاعری کا چلن کب شروع ہوا؟
4. مولانا حالیؔ 'حب الوطنی، اور اقبالؔ کا 'ساقی نامہ' کو نظم کی کس صنف میں رکھا جا سکتا ہے؟
5. انیسؔ اور دبیرؔ کی کی شہرت کی وجوہ بتایئے۔
6. نظم معرّا کی تعریف کیجئے۔
7. آزاد نظم کسے کہتے ہیں؟
8. چند نظم گو شاعروں کے نام لکھئے۔
9. ترقی پسند تحریک نے نظم گوئی میں کیا نئے تجربے کئے؟

12

اکبرالہ آبادی

شاعر کا تعارف

اکبرالہ آبادی کا پورانام سید اکبر حسین رضوی تھا۔ 16/نومبر 1846 کو بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد تفضّل حسین سے حاصل کی۔اس کے بعد پہلے مکتب پھر جمنا مشن اسکول میں داخل ہوئے۔لیکن 1857 کے انقلاب کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔1866 میں مختاری کا امتحان پاس کیا اور کچھ مدت کے بعد الہ آباد میں نائب تحصیل دار ہو گئے۔اس کے بعد ترقی کرتے کرتے پہلے منصف اور پھر سیشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔گونمنٹ نے خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔1903 میں آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا۔اکبر کی زندگی کا آخری دور ذہنی وجسمانی پریشانیوں میں گزرا۔1921 میں 75 سال کی عمر میں انتقال کیا۔

اکبرالہ آبادی کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔انہوں نے شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی،مگر ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری ان کی دائمی شہرت کا باعث بنی۔اکبر کا ظریفانہ کلام صرف ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ نہیں بلکہ انہوں نے اسے اصلاح قوم کے ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ انگریزی تعلیم کے منفی اثرات اور انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید پر بھر پور وار کئے،اور اپنی چھوٹی چھوٹی نظموں سے وہ کام لیا جو بڑی بڑی تقریروں سے نہ لیا جا سکتا تھا۔نئی نسل کی مذہبی اور تہذیبی روایات سے بے گانگی،نوجوانوں کی بے راہ روی،عورتوں کی نام نہاد آزادی خاص طور سے اکبر کے طنز کا نشانہ بنی۔انہوں نے معاشرے کی خرابیوں کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا۔وہ معمولی اور ظاہری بھدّے الفاظ کو نہایت دلآویز انداز میں استعمال کرتے تھے۔ان کے یہاں شیخ،بدھو،کلّو،جمن،اونٹ،ٹٹو اور گائے وغیرہ کا ذکر نئے انداز میں ملتا ہے۔اسی طرح اکبر نے انگریزی الفاظ سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اکبر سرسیّد کی خدمات کے قائل تھے لیکن ان

NOS\NOTE1.tif not found.

کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔اسی لئے انہوں نے اکثر ان کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے۔کلام میں جا بہ جا ملا کر لکھنا،لفظ 'سید' کا استعمال اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اکبر کا کلام ''کلیات اکبر'' کے نام سے تین حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔

نظم ''نئی تہذیب'' ایک طنزیہ نظم ہے۔زمانے کے رخ کو دیکھ کر شاعر نے پیشن گوئی کی تھی کہ آنے والی نسل انگریزی تہذیب کی چمک دمک کو دیکھ کر اس کی تقلید کرے گی۔اور اپنا تمدن بھول کر اپنی شناخت کھو دے گی۔اور شاعر کی باتیں بڑی حد تک سچ ثابت ہو رہی ہیں۔

مقاصد

اس نظم کے پڑھنے کے بعد آپ:

- اشعار کی تشریح وتحسین کر سکیں گے؛
- نظم کا مفہوم بیان کر سکیں گے؛
- شاعر کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گے؛
- دوسرے شعراء کے کلام میں صنعت رعایت لفظی اور صنعت تضاد کو پہچان لیں گے؛
- طنزیہ ومزاحیہ نظموں سے لطف اندوز ہوں گے؛
- اکبر الہ آبادی کے انداز بیان پر اظہار خیال کر سکیں گے۔

12.1 اصل سبق

آیئے پوری نظم پڑھتے ہیں۔

''نئی تہذیب''

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسین اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں،نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

راہی ملک عدم: چلا جانا
بہم: مہیا
گیسو: بال
خم: ٹیڑھا پن، پیچ دار، جھکاؤ
حاجب: آڑ، پردہ
روئے صنم: محبوب کا چہرہ

NOS\NOTE2.tif not found.

بہت ہوں گے مغنّی نغمہ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال وسم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں' وہ سب سے کم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگی نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر وبم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

مغنی: گانے والا
تقلید: پیروی،نقل
بے تال وسم: بے سُرے
بھاکا: بھاشا/زبان
لغات: جمع لغت
تغیر: تبدیلی
حِس: احساس
دہر: زمانہ

12.2 متن کی تشریح

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئی نسل کو انگریزی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کرتے دیکھ کر شاعر کہتا ہے کہ بہت جلد ہندوستانی تہذیب ختم ہو جائے گی۔ یہاں کے لوگ اپنے رسم ورواج اور طور طریقوں کو چھوڑ کر انگریزی رہن سہن اور طور طریقوں کو اپنا لیں گے۔ آنے والے زمانے میں ہمارے تہذیب وتمدن کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ اور ہر طرف مغربیت چھا جائے گی۔ لوگ بے سوچے سمجھے انگریزی تہذیب کی تقلید میں اپنے رہن سہن اور اپنے رسم ورواج کو بدل ڈالیں گے۔

12.3 زبان کے بارے میں

'ملک عدم' کے معنی ہیں وہ جگہ جہاں لوگ مرنے کے بعد جاتے ہیں۔ یہاں 'راہی ملک عدم' کا مفہوم ہے کہ موجودہ طور طریقے اور رسم ورواج ختم ہو جائیں گے۔

12.4 متن کی تشریح

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسین اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

NOS\NOTE1.tif not found.

شاعر کہتا ہے کہ جب ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی طور طریقے ہی بدل جائیں گے تو خوبصورتی کا معیار بھی بدل جائے گا۔ انگریزی تہذیب میں شرم وحیا اور لمبے بالوں کو دقیانوسی چیزیں کہتے ہیں اور ایسی عورتوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہماری تہذیب میں شرم وحیا عورت کا زیور ہے اور لمبی کالی زلفیں عورت کی خوبصورتی کی علامت ہیں۔ لیکن مغرب کی تقلید میں یہ سب چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ ہمارے موجودہ طریقوں میں بہت کم فرق رہ گیا ہے۔

12.5 زبان کے بارے میں

دوسرے مصرعے میں 'پیچ وخم' اور 'زلف اور گیسو' الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ ایسے الفاظ کو مترادف الفاظ کہتے ہیں۔

متن پر سوالات 12.1

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

1. راہی ملک عدم ہو جانے سے شاعر کی مراد ہے۔
   (i) گھر سے چلا جانا
   (ii) ختم ہو جانا
   (iii) دوسرے ملک میں چلے جانا۔
2. مترادف الفاظ کون سے ہیں؟
   (i) شکست خوردہ۔
   (ii) زلف اور گیسو۔
   (iii) خس وخاک
3. خالی جگہ کو پُر کیجئے۔

   یہ موجودہ طریقے.......................ہوں گے
   (i) نئی تہذیب ساماں بہم۔
   (ii) پیچ وخم۔
   (iii) راہی ملک عدم۔

12.6 متن کی تشریح

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

شاعر جس تہذیب کی آمد کا ذکر کر رہا ہے اس کی ایک خصوصیت یہ بھی بتا رہا ہے کہ اس تہذیب میں عورتیں بے پردہ ہو جائیں گی۔اور گھونگھٹ یا نقاب وغیرہ کی قید سے آزاد ہو جائیں گی۔چنانچہ عاشق اپنے محبوب کو بے روک ٹوک دیکھ سکیں گے۔

12.7 متن کی تشریح

بہت ہوں گے مغنّی نغمہ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال وسم ہوں گے

شاعر کہتا ہے کہ آج کی نوجوان نسل بے سوچے سمجھے مغربی تہذیب کی نقل کر رہی ہے،اور تیزی کے ساتھ یہ تہذیب ان کے دل ودماغ پر چھاتی جارہی ہے۔اسی کا اثر ہے کہ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی موسیقی اور بے سُرے گانے ہر طرف سنائی دینے لگے ہیں۔نوجوان نسل بھی ہندوستانی موسیقی کو بھول کر بے سر اور تال والی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگی ہے۔اور مغربی انداز والے گلوکاروں کو پسند کرنے لگی ہے۔

12.8 زبان کے بارے میں

’تال وسم‘ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے اس کے معنی سُر اور تال کے ہیں۔

12.2 متن پر سوالات

درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے۔

1. مغنی کا مترادف لفظ ہے۔
   (i) گلوکار۔
   (ii) اداکار۔
   (iii) کلاکار۔

2. شاعر کے نزدیک مغربی نغمے کیسے ہوں گے؟
   (i) بے ہنگم۔

NOS\NOTE1.tif not found.

(ii) مترنم۔

(iii) بے تال وسم۔

12.9 متن کی تشریح

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

شاعر کہتا ہے کہ انگریزی تہذیب کی نقل میں لوگ اپنی زبان کی خوب صورت اصطلاحوں کو بھول جائیں گے اور ان کی زبان پر انگریزالفاظ چڑھ جائیں گے۔اور لوگ انگریز زبان میں بات کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔اور اگر پوری طرح انگریزی نہیں بول پائیں گے تو اردو اور انگریزی ملا کر کھچڑی زبان میں بات چیت کرنے لگیں گے۔یعنی نہ وہ اپنی زبان ہی سے پوری طرح واقف ہوں گے نہ پوری طرح انگریزی ہی بول پائیں گے۔مگر انہیں اس بات کا افسوس بھی نہیں ہوگا۔

12.10 متن کی تشریح

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھا جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

شاعر کہتا ہے کہ آنے والے زمانے میں رہن سہن،طور طریقے اور زبان ہی نہیں بدلے گی بلکہ شرافت کا معیار بھی بدل جائے گا۔مثلاً سچائی،اخلاص،ایثار،ہمدردی اور محبت جیسی خوبیاں جو ہمارے سماج میں شرافت کی علامت سمجھی جاتی ہیں آنے والے زمانے میں لوگ ان خوبیوں کو بھلا دیں گے اور مغرب کے لوگوں کی طرح صرف اپنے فائدے اور نقصان سے تعلق رکھیں گے۔اور آج جن لوگوں کی شرافت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔جن کی زندگیوں کو قابل تقلید سمجھا جاتا ہے۔کل ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوگی۔

متن پر سوالات 12.3

درست جواب (✓) کا نشان لگائیے۔

1. شاعر نے لغات مغربی کسے کہا ہے؟

(i) انگریزی لغت کو۔

(ii) عربی الفاظ کو۔

(iii) مغربی زبان کو۔

2. ''لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے'' کا مطلب ہے۔

(i) صرف اردو زبان۔

(ii) صرف انگریزی زبان۔

(ii) اردو اور انگریزی ملی ہوئی کھچڑی زبان۔

3. ''زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے'' سے کیا مطلب ہے؟

(i) نیک اور شریف لوگوں کی عزت واحترام مں اضافہ ہوجائے گا۔

(ii) شریف لوگوں کی قدر ومنزلت میں کمی ہوجائے گی۔

(iii) شریف لوگوں کی تعداد کم ہوجائے گی۔

12.11 متن کی تشریح

کسی کو اس تغیر کا نہ حِس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیرو بم ہوں گے

شاعر کہتا ہے کہ انگریزی تہذیب ہمارے سماج میں اور عام لوگوں میں اس طرح سرایت کر جائے گی کہ اس بات کا احساس تک نہیں ہوگا کہ ہم کیسی کیسی بیش قیمت قدروں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تو جب سے آنکھیں کھولیں ہیں یہی ساری چیزیں دیکھی ہیں۔ انہیں ہندوستان تہذیب کے بارے میں کسی نے بتایا ہی نہیں ہے۔ اپنے گھروں میں انہوں نے انگریزی تہذیب دیکھی ہے۔ لہذا وہی باتیں ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی ہیں۔

12.12 متن کی تشریح

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

نظم کے آخر میں شاعر کہتا ہے کہ یہ انقلاب تو رونما ہوں گے۔ سماج میں یہ تبدیلیاں ضرور ہوں گی۔ اس لئے ان پر افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب تو نئی نسل کو یہ سب تبدیلیاں دیکھنا اور ان کے ساتھ جینا ہے۔ کیونکہ وہ وقت دور نہیں ہے جب ان تبدیلیوں کو دیکھنے اور ان پر کڑھنے کے لئے ہم اور تم زندہ ہی نہیں رہیں گے۔

NOS\NOTE1.tif not found.

12.13 زبان کے بارے میں

''زیروبم'' موسیقی کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں سُر کا اتار چڑھاؤ۔

12.4 متن پر سوالات

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

1. لوگوں کو تبدیلی کا احساس کیوں نہیں ہوگا؟
   (i) وہ تبدیلی کو پسند کرتے ہیں۔
   (ii) انہیں تبدیلی کا احساس ہی نہیں ہوگا کیونکہ انہوں نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں۔
   (iii) تبدیلی واقع ہی نہیں ہوگی۔

2. خالی جگہ پُر کیجئے۔
   تمھیں اس انقلاب............کا کیا غم ہے اے اکبؔر
   (i) زمانہ
   (ii) وقت
   (iii) دہر

12.14 اندازِ بیان

طنز و مزاحیہ شاعری میں اکبر الہ آبادی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اکبر کی شاعری بڑی دلچسپ ہے۔ وہ سماج کی خرابیوں کو دلچسپ انداز میں ابھارتے ہیں۔ وہ معمولی اور بظاہر بھدّے الفاظ کو خوب صورت اور فن کارانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ اکبر انگریزی الفاظ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں بامعنی انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان بہت دلکش ہے جو پڑھنے والوں کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔

آپ نے کیا سیکھا؟

☆ اکبر الہ آبادی طنزیہ و مزاحیہ شاعر ہیں۔

☆ اکبؔر کی یہ نظم طنزیہ ہے۔

☆ اس نظم میں اکبر نے انگریزی تہذیب کی اندھا دھند تقلید اور اس کے اثرات کا بیان کیا ہے۔

s\Administrator\Deskto
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

13

ساحؔر لدھیانوی

شاعر کا تعارف

اکبر ساحؔر لدھیانوی کا نام عبدالحئ تھا وہ 1922 میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لدھیانہ میں حاصل کی۔ بعد میں لاہور چلے گئے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے سے ہوا۔ ''ادب لطیف اور سویرا'' کے ایڈیٹر رہے۔ پھر دہلی سے ''فنکار'' نکالا۔ کچھ مدت تک ''شاہ کار'' کی ادارت کی۔ ممبئی جانے کے بعد فلموں کے لئے گیت لکھنے لگے۔ جہاں ان کو بے حد شہرت حاصل ہوئی وہ اپنی نظموں اور گیتوں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔

ساحؔر کے کلام کا مجموعہ ''تلخیاں'' کافی مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ ایک مجموعہ'' گاتا جائے بنجارہ'' بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک طویل نظم ''پرچھائیاں'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہے جو بعد میں ان کے مجموعے'' آؤ کہ خواب بنیں'' میں بھی شامل ہوئی۔ ساحؔر کا انتقال 1980 میں ممبئی میں ہوا۔

ساحؔر لدھیانوی کی شاعری میں شادابی اور رنگینی ہے۔ ان کے نغمے احساس کی دلکشی سے بھرپور ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ ان کا انداہ جذباتی ہے اور نوجوانوں کو براہ راست اپیل کرتا ہے۔ انہوں نے سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی بڑے دلکش انداز میں لکھا ہے وہ جوانی کے تجربات کو فطری انداز اور سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔

مقاصد

اس نظم کو پڑھنے کے بعد آپ:

- نظم کے اشعار کی تشریح و تحسین کرسکیں گے؛
- نظم کا مطلب بیان کرسکیں گے؛

gs\Administrator\Desktop\Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

- شاعر کے مدعا کو سمجھ کر اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گے؛
- صنعت تضاد، صنعت تلمیح اور صنعت تکرار کی شناخت کر لیں گے؛
- شاعر کے انداز بیان پر روشنی ڈال سکیں گے۔

13.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پوری نظم پڑھتے ہیں۔

یہ ساحرؔ لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' کا ایک حصہ ہے۔ یہ نظم دوسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ جب برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو جنگ میں حصہ لینے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔

پرچھائیاں

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا
تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موج ہوا رخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی
یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسلِ نو کے لئے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی
کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دہکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں
گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں

تصورات: تصور کی جمع

مشغلہ: کام

خبط: دیوانگی

s\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

13.2 متن کی تشریح

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا
تو ہر قدم پر زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موج ہوا رخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگ سنگ ہوتی جائے گی

رگ: نس
سنگ: پتھر
ارض: زمین
نسلِ نو: نئی نسل

شاعر نے برطانوی حکمرانوں کو قاتل سے تعبیر کیا ہے کیوں کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو زبردستی جنگ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر آئندہ کسی اور نے ہمیں جنگ میں زبردستی بھیجنے کی کوشش کی تو ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ اور اپنے ملک کی زمیں پر انہیں نہیں رہنے دیں گے۔ اور ان کا جینا مشکل کر دیں گے۔ اس کام میں ہمارے ملک کی ہوائیں اور پیڑ پودے تک شامل ہوں گے اور وہ دشمنوں کے روکنے میں ہماری مدد کریں گے۔

خاک داں: مراد زمین

13.3 زبان کے بارے میں

''زمیں تنگ ہونا'' کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے جینا دشوار ہونا۔

پیکر: جسم

متن پر سوالات 13.1

1. ''زمیں تنگ ہونا'' کے معنی ہیں۔
   - (i) زمیں کا سکڑ جانا۔
   - (ii) جینا دشوار ہونا۔
   - (iii) زمیں کا چھوٹا ہو جانا۔
2. شعر کو مکمل کیجئے۔

''کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا''

- (i) تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی۔

gs\Administrator\Desktop\ Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

(ii) ہر ایک شاخ رگ سنگ ہوتی جائے گی۔

(iii) ہر ایک موج ہوا رخ بدل کے جھپٹے گی۔

13.4 متن کی تشریح

یہ سر زمیں ہے گوتم کی اور نانک کی
اس ارض پاک پہ وحشی نہ چل سکیں کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسل نو کے لئے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی

شاعر نظم کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ہندوستان کی زمین میں گوتم بدھ اور گرونانک جیسی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں۔ جنہوں نے ساری زندگی امن وشانتی اور بھائی چارے کا سبق سکھایا ہے اس ملک میں جنگ جیسی خوفناک چیز کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا، ہم اس ملک میں جنگ کرانے والے انسانوں کو نہیں رہنے دیں گے۔ ہماری ذمہ داری اور ہماری زندگی اپنے بچوں کی پرورش کرنا اور انہیں اچھا شہری بنانا ہے ہم اپنی زندگیاں جنگ کی نذر نہیں کر سکتے۔

13.5 زبان کے بارے میں

اس بند میں گوتم اور نانک تلمیحات ہیں۔

......گوتم۔ مہاتما بدھ کو کہتے ہیں، جنہوں نے بدھ مذہب کی بنیاد ڈالی۔

......نانک سے مراد گرونانک ہیں، جو سکھوں کے مذہبی رہنما تھے۔

......'خون' سے شاعر کی مراد زندگی ہے۔

متن پر سوالات 13.2

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

1. ہمارا خون کس کی امانت ہے؟

(i) نسلِ نو کی

(ii) بزرگوں کی

s\Administrator\Desktop Print\nOTE\NOTE2.tif not found.

(iii) ملک کی

2. گوتم بدھ، نانک کی سرزمین کہنے سے شاعر کی مرادا ہے۔

(i) امن وشانتی اور بھائی چارے کی تعلیم

(ii) بدھ مت کا فروغ

(iii) سکھ مذہب کا فروغ

13.6 متن کی تشریح

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دہکتے خاک داں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں

شاعر کہتا ہے کہ اتنی تباہی و بربادی کے بعد اگر آج بھی ہم نے جنگ کے خلاف زبان نہیں کھولی اور اسی طرح ظلم وستم سہتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ آج سائنس داں خوش ہیں کہ انہوں نے ایٹم بم بنالیا ہے۔ لیکن اتنی خطرناک چیز کو بنانا سراسر پاگل پن ہے۔ کیونکہ اگر ان ایٹم بموں کا استعمال کیا گیا تو یہ خوب صورت دنیا اور چمک دار دنیا راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گی۔

13.7 زبان کے بارے میں

......لفظ ''خموش'' اصل میں خاموش ہے۔ ضرورت شعری کی بنیاد پر الف ہٹا دیا گیا ہے شاعری میں اس کی اجازت دی جاتی ہے۔

......'زمین آسمان متضاد الفاظ ہیں'۔

......''خاکداں'' میں داں لاحقہ ہے، یہ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ایک رکھنے کی جگہ، جیسے پان دان گل دان، آتش دان۔

اور دوسرے ''جاننے والا'' جیسے زباں داں، راز داں۔

متن پر سوالات 13.3

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگایئے۔

1. ''کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے'' سے شاعر کی مراد ہے۔

gs\Administrator\Desktop\
Print\nOTE\NOTE2.tif not
found.

(i) جنگ کے خلاف آواز اٹھانا۔

(ii) کچھ نہ بولنا۔

(iii) ادب واحترام کرنا۔

2. مندرجہ ذیل مرکب الفاظ میں معنی کے لحاظ سے کون سی ترکیب ٹھیک ہے؟

(i) پان دان، سائنس دان، آتش دان۔

(ii) زباں داں، سائنس داں، سیاست داں۔

(iii) گل دان، سیاست داں، پان دان۔

13.8 متن کی تشریح

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

نظم کے آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ پچھلی مرتبہ جب جنگ ہوئی تھی تو صرف مادی ہی نقصانات ہوے تھے۔ یعنی لوگوں کے گھر بار انسانی جانوں اور استعمال کرنے کی چیزوں ہی کا نقصان ہوا تھا۔ اور اگر اس بار پھر جنگ ہوئی تو اس سے زیادہ تباہ کاریاں ہوں گی۔ تصورات کی پرچھائیاں یعنی سمجھنے کی قوت ہی ختم ہوجائے گی۔ امیدیں اور حوصلے ختم ہوجائیں گے۔ اور انسان زندگی سے مایوس ہوجائے گا۔ اس لئے ہمیں ہوشیار ہوجانا چاہئے اور سب کو مل کر جنگ کی مخالفت کرنی چاہئے۔ کیونکہ سوچنے سمجھنے کی قوت اور امیدواروں اور حوصلوں کا ختم ہوجانا انسانی زندگی کا بہت بڑا نقصان ہے۔

13.9 زبان کے بارے میں

......شاعر انسان کی سوچنے سمجھنے کی قوت، امیدوں اور حوصلوں کو مادی چیزوں سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

......یہ سچ بھی ہے کیونکہ انہیں چیزوں سے انسان میں جینے کی اور محنت کرنے کی چاہ پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وہ دنیا کی تمام چیزیں حاصل کرسکتا ہے۔

s\Administrator\Desktop
Print\nOTE\NOTE2.tif
not found.

متن پر سوالات 13.4

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

1. تصورات کی پرچھائیاں سے شاعر کی کیا مراد ہے۔
   - (i) خیالات
   - (ii) غیر مرئی جسم
   - (iii) سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، امیدیں، حوصلے۔

2. اس بار کی جنگ سے شاعر کو کیا اندیشہ ہے؟
   - (i) سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا۔
   - (ii) سوچنے سمجھنے کی صلاحیت' امیدیں' اور حوصلے ختم ہو جائیں گے۔
   - (iii) زمیں اور آسماں فنا ہو جائیں گے۔

13.10 انداز بیان

ساحؔر لدھیانوی کا انداز بیان فطری اور موثر ہے انہوں نے انسانی جذبات واحساسات کو خوب صورت الفاظ میں پیش کیا ہے۔ الفاظ کی رنگارنگی اور جذباتی انداز بان کی وجہ سے ساحؔر کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ ان کی شاعری میں روانی ہے جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے ساحر کے یہاں تکلف اور تصنع نہیں پایا جاتا ہے۔

آپ نے کیا سیکھا؟

......انسان کو ہمیشہ مل جل کر رہنا چاہیے۔ آپس میں لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے گھر، محلّہ، پڑوس سماج اور ملک کا امن وسکون درہم برہم ہوتا ہے۔

......امن اچھی چیز ہے اور ہمیں ہر طرف امن قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

......جنگ مسئلوں کا حل نہیں، بلکہ مسئلوں کو جنم دینے والی چیز ہے۔

......ہر ملک کے زیادہ تر لوگ میل محبت اور بھائی چارے کو پسند کرتے ہیں۔

......بات میں زور پیدا کرنے کے لئے جب کوئی لفظ دوبارہ استعمال کیا جاتا ہے تو اسے ''تکرار کد'' کہتے ہیں۔

......''زخم کو زبان کرنا'' اور زمین تنگ ہونا'' محاورے ہیں تصورات کی پرچھائیاں یعنی انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، امیدوں اور حوصلوں کے ختم ہو جانے کو شاعر نے نقصان عظیم کہا ہے۔

gs\Administrator\Desktop\
Print\nOTE\NOTE2.tif not
found.

13.11 مزید مطالعہ

ساحرلدھیانوی کا مجموعہ 'آؤ کہ خواب بنیں' حاصل کیجئے۔اور یہ نظم پوری پڑھئے۔

اختتامی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی میں لکھئے۔

1. شاعر کو جنگ وجدل سے کیوں نفرت ہے؟
2. شاعر سیاسی مقامروں سے کیا گفتگو کرنا چاہتا ہے اور کیوں؟
3. ہندوستان کی زمین کو ارض پاک اور گوتم ونانک کی زمین کہنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
4. جنگ کے خلاف آواز اٹھانے پر شاعر کو کس چیز کا اندیشہ ہے؟
5. نظم کا جو بند آپ کو بہت پسند آیا اسے اپنی کاپی میں لکھئے۔

متن پر سولات کے جوابات

11.1	(ii) 1	(iii) 2	(i) 3
11.2	(iii) 1	(i) 2	
11.3	(ii) 1	(i) 2	
11.4	(i) 1	(i) 2	
11.5	(i) 1	(ii) 2	
11.6	(iii) 1	(ii) 2	

14

مخدومؔ محی الدین

شاعر کا تعارف

نام محی الدین اور مخدومؔ تخلص تھا۔ مخدوم 3/فروری 1908 کو حیدر آباد دکن کے ایک گاؤں میدک میں پیدا ہوئے۔ 1937 میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا اور سٹی کالج میں لکچرر ہو گئے۔ لیکن مخدومؔ انقلاب پسند آدمی تھے۔ اس لئے جلد ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کمیونسٹ پارٹی کے مستقل کارکن بن گئے۔ انہوں نے حیدر آباد میں 'انجمن ترقی پسن مصنفین' کی بنیاد ڈالی۔

1944 میں ان کے کلام کا مجموعہ ''سرخ سویرا'' شائع ہوا۔ دوسرے مجموعے کا نام ''گل تر'' ہے۔ مخدومؔ کے کلیات بساطِ رقص (1966) پر انہیں بعد از مرگ ساہتیہ اکادمی انعام دیا گیا 25/اگست 1969 میں دہلی میں انتقال ہوا۔

مخدوم کی شاعری حرکت وعمل کی شاعری ہے۔ وہ ایک سیاسی آدمی تھے۔ ان کی شاعری میں سیاسی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اس زمانے کے دوسرے شاعروں کی طرح مخدومؔ کی شاعری میں انقلاب اور رومان کا خوب صورت سنگم ہے۔ مخدوم نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی۔ ان آزاد نظموں میں غزل کا حسن پایا جاتا ہے۔

''چاند تاروں کا بن'' مخدوم کی نمائندہ آزاد نظم ہے۔

مقاصد

اس نظم کو پڑھنے کے بعد آپ:

- آزاد نظم اور پابند کے فرق کو سمجھ کر بیان کر سکیں گے؛
- نظم کی تشریح کر سکیں گے؛
- مخدوم کے انداز بیان کو سمجھ کر بیان کر سکیں گے۔

NOS\NOTE1.tif not found.

14.1 اصل سبق

آیئے اب پوری نظم پڑھتے ہیں۔

چاند تاروں کا بن

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن۔
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن۔
تشنگی تھی مگر،
تشنگی میں بھی سرشار تھے۔
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے۔
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن۔
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن۔
صبح دم ایک دیوار غم بن گئے۔
خارزارِ الم بن گئے۔
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو۔
جوئے خون بن گیا۔
رات کی تلچھٹیں ہیں، اندھیرا ابھی ہے۔
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے۔
ہم دمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو۔
سوئے منزل چلو۔
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دل دار کی منزلیں۔
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو۔

تشنگی: پیاس
سرشار: نشہ میں ڈوبا ہوا
زن: عورت
مدہوش: نشے میں ڈوبا ہوا
بانکپن: ناز دادا
صبح دم: صبح کے وقت
الم: دکھ غم
خارزار: کانٹوں کا جنگل
شہ رگ: گلے میں نرخرے کے نیچے جو نس ہوتی ہے
جوئے خوں: خون کی ندی
تلچھٹ: تہہ میں بیٹھی ہوئی بغیر چھنی چیز
ہم دم: ساتھی
دل دار: محبوبہ
کو: کوچہ
دار: پھانسی کا تختہ

14.2 متن کی تشریح

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن۔
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن۔
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن۔
تشنگی تھی مگر۔
تشنگی میں بھی سرشار تھے۔
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے۔
منتظر مردوزن۔

یہ مخدوم محی الدین کی آزاد نظم ہے آزاد نظم میں قافیے کے پابندی نہیں کی جاتی اور مصرعے برابر کے نہیں ہوتے۔ یعنی نظم کے بندھے ٹکے اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی۔

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارے ملک کو آزادی آسانی سے نہیں ملی ہے۔ بلکہ کو آزاد کرانے کے لئے یہاں کے لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں اور بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ مادر وطن پر شہید ہونے والے ہندوستانیوں کے جسم موم کی طرح جلتے اور پگھلتے رہے ہیں۔ تب ملک آزاد ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ لوگ سختیاں جھیلتے تھے، دکھ اٹھاتے تھے، آنکھیں بے نور ہو جاتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے دل ملک کو آزاد کرانے کے جوش اور جذبے سے سرشار تھے۔

14.3 زبان کے بارے میں

......نظم کے اس ابتدائی حصے میں شاعر نے آزادی سے پہلے کے حالات، آزادی کی تحریک اور ہندوستانی عوام کے جوش وجذبے کو پیش کیا ہے۔ یہ پوری نظم استعارے میں لکھی گئی ہے ایسی نظم کو علامتی نظم کہا جاتا ہے۔

جسموں کا موم کی طرح پگھلنا   آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی تکلیفیں جھیلنے کا استعارہ ہے۔
شمع صبح وطن کا جھلملانا   آزادی کے حصول کے مقصد کو ہر وقت سامنے رکھنے کا استعاہ ہے۔
چاند تاروں کا بن   ہندوستانی عوام کے لئے استعال کیا جانے والا استعارہ ہے۔
تشنگی   آزادی کی تڑپ کا استعارہ ہے۔
رات   غلامی کے دور کا استعارہ ہے۔
آنکھوں کو خالی کٹوروں سے تشبیہ دینا بالکل نئی بات ہے۔

NOS\NOTE1.tif not found.

متن پر سوالات 14.1

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

1. غلامی کے دور کو کس سے تشبیہہ دی گئی ہے؟

   (i) موم
   (ii) رات
   (iii) شمع

2. ''شمع صبح وطن کا جھلملانا'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

   (i) شمع کا بجھنا۔
   (ii) ستاروں کا ٹمٹمانا۔
   (iii) مقصد آزادی کو ہر وقت سامنے کھنا

3. تشنگی سے کیا مراد ہے؟

   (i) پیاس
   (ii) تڑپ
   (iii) مصیبت

14.4 متن کی تشریح

مستیاں ختم مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن۔
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن۔
صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے۔
خارزارِ الم بن گئے۔
رات کی شہ گوں کا اچھلتا لہو۔
جوئے خوں بن گیا۔
رات کی تلچھٹیں ہیں، اندھیرا بھی ہے۔
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہندوستان نے بڑی جدوجہد کے بعد آزادی تو حاصل کر لی۔ ساتھ ہی ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور تقسیم

NOS\NOTE2.tif not found.

کے دوران قتل و غارت گری کا بازار ایسا گرم ہوا کہ کہ خون کی ندیاں بہ گئیں۔ اور آزادی ملنے کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ لوگ حیران رہ گئے کہ کیا ایسی ہی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہم نے ساری مصیبتیں اٹھائی تھیں، کیا یہ خواب دیکھے تھے کہ سب ایک ساتھ مل کر آزادی خوشیاں نہ منا سکیں؟

شاعر کو تقسیم کا اور قتل و خون کا بہت افسوس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ روشن اور تابناک صبح آزادی نہیں، جس کی ہم سب نے تمنا کی تھی۔ انہیں جذبات کو فیض احمد نے یوں پیش کیا ہے۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

14.5 زبان کے بارے میں

......مستیاں، مدہوشیاں، بانکپن، خوشی کے استعارے ہیں۔

......صبح دم۔ آزادی کی صبح کا استعارہ ہے۔

......دیوار غم اور خار زار الم۔ غم کے استعارے ہیں

......تلچھٹ، اجالا اور اندھیرا۔ تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات اور قتل و غارت گری کے استعارے ہیں۔

......شہ رگوں کا اچھلتا لہو۔ تحریک آزادی کے جوش و جذبے کا استعارہ ہے۔

استعارے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں تشبیہہ کا رشتہ تو موجود ہوتا ہے لیکن جس کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس کا ذکر نہیں ہوتا۔ یہ تشبیہ کی زیادہ پُر کشش اور خوب صورت شکل ہے۔

متن پر سوالات 14.2

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگایئے۔

1. 'مستیاں ختم تھیں' مدہوشیاں ختم' ختم تھا بانکپن کا مطلب ہے۔
   (i) آزادی کی جدوجہد ختم ہو گئی تھی۔
   (ii) اخلاق وانسانیت ختم ہو گئی تھی
   (iii) لوگ خوشیاں منانے کے بعد آرام کر رہے تھے

2. ''صبح دم'' سے شاعر کی مراد ہے
   (i) صبح کا وقت

NOS\NOTE1.tif not found.

(ii) صبح کا دھندلکا

(iii) آزادی کی صبح

3. یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

کس شاعر کا شعر ہے؟

(i) فیض احمد فیضؔ

(ii) مخدومؔ محی الدین

(iii) حسرتؔ موہانی

14.6 متن کی تشریح

ہم دمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دل دار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

ملک تقسیم ہونے کی قتل وغارت گری دیکھ کر شاعر کا دل خون ہو گیا ہے۔ مگر وہ پھر ہمت کر کے اٹھتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کو آواز دیتا ہے کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ گو اس کا بہت رنج ہے مگر اب جو کچھ باقی بچا ہے آؤ! سب مل کر اسے ٹھیک کریں۔ اب اپنے آزاد ملک کو ترقی کی راہوں پر لے جانے کے لیے پھر ہمیں کڑی محنت کرنا ہے۔ گو کہ ہمارے دل زخمی ہیں۔ پھر بھی ہمیں اپنے ملک کے بہت کام کرنے ہیں اور ہر طرح کی قربانی دینی ہے۔

14.7 زبان کے بارے میں

......سوئے منزل چلو	ملک کی ترقی اور خوشحالی کا استعارہ ہے
......منزلیں پیار کی	ملک کی ترقی کے کاموں کا استعارہ ہے
......منزلیں دار کی	کڑی محنت اور قربانی کا استعارہ ہے

......کوئے دل دار   پیارے وطن کا استعارہ ہے

......اپنی اپنی صلیبیں   دکھوں اور غموں کا استعارہ ہے

متن پر سوالات 14.3

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

1. ''سوئے منزل چلو' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
   (i) گھر کی طرف چلو
   (ii) ملک کی ترقی اور خوشحالی کے بارے میں سوچو
   (iii) جیل خانے کی طرف چلو

2. 'کوئے دل دار' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
   (i) محبوبہ کی گلیاں
   (ii) پیارا وطن
   (iii) تقسیم کے بعد بننے والا دوسرا ملک

3. ''منزلیں دار کی'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
   (i) پھانسی کا تختہ
   (ii) گھر
   (iii) ملک کی ترقی کے لیے قربانی دینا

آپ نے کیا سیکھا؟

☆ مخدوم محی الدینؔ سیاسی شاعر تھے

☆ ''چاند تاروں کا بن'' آزاد نظم ہے

☆ آزاد نظم میں قافیے کی پابندی نہیں کی جاتی، مصرعے برابر نہیں ہوتے۔ بندھے ٹکے اصولوں کی پابندی نہیں ہوتی

☆ یہ پوری نظم استعارے میں کہی گئی ہے، ایسی نظموں کو علامتی نظم کہتے ہیں

☆ استعارے میں تشبیہ کا رشتہ تو موجود ہوتا ہے لیکن جس کو تشبیہ دی جاتی ہے اس کا ذکر نہیں ہوتا۔ یہ تشبیہ کی زیادہ پُر کشش اور خوب صورت شکل ہے

NOS\NOTE1.tif not found.

14.8 مزید مطالعہ

مخدومؔ کے انعام یافتہ مجموعے ''بساطِ رقص'' کا مطالعہ کیجئے۔

14.12 اختتامی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی پر لکھیے۔

1. اس نظم میں شاعر نے کون کون سے تین دور دکھائے ہیں؟
2. آزادی مل جانے کے بعد لوگ خوشیاں کیوں نہیں منا سکے؟
3. نظم کے آخری حصے میں شاعر نے وطن کے لوگوں کو کیا مشورہ دیا ہے؟
4. نظم میں استعمال کیے جانے والے پانچ استعارے تلاش کر کے لکھئے۔
5. ''چاند تاروں کا بن'' آزاد نظم کیوں ہے؟ وجہ لکھئے۔

متن پر سوالات کے جوابات

14.1	(ii) 1	(iii) 2	(ii) 3
14.2	(ii) 1	(iii) 2	(i) 3
14.3	(ii) 1	(ii) 2	(iii) 3

NOS\NOTE2.tif not found.

15

جاں نثار اختر

شاعر کا تعارف

جاں نثار اختر کا شمار دورِ حاضر کے اہم اور مقبول شعراء میں ہوتا ہے ان کا پورا نام سید جاں نثار حسین رضوی اور اختر تخلص تھا۔ آبائی وطن قصبہ خیر آباد، ضلع سیتا پور (یو پی) تھا لیکن خود جاں نثار اختر کی پیدائش 1914ء میں گوالیار میں ہوئی۔ جاں نثار اختر ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو کئی نسلوں سے علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ ان کے والد مضطرؔ خیر آبادی اور تایا بسملؔ خیر آبادی دونوں شاعر تھے۔ ان کی دادی سعید النساء بیگم ایک تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہتی تھیں۔ ان کا تخلص حرماںؔ تھا۔ حرماںؔ کے والد مولانا فضل حق خیر آبادی اور بھائی شمش العلماء مولانا عبدالحق جیّد عالم تھے۔ جاں نثار اختر نے دسویں جماعت تک تعلیم گوالیار کے وکٹوریہ کالجیٹ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ 1930ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹریٹ کے لیے ''اردو میں ناول نویسی'' کے موضوع پر کام کرنا شروع کیا لیکن گھریلو حالات کی وجہ سے 1940ء میں اسے نامکمل چھوڑ کر گوالیار واپس آنا پڑا۔ یہاں ان کا تقرر وکٹوریہ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے ہوگیا۔ 25/دسمبر 1943ء کو ان کی شادی مشہور شاعر اسرار الحق مجازؔ کی سگی بہن صفیہ سے ہوگئی۔ شادی کے بعد کے چند سال نہایت اطمینان بخش اور پُر مسرت ماحول میں گزرے۔ 1947ء میں ملک کی آزادی کے بعد فسادات کا جو اذیت ناک سلسلہ ہوا اس کی لپیٹ میں گوالیار بھی آ گیا اور جاں نثار اختر کو گوالیار کی سکونت ترک کر کے ریاست بھوپال میں پناہ لینا پڑی خوش قسمتی سے انھیں یہاں حمیدیہ کالج میں صدر شعبۂ اردو و فارسی کی جگہ مل گئی۔ کچھ دنوں بعد صفیہ اختر کا تقرر بھی اس کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد جاں نثار اختر بھوپال چھوڑ کر 1949ء میں بمبئی چلے گئے اور فلموں کے لیے گانے لکھنے لگے۔ لیکن کام کی حالت اطمینان بخش نہ تھی۔ 17/جنوری 1953ء کو ان کی بیوی صفیہ کا انتقال ہوگیا جس سے ان کی پریشانیوں اور دکھوں میں اضافہ ہوگیا۔ 17/ستمبر 1956ء کو اختر کی دوسری شادی خدیجہ طلعت سے ہوگئی۔ اس شادی کے بعد کا زمانہ جاں نثار اختر کے لیے آرام و آسائش کا زمانہ تھا۔ ایک فلمی شاعر کی حیثیت سے

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO not found.

انھیں خاص شہرت حاصل ہوئی اور زندگی خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ بسر ہونے لگی۔ 18/اگست 1976 کو بمبئی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔

جاں نثار اختر کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''سلاسل''، ''تارِ گریباں''، ''نذرِ بتاں''، ''جاوداں''، گھر آنگن''، خاکِ دل''، پچھلے پہر''، ''خاکِ دل پر نومبر 1974 میں سوویت دیس نہرو ایوارڈ اور 1976 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (بعد از مرگ) دیا گیا۔

جاں نثار اختر نے نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں اور رُباعیات وقطعات بھی۔ ہر ایک صنف میں ان کی انفرادیت جلوہ گر ہے۔ نظموں کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس حقیقت کے باوجود مزاجاً غزل کے شاعر تھے۔ ان کی تربیت بھی غزل کی کلاسیکی روایات کے ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کی غزلوں میں ان کے تجربات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ جذبات کی صداقت اور لہجے کی لطافت کے امتزاج سے ان کی غزل کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جوان دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ان غزلوں میں جسم کی خوشبو بھی ہے، حسن کی رعنائی بھی اور عشق کی حرارت بھی۔ محبت اور اس کی لطیف کیفیات و واردات، نرم اور ملائم الفاظ نیز شگفتہ شیریں اور رسیلے بیان کے ذریعے نہایت رچاؤ کے ساتھ ان کی غزلوں میں اظہار پاتی ہیں۔ یہ خصوصیات ان کی غزلوں میں حسن ودل کشی کا باعث ہیں اور ان کی بدولت وہ ایک منفرد اور کامیاب غزل گو قرار پاتے ہیں۔

مقاصد

اس نظم کو پڑھنے کے بعد آپ:

- نظم کا مطلب اور شاعر کے پیغام کو سمجھ کر بیان کر سکیں گے؛
- جذبۂ حب الوطنی محسوس کر سکیں گے؛
- ہندوستان کی مشہور ادبی شخصیات سے واقف ہو سکیں گے؛
- ہندوستان کے تیوہار اور مختلف رسم رواج سے واقف ہو سکیں گے؛
- ہندوستان کی دیہی زندگی کو جان سکیں گے؛
- ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے رنگا رنگ پہلوؤں سے واقفیت حاصل کر سکیں گے؛
- ہندوستانی تمدن اور آثار قدیمہ سے واقف ہو سکیں گے؛
- نظم کی مشہور صنف مثنوی سے متعارف ہو سکیں گے؛
- زبان و بیان کی خوبیوں کو پہچان سکیں گے؛
- نظم میں استعمال ہونے والی مختلف صنعتوں سے واقف ہو سکیں گے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

15.1 اصل سبق

آیئے اب ''نظم خاک وطن'' پڑھتے ہیں۔

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنے صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
ہمیں پیار اپنے ہراک گاؤں سے
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
ہمیں پیار اپنی عمارات سے
ہمیں پیار اپنی روایات سے
سلامت رہیں اپنے دشت ودمن
رہے گنگناتا ہمارا گگن
نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہیں
سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
مچلتی رہے زلفِ گنگ وجمن
رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ
چمکتی خنک چاندنی نرم دھوپ
لٹاتی رہیں اپنے نینوں کے مدھ
یہ صبح بنارس یہ شامِ اودھ
رہیں سرخسرو سیکری کے محل
یہ نینی کے جھیلوں میں کھلتے کنول
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
رہے تا قیامت محبت کی لاج

خاکِ وطن: وطن کی مٹی

عمارات: عمارت کی جمع
دشت: جنگل
گگن: آسمان
سدا: ہمیشہ
گنگوتری: وہ جگہ جہاں سے گنگا نکلتی ہے
پھبن: زیبائش، سجاوٹ
گنگ وجمن: گنگا اور جمنا
خنک: ٹھنڈا
سنگم: دو چیزوں کا ملاپ (وہ جگہ جہاں گنگا جمنا مل جاتی ہیں)
نین: آنکھ
مدھ: شہد
سرخرو: کامیاب
سیکری: جگہ کا نام (فتح پور سیکری جو آگرہ کے پاس ہے) اور فتح پور سیکری کے نام سے مشہور ہے
نینی: نینی تال کا مخفف یعنی مختصر نام ہے اس کی جھیل یا تال آنکھ کی طرح ہے

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO not found.

اجنتا کے بت رقص کرتے رہیں
حسین غار تاروں سے بھرتے رہیں
ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں
جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں
لہکتا رہے سبز میداں میں دھان
زمینوں میں بجھتے رہیں آسمان
مہکتے رہیں سبز آموں کے بور
بڑھاتی رہیں پینگ جھولے کی ڈور
رہیں ہولیوں کے سدا ہاتھ لال
فضاؤں میں اڑتا رہے یہ گلال
رہے یہ دیوالی کی جگ مگ بہار
منڈیروں پہ جلتے دیوں کی قطار
رہے آسماں پر دمکتا ہلال
رہے یہ بسنتوں کے میلے کی دھوم
شادیہ گیت گاتے ہجوم
حسیں راکھیاں جھلملاتی رہیں
جھماجھم ستارے لٹاتی رہیں
گھروں کا تقدس رہے بر قرار
یہ بیٹوں کے ماتھوں پہ ماؤں کا پیار
سلامت رہیں دل میں کھلتے چمن
سلامت رہے انکھڑیوں کی حیا
سلامت رہیں گھونگھٹوں کی ادا
سلامت رہیں ہیر رانجھا کے گیت
رہی ہار میں بھی محبت کی جیت
لجانا رہے مسکرانا رہے
منانا رہے روٹھ جانا رہے

اجنتا: وہ جس کے پتھروں اور چٹانوں میں سنگ تراشی کے خوبصورت نمونے واقع ہیں۔ اجنتا اور ایلورہ کی گپھائیں مشہور ہیں
دھان: وہ اناج جس سے چاول نکلتا ہے (چھلکا سمیت چاول)
آم کے بور: آم کے پھول
پینگ بڑھانا: لمبا جھونٹا لینا کہ بہت اونچا جائے
ہلال: پہلی تاریخ کا چاند
شاد: خوش
ہجوم: بھیڑ، مجمع
تقدس: پاکیزگی
انکھڑیاں: انکھڑی کی جمع (چھوٹی اور پیاری آنکھ۔ پیار سے بچہ اور معشوق کی آنکھ کو انکھڑی کہتے ہیں)
حیا: شرم
ہیر رانجھا: پنجاب کے مشہور افسانوی عشقیہ کردار

NOS\NOTE2.tif not found.

محبت کے چشمے ابلتے رہیں
جواں سال نغموں میں ڈھلتے رہیں
رہے دھوم ٹیگور و اقبال کی
رہے شان پنجاب وبنگال کی
رہے نام اپنے ادب کا بلند
دلوں میں سمایا رہے پریم چند
سدا زندگانی غزل خواں رہے
زمانے میں غالب کا دیواں رہے

15.2 متن کی تشریح

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنے صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
ہمیں پیار اپنے ہراک گاؤں سے
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
ہمیں پیار اپنی عمارات سے
ہمیں پیار اپنی روایات سے

یہ نظم جذبۂ حب الوطنی سے بھرپور ہے۔اس کے ایک ایک شعر سے شاعر کی وطن سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ نظم وطن پرستی کے موضوع پر ایک مثالی نظم کہی جا سکتی ہے۔نظم کے اس حصے میں شاعر اپنے وطن سے محبت کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ یہاں کی ہر شئے سے اسے لگاؤ ہے اور یہ لگاؤ ایک فطری امر ہے کیونکہ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس سے وابستہ ہر چیز ہمیں اچھی لگتی ہے۔اس کی ہر ادا ہمیں بھاتی ہے۔اس طرح شاعروں کو وطن سے بے پناہ محبت کی بنا پر یہاں کی مٹی میں بھی ایک خاص کشش کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں کی صبحیں اور شام، یہاں کے شہر اور شہروں کے نام، یہاں کے گاؤں سبھی کچھ اسے اچھے لگتے ہیں۔تاریخی عمارتیں، روایتیں اور یہاں کے رسم و رواج اسے بہت اچھے لگتے ہیں۔غرض اسے اپنے وطن کی ہر شئے عزیز ہے اور وہ ان سے محبت کرتا ہے۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

15.3 زبان کے بارے میں

اس نظم کے اشعار کی ترتیب و ساخت پر غور کریں یہ ایک مربوط نظم ہے اور اس کے ہر شعر کا اپنا الگ قافیہ ہے۔ ایسی نظم کو مثنوی کہتے ہیں۔ مثنویاں عام طور پر طویل نظمیں ہوتی ہیں۔ قدیم روایتی اور کلاسیکی مثنویوں میں جن اور پریوں کے قصوں، مافوق الفطرت واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن و عشق کی داستانوں، خوشیوں غموں، شادی موت کی رسموں اور اخلاقی قصوں وغیرہ کا بیان کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن بعد میں زندگی کے تمام موضوعات پر مثنویاں بھی کہی جا چکی ہیں۔

کسی شعر کے ایک ہی مصرعے یا دونوں میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جو آپس میں یعنی ایک دوسرے کی ضد ہوں، صنعت تضاد کہلاتا ہے۔ جیسے اس شعر میں ؎

ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار

صبح اور شام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسے صنعت تضاد کہتے ہیں۔

متن پر سوالات 15.1

1. عمارات اور روایات، عمارت اور روایت کی جمع ہیں۔ اس وزن پر چار اور جمع بنا کر لکھئے۔

الف.................. ب..................

ج.................. د..................

2. آپ کے نصاب میں شامل نظم 'خاک وطن' میں جن الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے درج ذیل الفاظ چھانٹ کر علیحدہ لکھئے۔

خاک وطن، اپنا شہر، شہروں کے نام، برگد کی چھاؤں، گاؤں کے تالاب، عمارات و روایات، مچھلیاں اور کبوتر، دن رات، جنگل بیابان۔

.... ، .... ، ....، ....

.............................، ....

15.4 متن کی تشریح

سلامت	رہیں	اپنے	دشت	ودمن
رہے		گنگناتا	ہمارا	گگن
نگاہیں	ہمالہ	کی	اونچی	رہیں

NOS\NOTE2.tif not found.

سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
مچلتی رہے زلفِ گنگ وجمن
رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ
چمکتی خنک چاندنی نرم دھوپ

شاعر اپنے وطن اور اس کی چیزوں سے محبت کا اظہار کرنے کے بعد نظم کے دوسرے حصے میں وطن کی سلامتی کے لئے خدا سے دعا مانگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے خدا! یہاں کے جنگل اور بیابان کو صحیح سلامت رکھ۔ کوہ ہمالہ کی چوٹی یعنی گوری شنکر (ایورسٹ) دنیا کی سب سے اونچی چوٹی۔ شاعر اس کی اونچائی پر فخر کرتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ وہ سدا بلند رہے۔ مزید مبالغہ سے کام لیتے ہوئے اس کے چاند تاروں تک پہنچنے کی تمنا کرتا ہے۔ گنگا گنگوتری سے نکلی ندی کی شادابی و سیرابی کے لئے دعا گو ہے۔۔ ندیاں چونکہ کبھی سیدھی نہیں بہتیں بلکہ ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گذرتی ہیں۔ چنانچہ شاعر نے ان کے ٹیڑھے میڑھے ہوکر گزرنے کو زلفوں سے تشبیہہ دی ہے۔ کیونکہ زلفوں یا بالوں میں پیچ وخم ہوتے ہیں۔ یہ منظر بہت ہی سہانا اور دلکش ہوتا ہے۔ یہاں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں زائرین مقدس غسل کے لئے آتے ہیں۔ اور غسل کر کے اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں۔ ہندو مذہب کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ گنگا اور جمنا میں غسل کرنے سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ او رانسان پاک ہو جاتا ہے۔ رات کو چاند کی روشنی میں پورا ماحول ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور دن میں موسم سہانا ہوتا ہے۔

شاعر کو اپنے ملک کے رسم ورواج اور روایات بہت پسند ہیں۔ وہ ان کی سلامتی کے لئے دعا گو ہے۔

15.5 زبان کے بارے میں

یہ نظم ایک تاثراتی اور استعاراتی نظم ہے۔ شاعر نے خوبصورت استعاروں اور تشبیہوں سے اسے مزیّن کیا ہے۔ جیسے۔

رہے گنگناتا ہمارا گگن
نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہیں
سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
مچلتی رہے زلف گنگ وجمن

یہاں آسماں کا گنگنانا۔ ہمالہ کا چاند تاروں کو چھونا اور گنگا جمنا کی زلفوں کا مچلنا حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ شاعر نے کوہ ہمالہ کی شان اور اس کے وقار کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ گویا پہاڑ آسمان کو چھوتے نظر آتے ہیں۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

متن پر سوالات 15.2

1. دشت و دمن میں ''و'' حرف عطف ہے۔ جو دو لفظوں کو جوڑنے کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ حرف عطف یعنی ''و'' دو ہم معنی یا دو متضاد الفاظ کو جوڑنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے روز وشب یا غم والم ایسے مرکبات کو عطفی مرکبات کہتے ہیں۔

درج ذیل میں واضح کیجئے کہ یہ مرکبات ہم معنی ہیں یا متضاد

الف) شوروغل..................

ب) آسمان وزمین..................

ج) آب وتاب..................

2. گنگا اور جمنا ہندوستان کے دو مشہور دریا ہیں۔

آپ ہندوستان کے پانچ دریاؤں کے نام لکھئے۔

الف........................ ب........................

ج........................ ح........................

ر........................

متن کی تشریح 15.6

لٹاتی رہیں اپنے نینوں کے مدھ
یہ صبح بنارس یہ شامِ اودھ
رہیں سرخسرو سیکری کے محل
یہ نینی کے جھیلوں میں کھلتے کنول
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
رہے تا قیامت محبت کی لاج
اجنتا کے بت رقص کرتے رہیں
حسین غار تاروں سے بھرتے رہیں

شاعر ان اشعار میں کچھ مشہور مقامات، عمارتوں اور فن تعمیر کے شاہکاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی سلامتی کے لئے دعا گو ہے۔ بنارس ہندوستان کا ایک مشہو شہر ہے، جو اپنے تقدس اور مذہبی روایات کے لئے مشہور ہے۔ یہاں مقدس ندی گنگا میں

غسل کرنے کے لئے دور دراز کے علاقوں سے زائرین آتے ہیں، اور لاکھوں کی تعداد میں اس فریضے کی ادائیگی کرتے ہیں۔

اودھ فیض آباد لکھنؤ کے علاقے کا نام ہے اس کی رنگین شام کی بڑی شہرت ہے یہ شہر شام ہوتے ہی رنگین قمقموں سے آراستہ ہوجاتا ہے۔ اور شہر کی رونق قابل دید ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ شام اودھ اپنی رنگینی کے لئے دور دور تک مشہور ہے اردو ادب میں شام اودھ اور صبح بنارس کا بڑا ذکر ملتا ہے شاعر صبح بنارس اور شام اودھ دونوں کی رونق کے لیے دعا کر رہا ہے۔

فتح پور سیکری میں اکبر کے بنائے ہوئے عالیشان محلات ہیں۔ جو ہمارے ملک کی شان کو بڑھاتے ہیں، شاعر ان کی سلامتی چاہتا ہے۔ نینی تال شہر کی مشہور جھیل جو آنکھ کی شکل کی ہونے کی بنا پر نینی تال کہلاتی ہے۔ یہ جھیل بہت ہی پر کشش ہے۔

تاج محل آگرہ کی ایک مشہور و معروف اور سنگ مرمر کی عالمی شہرت یافتہ عمارت ہے جسے شاہ جہاں نے اپنی بیگم ممتاز محل کی موت کے بعد اس کے مقبرے کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ سفید سنگ مرمر سے تراشا ہوا یہ تاج اس کی اٹوٹ محبت کی نشانی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

چاندنی رات میں جب چاند کی دودھیا روشنی تاج محل پر پڑتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے اسے دودھ سے نہلا دیا گیا ہو۔ یہ خوبصورت عمارت آگرہ میں ہے اور اسے دیکھنے دنیا کے گوشے گوشے سے لاکھوں سیّاح ہر سال ہندوستان آتے ہیں۔ شاعر اس کے حسن کو سدا قائم و دائم رہنے کی دعا کرتا ہے۔

اجنتا اور ایلورا کے غار مختلف اقسام کے مجسموں سے بھرے ہیں یہ بت فن سنگ تراشی کا اعلیٰ نمونہ ہیں، شاعر ان پر فخر کرتا ہے اور ان کی سلامتی کی تمنا کرتا ہے۔ تاکہ یہ سدا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہیں اور ہمارا ملک پر کشش بنا رہے اور ہندوستان کی تہذیبی رونق رہتی دنیا تک باقی رہے۔

15.7 زبان کے بارے میں

شعر میں کسی مشہور واقعہ یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں لیکن اس کے پیچھے وہ پورا قصہ ہوتا ہے جس کی طرف شاعر اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پورے قصے کو جانے بغیر نہ تو شعر کا مطلب بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی شعر کے اندر لائی گئی صنعت تلمیح کا پورا پورا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔

ان اشعار میں سیکری، تاج اور اجنتا کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان کی تفصیلات جاننی ہوں گی۔ جیسے تاج محل محبت کی نشانی ہے۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

کیونکہ اس کو بنوانے کی ترغیب شاہجہاں کو اپنی بیگم کی محبت سے ملی۔ وہ ممتاز محل سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس شدت محبت کے نتیجے میں ممتاز محل انتقال کے بعد اس کے مقبرے کو اتنی خوبصورت شکل دی جو آج بھی ایک عجوبہ تصور کی جاتی ہے۔

متن پر سوالات 15.3

1. کالم الف سے ب کو ملا کر مرکب مکمل کیجئے۔

صبح	تال
شام	محل
تاج	بنارس
نینی	اودھ

2. صبح بنارس۔ شام اودھ

یہ دونوں مرکبات مرکب اضافی ہیں یا توصیفی وضاحت کیجئے۔

3. مکمل کیجئے

(الف) سیکری (ب) نینی ج) تاج

متن کی تشریح 15.8

ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں
جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں
لہکتا رہے سبز میداں میں دھان
زمینوں میں بچھتے رہیں آسمان
مہکتے رہیں سبز آموں کے بور
بڑھاتی رہیں پینگ جھولے کی ڈور
رہیں ہولیوں کے سدا ہاتھ لال
فضاؤں میں اڑتا رہے یہ گلال

ہندوستان کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں ہے۔ نظم کے اس حصے میں دیہی زندگی کے کچھ اہم مناظر بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً

NOS\NOTE2.tif not found.

آب ہوا، کھلے ماحول، صاف فضا، لہلہاتے کھیت اور کھیتوں میں دھان کی ہری ہری بالیاں، آم کے باغات اور آم کے پیڑوں پر لگے بور۔

کسان عورتیں جب اپنی محنت کو بار آور ہوتے دیکھتی ہیں اور کھیتوں میں لہلہاتی فصل پر ان کی نظر پڑتی ہے تو خوش ہو کر بے ساختہ گنگنانے لگتی ہیں۔ پودوں کو زمین میں لگانے کا وقت ہو یا پکی فصل کو کاٹنے کی ساعت آئے۔ عورتیں گیت گا کر یہ کام بہ حسن وخوبی انجام دیتی ہیں۔ باغوں میں رسیوں کے جھولے ڈال کر لڑکیاں جھولتی ہیں اور خوشی کے نغمے گاتی ہیں۔ یہ تمام مناظر ہر شخص کو متوجہ کرتے ہیں۔ اسی لئے نظم کے اسی حصے میں شاعر چاہتا کہ یہ تمام مناظر یوں ہی برقرار ہیں۔

ان اشعار سے شاعر کی فطرت کی منظر نگاری میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ شاعر نے صرف سرسری طور پر دیہات کے میدانوں، سبزہ زاروں، کھیتوں اور باغوں کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ کھیتوں میں گاتی ہوئی دوشیزاؤں اور باغوں میں جھولے جھولتی لڑکیوں کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ذاتی طور پر اِن مناظر سے لطف اندوز ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی ذاتی تجربات کو اشعار میں اس انداز سے بیان کیا ہے گویا ہم خود کسی دیہات میں پہنچ گئے ہوں۔

آموں میں جب بور لگتے ہیں تو پوری فضا اس خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے اس کی سوندھی خوشبو ایک خاص جاذبیت رکھتی ہے۔ خاص طور سے کسانوں کو زیادہ خوشی اسی لئے ہوتی ہے کہ بور لگنے کا مطلب ہے آم کی فصل ہوگی۔

15.9 زبان کے بارے میں

ان اشعار میں سادہ و سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ اشعار میں روانی کے ساتھ افعال کی کثرت ہے جیسے لہلہاتی رہیں۔ گیت گاتی رہیں لہلہاتے وجھلملاتے رہیں۔ مہکتے رہے۔ بڑھاتی رہے۔ یہ فعلِ جاریہ ہیں جس سے کام کے جاری رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ شاعر نے اپنی تمناؤں کو دوام بخشنے کے لئے افعال کی ان صورتوں کو استعمال کیا ہے۔

متن پر سوالات 15.4

1. مذکورہ اشعار میں شاعر نے کس زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

الف) شہری

ب) دیہی

ج) دفتری

د) بازاری

3. ''دھان'' سے ہم کیا حاصل کرتے ہیں۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO not found.

.1 مٹر

.2 چاول

.3 تیل

.4 بور لگنے کا مطلب ہے۔

الف) سرسوں پھولنا

ب) گلاب کھلنا

ج) آم لگنا

15.10 متن کی تشریح

رہے یہ دیوالی کی جگ مگ بہار
منڈیروں پہ جلتے دیوں کی قطار
رہے آسماں پر دمکتا ہلال
رہے یہ بسنتوں کے میلے کی دھوم
شادیہ گیت گاتے ہجوم
حسیں راکھیاں جھلملاتی رہیں
جھماجھم ستارے لٹاتی رہیں
گھروں کا تقدس رہے بر قرار

ہندوستان قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ اور مشرقی روایات کا امین ملک ہے نظم کے اس حصے میں شاعر نے انسانی تعلقات، محبت و یگانگت کی مختلف کیفیات کو بیان کیا ہے۔ اس حصے میں بھی قبل کے دو حصوں کی طرح انسانی معاشرے کے ان روایات کو برقرار رکھنے کی تمنا کی ہے۔ ہماری مشرقی خواتین کی آنکھوں میں حیا، سر پر آنچل ان کے تقدس کی پہچان ہے۔ ان کی شرافت کی نشانی ہے۔

اٹوٹ محبت اور پیار پر قائم و دائم عورت و مرد کا رشتہ جسے ہیر رانجھا جیسے محبت کرنے والوں نے جان کی قربانی دے کر زندہ و پائندہ کر دیا۔ ہمارا آپس میں روٹھنا پھر مان جانا ایک دوسرے سے لڑنا پھر ایک ہو جانا۔ یہ ہماری تمنا ہے کہ ہماری تہذیب میں برقرار رہیں۔ کیونکہ یہ منفرد روایات ہیں جو کہیں اور نہیں پائی جاتی ان سے ہم نے اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔ عالمی سطح پر ہمارا ملک اپنی قدروں اور روایات کے لئے مشہور ہے۔ تو ان کی سلامتی کے لئے دعا گو ہونا اور حتی الوسع کوشش کرنا ہر وطن پرست کا فرض ہے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

15.11 زبان کے بارے میں

’’سلامت رہیں ہیر رانجھا کے گیت‘‘ میں صنعتِ تلمیح ہے۔ ہیر اور رانجھا دو پیار کرنے والے تھے۔ جن کو زمانے نے ملنے نہ دیا اور دونوں کا انجام موت ہوا۔ جس طرح عرب میں لیلیٰ اور مجنوں اور ایران میں شیریں اور فرہاد اور یورپ میں رومیو جولیٹ کے قصے مشہور ہیں۔ اور یہ پیار کرنے والوں کے لئے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں اسی طرح ہندوستان میں ہیر اور رانجھا کا قصہ مشہور ہے۔

متن پر سوالات 15.5

1. حیا کا مطلب بتایئے:

الف　پیار

ب　شرم

ج　مسکراہٹ

2. کالم الف کو ب سے ملا کر صحیح جوڑا بنایئے۔

الف	ب
مجنوں	ہیر
رومیو	جولیٹ
رانجھا	لیلیٰ

3. ہار کا متضاد ’’جیت‘‘ ہے۔ ذیل کے متضاد بتایئے۔

خوشی، مشکل، نفرت، ایماندار۔

4. لفظ محبت کے تین مترادفات لکھئے۔

15.12 متن کی تشریح

یہ بیٹوں کے ماتھوں پہ ماؤں کا پیار
سلامت رہیں دل میں کھلتے چمن

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

سلامت رہے انکھڑیوں کی حیا
سلامت رہیں گھونگھٹوں کی ادا
سلامت رہیں ہیر رانجھا کے گیت
رہی ہار میں بھی محبت کی جیت
لجانا رہے مسکرانا رہے
منانا رہے روٹھ جانا رہے

نظم کے اس حصے میں شاعر نے ہندوستان کے مختلف تیوہاروں کا ذکر ان کی خصوصیات کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اپنے مذہبی رسومات کی ادائیگی کرتے اور تیوہار مناتے ہیں اس لحاظ سے اس ملک میں بہت سے تیوہار منائے جاتے ہیں۔ایک طرف دیوالی میں دیوں سے پورا ملک جگمگاتا تو دوسری طرف عید کی دھوم دھام ہے۔کہیں رنگوں سے ہولی کھیلی جاتی ہے تو کہیں بسنت کا استقبال بسنت پنچمی منا کر کیا جاتا ہے۔ایک بہت منفرد تیوہار''رکھشا بندھن ہے''جس میں بہنیں اپنے بھائیوں کی کلائی پر خوبصورت دھاگے سے سجی سجائی راکھیاں باندھتی ہیں اور بھائی بہنوں کو تحفے دینے کے ساتھ ساتھ ان کے تحفظ کا بھی یقین دلاتے ہیں۔

15.13 زبان کے بارے میں

شاعر نے اس حصہ میں خوبصورت اشعار استعمال کئے ہیں اس شعر پر غور کیجئے۔

رہے ہولیوں کے سدا ہاتھ لال
فضاؤں میں اڑتا رہے یہ گلال

ہولیوں کے ہاتھوں کا لال ہونا مجاز مرسل ہے۔دراصل ہاتھ ہولی کھیلنے والوں کے لال ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ رنگوں کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔اس لحاظ سے ہولی اور ہاتھ میں بہت گہرا رشتہ ہے،ہولی کہہ کر شاعر نے ہولی کھیلنے والے مراد لیے ہیں۔

وضاحت کیجیے۔آسان الفاظ میں مجازِ مرسل کو سمجھایئے۔

جب کسی لفظ کے حقیقی معنی کو ترک کر کے اسکو صرف مجازی معنوں میں استعمال کیا گیا ہو اور اس کے حقیقی و مجازی معنی میں تشبیہوں کا تعلق نہ ہو بلکہ کسی دوسرے طرح کا تعلق ہو جیسے جزو کا یا ظرف مظروف وغیرہ تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں چاند کے لیے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے ہلال،پہلی تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں چودہویں تاریخ کے چاند کو بدر کہتے ہیں،عام استعمال کے لیے دیگر الفاظ قمر اور مہتاب بھی ہیں۔

NOS\NOTE2.tif not found.

متن پر سوالات 15.6

1. ہندوستان کے اہم تیوہاروں کے نام بتائیے۔
2. کالم الف کو کالم 'ب' سے ملا کر لکھئے۔

الف) عید میں رنگوں سے کھیلتے ہیں۔

ب) رکھشا بندھن میں دیا جلا کر چراغاں کرتے ہیں۔

ج) دیوالی میں خاص نماز ادا کرتے اور گلے ملتے ہیں۔

د) ہولی میں راکھی باندھتے ہیں۔

3. چانداور سورج کے تین مترادف لکھئے۔

15.14 متن کی تشریح

محبت کے چشمے ابلتے رہیں
جواں سال نغموں میں ڈھلتے رہیں
رہے دھوم ٹیگور و اقبال کی
رہے شان پنجاب و بنگال کی
رہے نام اپنے ادب کا بلند
دلوں میں سمایا رہے پریم چند
سدا زندگانی غزل خواں رہے
زمانے میں غالب کا دیواں رہے

نظم کے اس آخری حصے میں ہندوستان کی اہم شخصیتوں، شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں نے عالمی سطح پر شہرت حاصل کی ہے۔ اس سے قبل ہندوستان کے مختلف موسموں، تہواروں کا جس طرح سے ذکر کیا گیا ہے اس کے مطالعے کے بعد ہم اس نظم کو ہندوستان کا قصیدہ بھی کہہ سکتے ہیں ہندوستان کے مشہور شخصیتوں کے مشہور نام بنگالی ادب کے شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا ہے۔ ان کے کارناموں کی بنا پر ان کو ۱۹۱۳ء میں دنیا کا سب سے بڑا اعزاز نوبل پرائز برائے ادب دیا گیا۔ ٹیگور مغربی بنگال کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کا قومی گیت ''جن گن من'' لکھا ہے۔ علامہ اقبال ایک مشہور فلسفی، ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کا کلام حوصلہ مندی اور جہد مسلسل کی تعلیم دیتا ہے، آپ نے ہندوستانی قومی گیت ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ضرور پڑھا ہوگا۔ یہ اقبال ہی کا گیت ہے۔ اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ اردو اب

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO not found.

کے ایک اور اہم افسانہ نگار پریم چند ہیں، جنہوں نے اپنے انسانوں اور ناولوں میں خاص طور پر ہندوستان کی دیہی زندگی کا خوبصورت نقشہ پیش کیا ہے۔ پریم چند کا مشہور ناول ''گئو دان اور مشہور افسانہ ''کفن اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادب میں بہت بڑا مقام حاصل کر چکے ہیں اور غالب کی غزلیں شہرت دوام حاصل کر چکی ہیں، شاعر چاہتا ہے کہ ہندوستان کی یہ عظمت یہ شان وشوکت ہمیشہ برقرار رہے۔

15.15 زبان کے بارے میں

پہلے سفر میں رہے رہے کا تکرار ہے اس کا استعمال ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

15.7 متن پر سوالات

1. پریم چند کے تین مشہور افسانوں کے نام لکھئے۔

الف..................ب..................ج..................

2. کالم الف کو کالم 'ب' سے ملا کر لکھئے۔

اقبال: ....گئو دان

پریم چند: ....نیا شوالہ

غالب: ....'جن گن من'

رابندر ناتھ ٹیگور: دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔

آپ کیا سیکھا

نظم 'خاک وطن' جاں نثار اختر کی مثنوی 'امن نامہ'' سے ماخوذ ہے۔

☆ اس نظم میں شاعر نے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر اپنے ملک کی قابل فخر چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

☆ یہ ایک مثنوی ہے، مثنوی اصنافِ شاعری میں وہ قسم ہے جس میں کوئی تاریخی واقعہ یا عشقیہ داستان بیان کی گئی ہو۔ ان کے علاوہ دوسرے موضاعات پر بھی مثنویاں لکھی گئی ہیں اس میں مضمون مسلسل ہوتا ہے اور یہ طویل نظمیں ہوتی ہیں، مثنوی کا ہر شعر قافیہ رکھتا ہے۔ اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔

☆ کسی شعر کے ایک مصرعے میں یا دونوں مصرعوں میں ایسے الفاظ کا لانا جو متضاد ہوں صنعتِ تضاد کہلاتا ہے۔

☆ کلام میں کسی ایک لفظ کے ذریعے مشہور واقعہ یا مذہبی روایات کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔

☆ جب کسی لفظ کو حقیقی معنی کے بجائے اس کے مجازی معنوں میں استعمال کیا جائے اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہہ کا تعلق نہ ہو تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔

NOS\NOTE2.tif not found.

☆ وطن کی قابلِ فخر اشیاء اور شخصیات کا تذکرہ حب الوطنی کے جذبے کو مضبوط کرتا ہے اس لحاظ سے یہ نظم ایک مثالی نظم ہے۔ جو وطن پرستی کے جذبات سے معمور ہے۔
شاعر نے بہت ہی آسان اور عام فہم زبان میں ایک اہم مضمون نظم کیا جس میں سلاست کے ساتھ ساتھ روانی اور جذبے کا بھرپور تاثر موجود ہے۔

15.17 مزید مطالعہ

1. اردو ادب میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان، دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم، نواب مرزا شوقؔ کی مثنوی زہرعشق اور حفیظ جالندھری کی مثنوی شاہنامہ اسلام اپنی خصوصیات کی بنا پر بہت مشہور ہیں۔
آپ ان میں سے کسی ایک کا مطالعہ کیجیے۔
2. جاں نثار اختر نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی۔ آپ ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھ کر لطف اٹھائیے۔
3. یہ نظم خاک وطن ان کی مثنوی ''امن نامہ'' سے ماخوذ ہے' آپ امن نامہ حاصل کر کے پوری مثنوی پڑھیے۔
4. اس نظم کا موضوع وطن کی محبت ہے۔ آپ اس موضوع پر دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی پڑھیے:۔

اختتامی سوالات

1. اس نظم میں شاعر نے وطن کی جن چیزوں سے محبت کا اظہار کیا ہے ان میں سے چند کے نام تحریر کیجیے۔
2. ہندوستان میں منائے جانے والے تہواروں کے نام لکھیے۔
3. سیکری کے محل، تاج محل، اور اجنتا کی تاریخی اہمیت واضح کیجیے۔
4. لباس/مٹھاس، دھوم/ہجوم، ناز/گداز، پھبن/چمن، ناگ/آگ یہ سب قافیے ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ دو دو لفظ اور لگائیے جو ان کے ہم قافیہ ہوں۔
5. اس نظم میں شاعر نے کن مشہور شخصیات کا ذکر کیا ہے ان کے نام لکھیے۔
6. ہمارا قومی ترانہ ''جن گن من'' اور قومی گیت ''سارے جہاں سے اچھا'' کن شاعروں نے لکھا ہے۔
7. نظم میں بیان کی گئی دیہی زندگی کا نقشہ پیش کیجیے۔
8. نظم خاک وطن کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

15.1 1. (الف) سوالات (ب) جوابات
(ج) حالات (د) خیالات

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO not found.

2. خاک وطن، برگد کی چھاؤں، گاؤں کے تالاب، عمارات وروایات، مچھلیاں و کبوتر، جنگل بیابان

15.2 1. (الف) ہم معنی (ب) متضاد (ج) متضاد

2. کاویری، پیریار، گوداوری، ستلج، جھیلم

15.3 1. صبح بنارس، شام اودھ، تاج محل، نینی تال

2. توصیفی

3. (الف) فتح پور سیکری (ب) نینی تال (ج) تاج محل

15.4 1. (ب)

2. .2

3. (ج)

15.5 1. (ب)

2. لیلیٰ مجنوں، رومیو جولیٹ، ہیر رانجھا

3. غم، آسان، محبت، بے ایمانی

4. پیار، عشق، الفت

15.6 1. عید، ہولی، دیوالی

2. (الف) عید میں خاص نماز ادا کرتے ہیں اور گلے ملتے ہیں

(ب) رکچھا بندھن میں راکھی باندھتے ہیں

(ج) دیوالی میں دیا جلا کر چراغاں کرتے ہیں

(د) ہولی میں رنگوں سے کھیلتے ہیں

15.7 1. (الف) عیدگاہ (ب) پوس کی رات (ج) کفن

2. اقبال: نیا شیوالہ

پریم چند: گئودان

رابندناتھ ٹیگور: جن گن من

غالب: دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

نوٹ

16

اردو غزل کا ارتقاء

تعارف

غزل اردو شاعری کی ایک خاص صنف (قسم) ہے لغت کے اعتبار سے یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی عشق و رومان کی باتیں کرنا ہے۔ لیکن غزل کسی بھی زمانے میں اپنے لفظی معنی کی پابند نہیں رہی۔ ہر دور اور ہر زمانے میں غزل گو شاعروں نے مختلف موضوعات اور مختلف مضامین کو غزل کا موضوع بنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزل میں زندگی کے ہر رنگ کو سمونے کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے۔ اسی لیے یہ انسانی زندگی سے بہت قریب ہے۔ غزل کی اس خوبی کی وجہ سے ہی رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔''

غزل کی پہچان ہے کہ یہ نظم کی طرح مسلسل نہیں ہوتی۔ بلکہ غزل کا ہر شعر مضمون کے لحاظ سے مختلف اور اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ تمام اشعار ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اسے مطلع کہا جاتا ہے۔ اگر دوسرے شعر میں بھی ایسا ہی ہو تو اسے حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔ اور غزل کے سب سے اچھے شعر کو شاہ بیت یا بیت الغزل کہا جاتا ہے۔ پانچ، سات اور گیارہ اشعار کی غزل اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ پرانے شاعروں کے یہاں طویل غزلیں، دوغزلے اور سہ غزلے کہنے کا بھی رواج تھا۔ مگر اب یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اختصار اور تہہ داری غزل کی خوبی ہے۔

غزل کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کی ابتدا عربی قصدے سے ہوئی۔ قصیدے کے ابتدائی حصے میں شاعر عام طور پر حسن وشباب اور بہار کا ذکر کرتا ہے۔ عربی قصیدہ ایران پہنچا تو فارسی میں اسی طرز پر قصیدے کہے جانے لگے اور قصیدے کا یہ ابتدائی حصہ الگ سے شاعری کی ایک موہنی صنف یعنی غزل کہلانے لگا اور عشق و محبت کی باتیں اس کے لیے ضروری سمجھی جانے لگیں۔ اس کے لیے باقاعدہ الفاظ کا الگ نظام بنایا گیا۔ اس کی علامتیں اور ترکیبیں الگ ہو گئیں۔ فارسی سے غزل اردو میں آئی تو یہ تمام چیزیں جو فارسی میں اس کی خصوصیت تھیں اردو میں بھی اس کا ورثہ بن گئیں۔ لیکن اردو شاعروں نے بہت جلد اس ''زندہ صنفِ سخن'' کو اپنے ماحول میں ایسا ڈھالا کہ یہ پوری طرح ہندوستانی رنگ میں رنگ گئی۔

نوٹ

یہاں شروع سے اب تک اردو غزل کو بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ اردو شعراء نے غزل کو اپنے جذبات، کیفیات اور حالات کا ترجمان بنایا۔ اس کو خوب صورت اور دلکش لہجہ دیا۔ نرمی، شیرینی، بے ساختگی، لطافت اور نغمگی غزل کی خصوصیات ٹھہریں۔ غزل میں استعمال ہونے والی علامات اور تراکیب مثلاً شراب، ساغر، میخانہ، ساقی، قفس، صیاد، گل چیں اور دار و رسن وغیرہ کو وقت اور ماحول کے مطابق برت کر غزل میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔ اس کی تہہ داری اور لطافت کو اس حد تک بڑھایا کہ مشہور شاعر سیماب اکبر آبادی کے قول کے مطابق غزل اس مقام پر پہنچ گئی ۔

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

تاریخی حوالوں کے مطابق ہندوستان میں اردو شاعری کی ابتدا بارہویں صدی عیسوی میں ہو چکی تھی۔ مگر اردو غزل کی ترقی جس دور میں ہوئی وہ جنوبی ہند (دکن) میں سولہویں صدی کا آخری اور سترہویں صدی کا زمانہ ہے۔ اس عہد میں عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں نے غزل کی بہت سرپرستی کی۔ قطب شاہی خاندان کے تین بادشاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ اور اردو کے اچھے غزل گو شاعر تھے۔ قلی قطب شاہ تو فارسی، اردو اور تلنگی تینوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ یہ اردو میں قطب اور معانؔی تخلص کرتا تھا۔ قلی قطب شاہ پہلا اردو شاعر ہے جس کا کلیات سب سے پہلے شائع ہوا اس میں پچاس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ ان میں غزل کے علاوہ مثنوی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ سلطان قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں ہندوستانی روایات و رسوم اور مقامی تشبیہوں اور استعاروں کو فارسی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔ یہ ان کی فن کاری ہے کہ انہوں نے فارسی اور ہندی دونوں رنگوں کو بڑی خوبصورتی سے غزل میں سمو کر اردو غزل کو دلکشی بخشی۔ نمونہ کلام ۔

چھبیلی سوں لگیاں ہے من ہمارا
کہ اس بن تیئں ہمیں یکتل قرار

دکن میں محمد قلی قطبؔ شاہ سے ولؔی دکنی تک اردو غزل گو شاعروں کے جو نام ملتے ہیں ان میں محمد قطبؔ شاہ، عبداللہ قطبؔ شاہ، ملک نصرتؔی، غواصؔی، بحرؔی، ملا وجہی، حسن شوقی، ملک خوشنود، عواؔمی اور لطفی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اردو غزل کو ہندوستانی رنگ دینے اور اس کو زیادہ سے زیادہ خوب صورت بنانے کے لیے بڑی اچھی کوششیں کی ہیں۔ نمونے کے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں ۔

دنیا کا حکمت نا پوچھیں ہرگز حکیماں علم سوں
گاؤ ترانہ عیش کا ہر دم پیا کے نام پر
معانؔی

جہاں تو واں ہوں میں پیارے منجے کیا کام ہے کس سے
نہ بت خانے کی پروا ہے نہ مسجد کی خبر مجھ کو
معانؔی

نوٹ

منج نہ سر اپنے حال کا ہے پیا
چت منجے تج خیال کا ہے پیا

عوامیؔ

خوباں کی انجمن میں لالن ہوئے ہیں ساقی
نرمل شراب نیہہ کا اِک جام بھر نہ بھیجا

حسن شوقیؔ

یہ بول بولتا ہوں، موتی سوں رولتا ہوں
امریت گھولتا ہوں کھٹ دودھ کے انجمن میں

ملا خیالیؔ

دکن کی اردو غزل گوئی کا یہ شاندار زمانہ ولیؔ دکنی پر ختم ہوتا ہے۔ ولیؔ کی غزل میں زبان کا زیادہ نکھرا ہوا روپ ملتا ہے۔ انہوں نے ایک طرف غزل کی پرانی روایت کی پاسداری کی تو ساتھ ہی جدید تقاضوں کو بھی سمجھا۔ اسی لیے ان کی غزل میں تازگی اور توانائی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ عشق و محبت کی کیفیات، تصوف کے رموز اور زندگی کے مختلف تجربوں کو ولیؔ نے بڑی فن کاری سے غزل میں سمویا۔ ان کے کلام میں فارسی اور ہندی روایت کے دونوں دھاروں نے آپس میں مل کر جو رنگ اختیار کیا وہ ہندوستانی ہے۔ نمونہ کلام ؎

نہ ڈھونڈو شہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانہ تم
کہ ہے عشاق کا مسکن کبھی صحرا، کبھی پربت
مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ ۔ مجھ دل بیمار کا

تاریخی شواہد کے اعتبار سے شمالی ہند میں اردو غزل کی راہ ولیؔ کے ذریعے ہموار ہوئی یعنی ولیؔ کے دلّی آنے کے بعد یہاں کے شاعروں نے ریختہ کی طرف توجہ دی۔ ریختہ سے مراد یہ ہے کہ غزل میں فارسی الفاظ وافعال کے ساتھ ہندی الفاظ وافعال ملے جلے طور پر استعمال کیے گئے۔ یعنی فارسی اور ہندی ایک دوسرے سے گھل مل کر غزل میں پیش ہوئی۔ شمالی ہند میں یہ غزل کا پہلا دور ہے جس میں شاہ مبارک آبروؔ، فائزؔ دہلوی، یکرنگؔ، شاکر ناجیؔ، قائمؔ، شیخ شرف الدین مضمونؔ، یقینؔ، امیر خان انجامؔ، مرزا مظہر جان جاناںؔ، شاہ ظہور الدین حاتمؔ اور خان آرزوؔ جیسے مشہور شاعر ہوئے۔ سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ شمالی ہند

نوٹ

میں بہت ہنگاموں اور پریشانیوں کا تھا۔ مگر اردو کی ترقی کے لیے یہ زمانہ بہتر تھا کیونکہ حکومت کمزور ہونے کے سبب فارسی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ایسے میں شمالی ہند کے شاعروں نے غزل کی روایت کو سنبھالا تو اس میں نت نئے تجربے کیے اور اردو غزل میں ایہام گوئی (یعنی شعر میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے دو معنی نکلتے ہوں ایک قریب کے اور ایک دور کے) رواج پا گئی۔ فارسی ترکیبوں اور تشبیہوں کے ذریعے غزل کو بھاری بھرکم بنا دیا۔ لیکن یہ رنگ زیادہ دن قائم نہ رہ سکا اور تھوڑے عرصے بعد ہی اردو شعراء نے غزل میں سادگی اور سیدھے طرزِ بیان کو اپنا لیا۔ سلاست اور روانی، خیال کی بلندی اور پاکیزگی کا خیال رکھا جانے لگا۔ تصوف کے مضامین کو غزل میں جگہ دی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی اور ملک کی بدحالی کا ذکر غزل میں کیا گیا۔ اس دور کی غزل میں دلی کی تباہی کا چرچا بھی ہے اور لوٹ مار و غارت گری کا ذکر بھی۔ عاشق کی بے کلی کا بیان بھی ہے اور محبوب کی بے توجہی اور ستم کا ذکر بڑے دلکش انداز میں ملتا ہے۔

پانی پت آج چھوڑ جو گتور تم چلے
تو راہ بیچ جائیو جاناں سنبھال کے
آبرو

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جگ بیتا
آبرو

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے فاتش پہ جور باغباں
مضمون

ٹک فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم
امیر خان انجام

مرزا مظہر جان جاناں، شاہ ظہور الدین حاتم اور سراج الدین علی خاں اور آرزو نے زبان کی درستگی، صفائی اور سادگی پر زور دیا۔ سخت اور بھدے الفاظ اور محاوروں کے استعمال کو ختم کیا اور فارسی کی نئی ترکیبیں اور تشبیہیں ایجاد کیں۔ نئے خیالات کو غزل میں پیش کیا اور ایہام گوئی کی روایت کو ختم کیا۔ دکنی الفاظ اور بھاشا کی جگہ فارسی الفاظ پر توجہ دی اور عشق مجازی کے ساتھ ہی عشق حقیقی اور صوفیانہ خیالات غزل میں پیش کیے ان کے کلام میں درد اور اثر پایا جاتا ہے۔ دلی جذبات کے گداز نے ان کی غزل کو دلکشی بخشی۔

نوٹ

آتا ہے ہر سحر اٹھ تری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
خان آرزو

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں ہرے
شاہ حاتم

اٹھارہویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک اردو غزل نے کئی نئے موڑ لیے اور ترقی کی بہت سی نئی راہیں اپنائیں۔ اس زمانے میں شعرا نے غزل پر خاص توجہ کی۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے، الفاظ اور تراکیب کے لحاظ سے اور تشبیہ واستعارے کے حوالے سے بھی اس دور کی غزل زیادہ جاندار اور توانا ہے۔ اس میں وسعت اور گہرائی بڑھی۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر، میر سوز، مرزا محمد رفیع سودا، انشار اللہ خاں انشا، مصحفی اور جرأت اس دور کے مشہور غزل گو ہیں۔ ان لوگوں نے اردو غزل میں معنی کی ندرت، بیان کی وسعت اور فکر و خیال کی بلندی کو جگہ دی۔ میر درد نے تو خاص طور سے روحانیت اور تصوف کے مضامین کو غزل میں سمویا۔ ان کی غزل میں زبان کی پاکیزگی اور صفائی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
میر درد

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جس میں تو سما سکے
میر درد

گل پھینکے ہیں غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانۂ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
مرزا محمد رفیع سودا

برج میں دھوم ہورہی کی و لیکن تجھ بغیر
یہ گلال اڑتا نہیں بھڑکی ہے اب یہ تن من میں آگ
سودا

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
سودا

نوٹ

اردو غزل کی تاریخ میں میر تقی میرؔ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو جو سادگی، بے ساختگی اثر، خستگی، نشتریت کے ساتھ تغزل، شیرینی، لہجہ کی نرمی، ترنم اور معنی کی گہرائی بخشی۔ میرؔ نے اپنے غم کو دنیا کے غم سے ہم آہنگ کر کے غزل کو ایک نئی کسک اور آنچ دے دی۔ غم عشق، غم روزگار اور ذاتی تجربات اور احساسات کو اچھوتے انداز سے پیش کر کے میرؔ نے اردو غزل کے فن کو چار چاند لگا دیئے...

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں، ایہام بھی نہیں
ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے
الٹی ہوگئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
میر تقی میرؔ

اس زمانے میں باہری حملوں کے سبب دلّی میں آئی تباہی نے یہاں کے بہت سے شاعروں کو دلّی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت فیض آباد اور لکھنؤ میں فارغ البالی اور اطمینان کا دور تھا۔ میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ وغیرہ نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں کے درباروں میں ان کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ لکھنوی ماحول کی بے فکری اور خوش حالی نے عیش وعشرت کو بڑھاوا دیا۔ شاعری پر بھی اس ماحول کا گہرا اثر پڑا۔ زیادہ تر شاعروں نے زبان کے ظاہری حسن اور الفاظ کی شان وشوکت پر توجہ دینی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں غزل کی روح کمزور ہوگئی۔ غزل محض عیش ومسرت اور دل بہلانے کی چیز بن گی۔ خیال کی پاکیزگی اور فکر کی بلندی کی جگہ زبان کے چٹخارے پر زور دیا گیا۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ جیسا ذہین شاعر بھی پھکڑ پن کی حدوں میں داخل ہوگیا۔ انشاؔ، رنگینؔ اور جانؔ صاحب نے ریختی کو رواج دیا۔ غزل میں عورتوں کے لہجے اور ان کے جذبات کی عکاسی کو خاص دخل ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک تقریباً سوسوا سال کا عرصہ اردو زبان وادب اور خاص کر اردو غزل کے لیے بہت بہتر تھا۔ زبان، اسلوب، موضوع ہر لحاظ سے اردو غزل نے ترقی کی۔ فارسی تراکیب کو اردو رنگ دیا گیا۔ مشکل الفاظ کی جگہ آسان اور عام فہم الفاظ کو جگہ دی گئی۔ اور غزل کے مضامین میں ملکی اور قومی مسائل کے ساتھ ہی طنز ومزاح کو داخل کیا گیا۔

اسی زمانے میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا تصور قائم ہوا تو اردو غزل بھی دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے خانوں میں بٹ گئی۔ لکھنؤ والوں نے زبان وبیان پر خاص توجہ دی اور ناسخؔ نے اصلاح زبان کی اس تحریک کو پھر زندہ کر دیا جس کی ابتدا دلّی

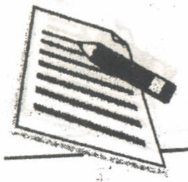

میں مرزا جان جاناں اور شاہ ظہورالدین حاتم نے کی۔ زبان کی درجہ بندی کردی گئی عوام کی زبان علاحدہ اور خواص کی زبان علاحدہ قرار دی گئی۔ اردو شاعری خاص طبقے اور خاص موضوعات تک سمٹ گئی۔ اور شعر گوئی پر طرح طرح کی پابندیاں لگادی گئیں۔ ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے اس رجحان کو اور آگے بڑھایا اور سختی سے اس پر عمل کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں لکھنؤ کی اردو غزل الفاظ کا پلندہ بن گئی۔ شعریت، گہرائی اور مزیت کے بجائے ظاہری حسن کے تذکرے، معاملہ بندی اور بیان کی صناعی کو جگہ دی گئی۔ کلام سے اثر اور سوز وگداز غائب ہوگیا۔

بال سلجھانا ترا کنگھی سے دل الجھائے ہے
اور بکھرا دیکھ کر بس جی ہی بکھرا جائے ہے

شیخ قلندر بخش جرأت

آئے جو میرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے
یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

جرأت

عجب لطف آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

انشا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احسان ہوتا

ناسخ

جو ترے پاس سے آتا ہے پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

رنگین

زبان کی درستگی، سادگی اور صفائی پر آتش لکھنوی نے بھی خاص دھیان دیا۔ مگر ان کا انداز ناسخ سے مختلف تھا۔ ان کی غزل میں تازگی اور شگفتگی ہے "بانکپن" ہے۔ فکر کی بلندی اور معنی کی وسعت و گہرائی ہے۔ آتش کا دعویٰ تھا کہ "خون جگر سے پرورش شعر ہم نے کی"۔

سن تو سہی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

نوٹ

حسن پری آں جلوہ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا
آتش

لکھنؤ کے برخلاف دلّی میں ماحول سنجیدہ تھا۔ یہاں وہ خوشحالی اور عیش نہ تھا۔ جس نے لکھنؤ کی غزل کو عارضی رنگینی اور رعنائی بخشی تھی۔ یہاں تو سیاسی ابتری اور پریشان حالی نے لوگوں کے مزاج میں ٹھیراؤ اور فکر کی بلندی پیدا کر دی تھی۔ لہٰذا غزل گو شاعروں کے یہاں بھی درد وغم کی کسک ہے اور بیتے ہوئے شاندار زمانے کی یادوں کی تڑپ ہے۔ اس تڑپ اور کسک نے اردو غزل کو جذبات کا گداز اور نرمی بخشی۔ یہاں غزل میں ظاہری حسن پرستی کی جگہ روحانیت، تغزل اور تہہ داری ہے۔ زبان وبیان کی پاکیزگی اور خیال کی لطافت ہے۔ شاہ نصیر، مومن، ذوق اور غالب دبستان دلّی کے اہم شاعر ہیں۔ شاہ نصیر نے زبان کی درستی اور اصلاح پر دھیان دیا۔ اپنی غزل میں نادر تشبیہوں اور مشکل زمینوں کا استعمال کیا۔ مومن خاں مومن نے شروع میں شاہ نصیر کی شاگردی کی مگر جلدی ہی اپنی ذہانت اور صلاحیت سے اردو غزل میں اپنی الگ حیثیت قائم کر لی۔ انہوں نے اردو غزل کو ایک نیا لہجہ اور نئی توانائی دی۔ بے تکلفی، خیال کی نزاکت، جدت، تشبیہ استعارے کی ندرت اور اسلوب کی تازگی سے مومن نے اردو غزل کو بہت دلکش بنا دیا ہے

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
مومن

شیخ محمد ابراہیم ذوق بھی شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے لیکن یہ بھی بہت جلد اپنے انداز میں مشہور ہو گئے۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد رہے۔ غزل کے علاوہ قصیدے میں بھی شہرت پائی۔ سودا کے بعد اردو میں قصیدہ گوئی کا سہرا ذوق کے سر ہی ہے۔ ان کی غزلوں میں سادگی اور صفائی ہے۔ خیالات پاکیزہ اور لطیف ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

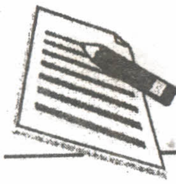

نوٹ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
ذوقؔ دہلوی

بہادر شاہ ظفرؔ نے شاعری وراثت میں پائی تھی۔ اردو کے دو بڑے شاعروں ذوقؔ اور غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ اپنے ذاتی احساسات، تجربات اور حسرت وغم کو ظفرؔ نے پرلطف زبان اور پر اثر انداز سے غزل میں پیش کیا۔ حالات اور واقعات کی سچائی، جذبہ، خلوص، دردمندی ظفرؔ کی غزل کی خوبیاں ہیں ۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ تو کسی تعارف کے محتاج ہی نہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو جو وسعت سادگی اور پرکاری، سلاست اور روانی، اختصار اور جامعیت، فکر کی بلندی اور معنی کی گہرائی عطا کی اس نے غزل کو ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔ غالبؔ کی غزل زندگی سے اس قدر قریب ہوگئی کہ زندگی کے سارے رنگ اس میں جھلکتے ہیں ذاتی تجربے اور مشاہدے کو جذبات اور خلوص کی آنچ دے کر غالبؔ نے جس طرح غزل میں پیش کیا یہ ان کا کمال ہے۔ غالبؔ نے اپنے مزاج کی شوخی اور بے تکلفی سے اردو غزل کو بھی شگفتگی اور تازگی بخشی۔ غم وآلام اور زندگی کے مختلف مسائل کو غالبؔ نے نئے نئے انداز سے غزل میں پیش کیا۔ انہوں نے اردو غزل کو نیا آہنگ دیا اور مضامین کی وسعت کے ساتھ ہی بیان کی شیرینی اور اثر کو بھی غزل میں داخل کیا ۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور
ابن مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
غالبؔ

غالبؔ اور مومنؔ کے علاوہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، منیر شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی جیسے مشہور اور اہم شاعر بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں غزل کو نیا رنگ روپ ملا۔ مضامین کی رنگارنگی اور بیان کی بے تکلفی و

نوٹ

دلکشی نے اردو غزل کو بڑی جاذبیت دی۔ امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی نے زبان کی شائستگی، محاورے کی درستگی، مضمون کی شوخی اور بیان کے اچھوتے پن پر بہت توجہ دی۔

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
پر جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

داغؔ دہلوی

۱۸۵۷ء کے بعد اردو میں داخل ہوئی۔ جدید نظم کی ترقی اور حالیؔ کی کڑی تنقید کا اردو غزل پر کافی اثر پڑا لوگ غزل سے بے توجہی برت کر نظم کی طرف دھیان دینے لگے۔ غزل کے خلاف باقاعدہ پروپیگنڈا شروع ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا گویا غزل کی ترقی رک گئی۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دن نہ رہی۔ کیونکہ غزل جاندار صنف ہے اور اس کا تعلق براہ راست زندگی اور اس کے مسائل سے ہے۔ لہٰذا اس مشکل دور میں غزل نے جلد ہی اپنی پوزیشن کو بہتر بنا لیا۔ اس کام میں اس زمانے کے اہم شاعروں جیسے امیر اللہ تسلیم، ریاضؔ خیر آبادی، جلالؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، عزیزؔ اور آرزو وغیرہ نے خاص رول ادا کیا۔ انہوں نے غزل کی قدیم روایت کو نئے زمانے اور ادب کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اسی لیے ان لوگوں کو قدیم اور جدید کے درمیان ایک مضبوط کڑی کی حیثیت ملی۔

انیسویں صدی کے اس دور میں سیاسی، سماجی، ادبی ہر اعتبار سے بہت تبدیلیاں ہوئیں۔ مغربی علوم کی آمد اور جدید تہذیبی رویوں نے زندگی کی بہت سے اقدار کو بدل ڈالا تو شعر و ادب پر بھی اس کا خاصا اثر پڑا۔ تیزی سے بدلتے اس زمانے میں شاد عظیم آبادی حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، فانیؔ بدایونی اور جگرؔ وہ بڑے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی فن کاری سے اردو غزل کو زمانے اور زندگی کا ترجمان بنایا۔ پرانی روایات اور نئے تجربوں کو ملا کر انہوں نے غزل کو احساس کی نئی قوت، جذبے کا خلوص، سچائی اور خیال کی پاکیزگی دی۔ پرانے مضامین کی جگہ نئے مسائل اور موضوعات کو غزل میں داخل کیا۔ حسرتؔ نے سچے عاشقانہ جذبات کو پیش کر کے غزل کو سیاسی شعور بھی دیا۔ ملکی اور قومی مسائل کو غزل کا موضوع بنایا۔ اسی لیے ان کی غزل میں زندگی کا حسن اور حرارت دونوں موجود ہیں۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

حسرتؔ موہانی

جگرؔ نے اردو غزل کو تغزل کی شیرینی اور ترنم سے مالا مال کیا۔ عاشق اور محبوب کے جذبات کی ترجمانی بڑے فن کارانہ انداز

نوٹ

میں کر کے غزل کو انوکھا حسن بخشا۔ جب کہ اصغر نے تغزل اور حسن آفرینی کے ساتھ تصوف کے مضامین سے بھی غزل میں وسعت پیدا کی۔ ان کے یہاں فکر کی بلندی ہے۔ ان کی سوچ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اپنے وسیع خیالات اور احساسات کو انہوں نے خوب صورت تشبیہوں اور ترکیبوں اور نئی علامتوں کے ساتھ پیش کر کے غزل کو خوشگوار لہجہ اور تازہ حسن دیا۔

آلام روزگار کو آساں بنا . دیا
جو غم دیا اسے غم جاناں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے، کہ گلستاں بنا دیا

جگر

فانی بدایونی نے اپنے غم و آلام کی آمیزش سے اردو غزل کو نیا احساس اور گداز بخشا۔ انہوں نے حیات اور غم کے فلسفے کو غزل میں سمویا۔ خستگی، محرومی اور کسک نے ان کی غزل کو ایک علیحدہ رنگ دیا۔

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

فانی

حسرت، فانی، جگر اور اصغر کے علاوہ بھی اس زمانے میں بہت اہم شاعر ملتے ہیں۔ جنہوں نے غزل کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ زندگی کے نت نئے تجربوں کو اس میں شامل کر کے غزل کے لہجہ میں طاقت اور توانائی پیدا کی۔ اور اس کو خالص ہندوستانی رنگ اور ہندوستانی تہذیب میں ڈھالا۔ اس سلسلے میں فراق گورکھپوری، اختر شیرانی، سیماب اکبر آبادی اور علامہ اقبال خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ فراق نے ہندو دیو مالائی عناصر اور اساطیری روایات کو غزل کا حصہ بنایا اور غزل میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کی۔ انہوں نے برج بھاشا، کھڑی بولی اور اودھی کی تراکیب اور محاوروں کو غزل کی زبان میں استعمال کر کے اردو غزل کی زبان کو وسعت دی۔

اقبال نے اردو غزل کی نئی معنویت اور گہرائی دی۔ انہوں نے نئی فکر اور نیا لہجہ غزل میں اپنا کر اس کو فن کی بلندی پر پہنچایا۔ ان کی غزل کا تعلق صرف دلی جذبات سے نہیں دماغ سے بھی ہے۔ انہوں نے خیال کی نئی راہیں دکھائیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اقبال

نوٹ

روشنائی زیادہ نظر آتی۔

ایک مہینے کے قریب یہی ہوتا رہا لیکن اب سرخی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ اور کوئی تین ماہ بعد بغیر تصحیح کے اس لڑکے کی ترجمہ کی ہوئی خبر چھپی۔ اس نوعمر صحافی کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ کئی برس استاد کے ساتھ کام کیا۔ کھانا گھر میں سے آجاتا۔ استاد کپڑے بنادیتے۔ بعد میں معمولی سی تنخواہ مقرر کردی۔

اس نوجوان صحافی نے صحافت سیکھی لگن سے۔ صحافت کا پہلا اصول ہے لگن۔ شوق، مستقل مزاجی۔

صحیفہ عربی کا لفظ ہے جس کے معنی اردو میں ہیں کتاب یا ورق۔ صحافت اسی سے بنا ہے۔ لیکن کتاب کے بدلے اس کے معنی ہوگئے اخبار نکالنے کا فن، اخبار، خبر کی جمع، یعنی خبروں کا مجموعہ صحافی کو تاریخ کا گواہ کہا گیا ہے۔ جو کچھ آج ہو رہا ہے، صحافی اسے دیکھتا ہے اور چھاپ دیتا ہے۔ آج کی خبر کل تاریخ میں چلی گئی۔ اس لیے صحافی اس واقعے یا خبر کا سب سے مستند گواہ ہے۔

اخبار یا خبرنامے وقفہ اشاعت کے لحاظ سے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ روزانہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ۔ ان میں ہر ایک کا مقصد اور دائرۂ کار مختلف ہے۔ روزنامے اس کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ شہر، علاقے، ملک یا دنیا کی خبریں سب سے پہلے اپنے اخبار کے قارئین تک پہنچائیں۔ وہی اخبار اچھا سمجھا جاتا ہے جو تازہ بہ تازہ خبریں دیتا ہے۔ کسی اور قسم کے اخبار تازہ خبروں کے لیے نہیں نکالے جاتے۔ ان کے مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہ اخبار یا رسالے تازہ خبروں پر زور نہیں دیتے بلکہ کسی خاص قسم کے مضامین اور خبریں شایع کرتے ہیں۔ کچھ رسائل ادبی ہیں تو کچھ کسی اور موضوع کو اپنا دائرلہ کار قرار دیتے ہیں۔ اس دائرۂ کار کو پالیسی کہتے ہیں۔ مثلاً کچھ رسائل یا اخبار مذہبی ہوتے ہیں، کچھ کھیل سے متعلق، کچھ سائنسی ہوتے ہیں تو کچھ تعلیمی اور ان سب دائروں میں کام کرنے والے صحافی ہیں اور ان کا عمل صحافت۔

کسی روزنامے کے صحافی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ خبروں وغیرہ کو زبان کے اعلیٰ معیار پر شایع کرسکیں۔ لیکن ایسے فیچر یا مضامین جن کی اشاعت میں تعجیل ضروری نہ ہو، زبان اور ادب کے لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں۔ اچھے روزناموں میں ایسے صحافی رکھے جاتے ہیں جو زبان اور ادب کے اعلیٰ معیار کو باقی رکھتے ہیں۔ سہ روزہ اور ہفتہ وار اخبار نویسوں کے پاس خبروں کو بہتر انداز میں شایع کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ ان کے یہاں معیار، عجلت کے مقابلے میں اہم ہوتا ہے۔ بعض اخبار بھڑکیلی سرخیوں کے ساتھ اخبار کو زیادہ خوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ پندرہ روزہ اور ماہنامے علم و آگہی کے کسی ایک موضوع پر نکالے جاتے ہیں۔ مثلاً سیاسی، ادب، سائنس، تعلیم، کھیل کود، مذہب وغیرہ۔ سہ ماہی اور ششماہی رسائل عام طور پر ادبی یا کسی موضوع پر تحقیقی مواد پیش کرتے ہیں۔ سالانہ اشاعت والے میگزین عام طور پر تعلیمی اداروں کی طرف سے نکلتے ہیں۔ ان میں ادارے کے کارہائے نمایاں کی رپورٹ ہوتی ہے اور آنے والے زمانے کے عزائم شایع ہوتے ہیں۔

نوٹ

گزرتی رہی ہے...... اور وہ کبھی بھی صرف اپنے لغوی معنی میں محدود نہیں رہی۔ بلکہ کبھی اس میں عشق و رومان کے قصے بیان کیے گئے تو کبھی پند و نصائح کا کام اس سے لیا گیا۔ کبھی وطن کی عظمت اور محبت کو غزل کا موضوع بنایا گیا۔ کبھی سرمایہ داری کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ کبھی معاشرے کی بے چینی اور کرب کو غزل نے آئینہ کر دیا۔ غرض یہ کہ واقعتاً ''ہماری پوری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے۔'' اس لمبے تاریخی سفر میں غزل ہمیشہ اپنی روایات سے جڑی رہی۔ غم محبوب اور عشق کی کسک آج بھی غزل کا موضوع ہے اور خیال کی وسعت کے ساتھ بیان کی رنگینی، لہجہ کا رس، جذبے کا رچاؤ محبت کی گرمی اور حسن کی نرمی آج بھی غزل کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

آپ نے کیا سیکھا

غزل کا ہر شعر معنی اور مطلب کے اعتبار سے مختلف اور اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ غزل کے تمام اشعار ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کو مطلع اور آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے۔

غزل شاعر کے جذبات قلبی واردات و کیفیات اور حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ نرمی، تازگی، سادگی، شیرینی، بے ساختگی، لطافت اور نغمگی غزل کی خصوصیات ہیں۔

سولہویں سترہویں صدی میں دکن کے مشہور غزل گو شعراء کے نام ہیں، معانیؔ، عوامیؔ، حسن شوقیؔ، ملا خیالی اور ولیؔ دکنی۔

اٹھارویں انیسویں صدی میں غزل میں وسعت اور گہرائی بڑھی۔ اس دور کے مشہور غزل گو شعراء ہیں۔

خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ، میر سوزؔ، سوداؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، مصحفیؔ، جراتؔ وغیرہ۔ میر دردؔ نے خاص طور پر روحانیت اور تصوف کو غزل میں سمویا۔

انیسویں صدی میں باہری حملوں کے سبب بہت سے شعراء لکھنؤ اور فیض آباد چلے گئے۔ لکھنؤ میں ناسخؔ اور ان کے شاگردوں نے غزل میں شعریت اور گہرائی کی جگہ ظاہر حسن، معاملہ بندی اور بیان کی صناعی کو جگہ دی۔

جو شعراء دہلی میں رہ گئے ان میں شاہ ظفرؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ مشہور ہوئے۔ دلّی کی غزل میں درد و غم کی کسک ہے، جذبات کا گداز اور نرمی ہے، ظاہر حسن کی جگہ روحانیت، تغزل اور تہ داری ہے۔ غالبؔ نے غزل کو ایک نیا رنگ دیا۔ انہوں نے اردو غزل کو وسعت، پرکاری، سلاست اور روانی، اختصار اور جامعیت، فکر کی بلندی اور معنی کی گہرائی عطا کی۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو غزل ایک نئے دور میں شامل ہوئی۔ شاد عظیم آبادی، حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، فانیؔ بدایونی اور جگرؔ اس دور کے بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی فن کاری سے اردو غزل کو زمانے اور زندگی کا ترجمان بنایا۔ پرانے مضامین کی جگہ نئے مسائل اور موضوعات غزل میں داخل ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی اس زمانے میں بہت اہم شاعر ملتے ہیں۔ انہوں نے غزل کو خالص ہندوستانی رنگ میں ڈھالا۔ اس سلسلے میں فراقؔ گورکھپوری، اخترؔ شیرانی، سیمابؔ اکبر آبادی اور علامہ اقبالؔ

نوٹ

خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کا زمانہ غزل کے لیے ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے کچھ شاعروں نے نئے نئے تجربے کیے۔ اشتراکی نظریات اردو ادب میں راہ پا گئے۔ اس دور کے شعرا میں فراقؔ، مجنوںؔ، مجازؔ، جذبیؔ، مخدومؔ، نظم گو مجروحؔ سلطانپوری، غلام ربانی تاباںؔ، جاں نثار اخترؔ، فیض احمد فیضؔ وغیرہ اہم ہیں۔

اختتامی سوالات

1. غزل کے اشعار کی کیا خوبیاں ہیں؟
2. سولھویں سترہویں صدی کے چار مشہور شعرا کے نام لکھیے؟
3. اٹھارویں انیسویں صدی کی غزل میں کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس دور کے چار غزل گو شعرا کے نام لکھیے؟
4. دلّی اسکول کے چار غزل گو شعرا کے نام لکھیے؟
5. دلّی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی غزل میں کیا فرق ہے؟
6. ایسے دو شاعروں کے نام لکھیے جنھوں نے اردو غزل کو خالص ہندوستانی رنگ اور ہندوستانی تہذیب میں ڈھالا؟
7. ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے دو شعرا کے نام لکھیے؟

نوٹ

17

میر تقی میر

شاعر کا تعارف

میر تقی میر 1772 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد نے کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس لیے میر کی زندگی شروع سے تنگی اور پریشانی میں گزری۔ خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے میر کو گھر چھوڑنا پڑا۔ اور دہلی آ کر اپنے ماموں سراج الدین علی آرزو کے یہاں رہنے لگے۔ آرزو فارسی کے بڑے عالم اور اردو کے مشہور شاعر تھے۔ لیکن میر یہاں بھی زیادہ نہیں رہے۔ برسوں دہلی کی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ اپنی خوددار طبیعت اور تنک مزاجی کی وجہ سے میر کہیں سکون سے نہیں رہ سکے اور لکھنؤ چلے آئے۔ وہاں نواب آصف الدولہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ لکھنؤ میں ہی 1810 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اردو شاعری میں میر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انہیں ''خدائے سخن'' اور ''شہنشاہ غزل'' بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں دردمندی، محرومی اور مٹتی ہوئی تہذیب کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں، جس نے ان کے کلام میں گہرائی اور وسعت پیدا کر دی ہے۔ ذوق اور غالب جیسے شاعر بھی ان کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔

ریختے کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر نے خود اپنی شاعری کے بارے میں کہا تھا۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

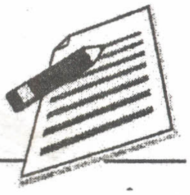
نوٹ

مقاصد

اس غزل کو پڑھنے کے بعد آپ:

- اشعار کی تشریح بیان کر سکیں گے؛
- مختلف صنعتوں کو سمجھ کر ان کا استعمال کر سکیں گے؛
- شاعر کے اسلوبِ بیان پر اظہارِ خیال کر سکیں گے؛
- میرؔ کے اسلوبِ بیان کی خصوصیت جان سکیں گے۔

17.1 اصل سبق

آیئے ایک بار ہم پوری غزل پڑھ لیں۔

غزل

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اِس بیماریٔ دِل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سپیدوسیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور صبح کو جوں توں شام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

بیماریٔ دل: دل کی بیماری
کام تمام کرنا: جان لے لینا
عہد: زمانہ، دور
پیری: بزرگی، بڑھاپا
ناحق: جو سچ نہ ہو، غلط
تہمت: الزام
مختاری: بااختیار ہونا
عبث: بےکار، بےوجہ
سپیدوسیاہ: سفید اور کالا، نظامِ کائنات
سرزد ہونا: واقع ہونا
وحشت: دیوانگی
کوسوں: بہت دور
اور: طرف
گام: قدم
قشقہ: تلک، ٹیکا
دیر: مندر، بُت خانہ

نوٹ

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اِس بیماری دِل نے آخر کام تمام کیا

17.2 متن کی تشریح

پہلے مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری کے علاج کی بہت کوششیں کی گئیں پر کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوا اور ساری کوششیں بے کار گئیں۔ دوسرے مصرعے میں بیماری کا پتا چلتا ہے کہ یہ دل کی بیماری یعنی مرضِ عشق ہے اور اسی مرضِ عشق نے آخر عاشق کی جان لے لی۔

مرضِ عشق میں گرفتار ہونے کے بعد اُس سے چھٹکارا نہیں پایا جا سکتا۔ عشق کا مرض لاعلاج ہے۔

ایک دوسرے شعر میں بھی کم و بیش یہی بات کہی ہے۔

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شعر کی خوبی یہ ہے کہ جیسے یہ بات شاعر نہیں کہہ رہا ہے بلکہ کوئی دوسرا شخص شاعر کو یہ بات جتا رہا ہے۔

17.3 زبان کے بارے میں

شاعر نے پہلے مصرعے میں 'کام کیا' کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں کام تمام کیا (محاورہ) کا اچھا اور خوب صورت استعمال کیا ہے۔

'دیکھا' لفظ سے ظاہر ہے کہ بار بار سمجھانے کے باوجود عاشق باز نہیں آیا اور اس پر سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''دیکھا'' خطابیہ لہجے میں پڑھیں اور سوالیہ لہجے میں بھی۔

اس شعر میں لفظ 'دیکھا' کا استعمال بہت خوب صورتی سے کیا گیا ہے یہ لفظ بڑا بامعنی ہے۔ اس میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ ہم نے پہلے بھی خبردار کیا تھا۔ مگر تم نہیں مانے مختصراً اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ''ہم نہ کہتے تھے۔''

نوٹ

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

17.4 متن کی تشریح

جوانی کا زمانہ رو رو کر گزارا اور بڑھاپے میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے رات تو جاگ جاگ گزاری اور صبح ہوئی تو نیند آ گئی۔

عہدِ جوانی رو رو کر کاٹنے کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ سخت مشکل سے گزارا یعنی جوانی کے زمانے تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں میں گزرے۔ جوانی جو اصل لطف کا زمانہ ہے وہ تو تکلیف میں گزری اور جب زندگی کی آسائش میسر بھی ہوئیں تو بڑھاپے میں یعنی موت کے وقت۔ کبھی کبھی ساری رات جاگنا ہر انسان کے تجربے میں آتا ہے۔ نیند نہ آنے پر بڑی بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ رات کو زیادہ جاگتے رہنے کے سبب صبح کو نیند آنے لگتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی بھر کا تھکا ماندہ انسان آخری وقت میں اپنے آپ کو وقت کے حوالے کر دیتا ہے۔

17.5 زبان کے بارے میں

اس شعر میں صنعتِ تضاد کا دو جگہ استعمال ہوا ہے۔ پہلے مصرعے میں جوانی اور پیری دوسرے مصرعے میں رات اور صبح اس کی مثالیں ہیں۔ جوانی اور پیری رات اور صبح کے تعلق پر غور کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ شاعر نے بہت مناسب اور برمحل الفاظ استعمال کر کے شعر کا حُسن بڑھا دیا ہے۔

شاعر نے اس شعر میں رات کا متضاد صبح مانا ہے۔ جب کہ رات کا متضاد دن ہوتا ہے اور صبح کا متضاد شام۔

غور کیجیے تو آپ کو بڑھاپے کی وجہ سے بالوں کی سفیدی اور صبح کے اُجالے میں سفیدی کا ایک تعلق بھی نظر آئے گا۔

متن پر سوالات 17.1

1. پہلے شعر میں کس چیز کے اُلٹ جانے کا ذکر ہے۔

الف) دوا

ب) کام

ج) تدبیر

نوٹ

2. دوسرے شعر میں کون سے متضاد استعمال کیے گئے ہیں۔

الف) .... ج) ....

ب) .... د) ....

3. کام تمام کیا محاورے کا مطلب ہے۔

الف) کام پورا نہ کرنا

ب) کام پورا کر دینا

ج) جان لے لینا

ناحق ہم مجبوریوں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

17.6 متن کی تشریح

اس شعر میں شاعر خدا کو مخاطب کر کے ایک شوخ بات کہہ رہا ہے۔ شاعر غزل میں اکثر شوخیاں کرتے ہیں۔ اس شعر میں بھی خدا سے شوخی کی گئی ہے۔ شعر میں انسان کی بے بسی اور مجبوری کی طرف اشارہ بھی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں نہ تو خود مختار ہے نہ با اختیار۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اور وہی جو کچھ چاہتا ہے، کرتا ہے تو ایسے میں اُسے خود مختار کہنا کہاں تک درست ہے اسی لیے اللہ نے انسان کو اپنی تابعداری کے لیے کہا ہے۔

17.7 زبان کے بارے میں

مجبوری اور مختاری تضاد کی مثالیں ہیں۔

شاعر کی نظر میں خود مختاری کی تہمت لگانا اور انسان کو صاحبِ اختیار کہنا اسے بدنام کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ وہ تو خدا کی منشا کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ شاعر بڑی خوب صورتی سے ان افعال کی ذمہ داریوں سے بھی بچنا چاہتا ہے جو اس سے سرزد ہو جاتے ہیں۔

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور صبح کو جوں توں شام کیا

17.8 متن کی تشریح

اس شعر میں شاعر انسان کی بے بسی کی بات کہہ رہا ہے اس معاملات میں اُسے صرف اتنا ہی اختیار ہے کہ وہ بڑی مشکل سے

نوٹ

رات سے صبح تک کاوقت گزارتا ہے اور بڑی دشواریوں کے بعد صبح سے شام تک کاوقت کاٹتا ہے۔غرض انسان کی زندگی بڑی مشکلوں اور مصیبتوں میں گزرتی ہے۔

اس شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان دراصل بے بس اور مجبور ہے۔اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔اگر کچھ اختیار ہے تو بس اتنا کہ وہ جیسے تیسے مشکلوں اور پریشانیوں سے زندگی گزارے شاعر نے سفید وسیہ کی مناسبت سے رات اور صبح کا ذکر بھی بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔

17.9 زبان کے بارے میں

سپید وسیہ سے مراد اچھائیاں اور برائیاں یا نظام کائنات ہے۔دوسرے مصرعے میں رات اور صبح کے الفاظ آئے ہیں اس لیے سپید وسیہ کی ترکیب کا استعمال لطف دیتا ہے۔

لفظ 'یاں' سے مراد یہاں 'دنیا' ہے۔

رو رو کر صنعتِ تکرار کی مثال ہے۔اس سے کسی بات میں زور پیدا ہوتا ہے

متن پر سوالات 17.2

1. شاعر تیسرے شعر میں کس سے مخاطب ہے۔

   الف) محبوب سے

   ب) دوست سے

   ج) خدا سے

2. اسی شعر میں انسان پر کس چیز کا الزام ہے۔

   الف) مجبوری کا

   ب) مختاری کا

   ج) بدنامی کا

3. یاں کے سپید وسیہ سے مراد ہے۔

   الف) محبوب کی محفل کے معاملات

   ب) مے خانے کے معاملات

   ج) دنیا کے معاملات

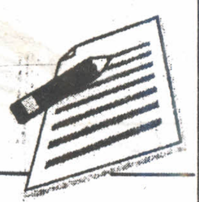

نوٹ

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

17.10 متن کی تشریح

اس شعر میں مذہبی رواداری کی بات کی گئی ہے۔ مذہب انسانیت کا سبق دیتا ہے ظاہری رکھ رکھاؤ یعنی ٹوپی یا ماتھے پر قشقہ لگانا، زنار یعنی جنیو پہنا یہ سب کچھ ایک طرح کا دکھاوا ہے اصل چیز انسانیت ہے۔ یہاں شاعر نے خود اپنے بارے میں کسی خاص طریقے سے منحرف ہونے کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کا یہ بیان اس کا اپنا بیان نہیں بلکہ یہ کوئی اور شاعر کے بارے میں اپنی رائے دے رہا ہے کہ وہ اب اپنے مذہب پر کاربند نہیں ہے۔ یہ کردار جو شاعر پر جو کہ انسانیت کا پجاری ہے اس لیے یہ الزام لگا رہا ہے کیونکہ وہ بھی مذہب کے نام پر ڈھونگ رچانے والا ایک کردار ہے جسے انسانیت سے زیادہ مذہب کی فکر ہے۔

شاعر کے نزدیک خدا مسجد میں بھی ہے اور مندر میں بھی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا مندروں میں نہیں ہے، ان کو مخاطب کر کے شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ تلک لگا کر مندر جانا بھی خدا کی عبادت کا ایک طریقہ ہے۔

شاعر کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے اکثر مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اس شعر میں بھی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن دراصل اس کی خواہش ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات ختم ہوں۔ اور وہ ایک دوسرے سے قریب آسکیں۔

17.11 زبان کے بارے میں

دین کے معنی مذہب کے بتائے جاتے ہیں جب کہ دین کا مطلب اصول اور قانون ہے "قشقہ" ماتھے پر کھینچا جاتا ہے۔ اس شعر میں بولنے والا شاعر نہیں کوئی دوسرا ہے سوالیہ انداز کا اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو کے معنی میر کے بارے میں تو اب بات کرنا بھی گناہ ہے کیونکہ اس نے اپنے مذہب کو ترک کر دیا ہے۔

متن پر سوالات 17.3

1. رات رو رو کر کاٹنے کا مطلب ہے
   - الف) رات بھر روتے رہنا
   - ب) رات مشکل سے گزارنا
   - ج) رات کو تارے گنتا
2. مندرجہ ذیل مصرعوں کو مکمل کیجئے۔

نوٹ

الف) ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے......................

ب) ....دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

3. 'قشقہ کھینچا'، 'دیر میں بیٹھا' سے شاعر کی مراد ہے کہ

الف) اُس نے دوسرا مذہب اختیار کرلیا

ب) اس نے دین اسلام چھوڑ دیا

ج) وہ مذہبی اختلافات ختم کرنا چاہتا ہے

آپ نے کیا سیکھا

- اس غزل میں انسان کی بے بسی و مجبوری کا ذکر کیا گیا ہے۔
- اس غزل کا قافیہ اسم اور ردیف فعل کو بنایا گیا ہے۔ اس پابندی سے غزل میں ایک خاص طرح کی موسیقیت پیدا ہوئی ہے۔
- اس غزل میں شاعر نے محاوروں اور صنعتوں کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔
- میرؔ کو شہنشاہِ غزل اور خدائے سخن کہا جاتا ہے۔
- شاعر کا اندازِ بیان سادہ اور سلیس ہے۔
- شاعر کا انداز بیان موثر ہے۔

17.12 مزید مطالعہ

1. مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا مضمون مقدمہ کلام میرؔ پڑھیے۔
2. میرؔ کے کچھ اچھے اشعار اپنی کاپی میں لکھیے۔
3. مختلف شعرا کے ایسے اشعار تلاش کر کے لکھیے جن میں مذہبی رواداری کی بات کہی ہے۔

17.16 اختتامی سوالات

1. میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کیوں کہا جاتا ہے؟ لکھیے۔
2. سبق میں آئے ہوئے محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجئے۔
3. انسان کی مجبوریوں اور اس کے اختیار پر پانچ جملے لکھیے۔
4. میر کی شاعری میں درد و غم اور مایوسی کی وجہ کیا ہے؟ لکھیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

17.1 1. ج) تدبیر

2. الف) جوانی ج) رات

ب) پیری د) صبح

3. ج) جان لے لینا

17.2 1. ج)

2. ب) مختاری کا

3. ج) دنیا کے معاملات

17.3 1. الف) وہ اپنی غلطیوں کی معافی چاہتا تھا

2. الف) ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

ب) قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

4. ج

18

مرزا غالبؔ

شاعر کا تعارف

مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے کی۔ وہ جاگیردار تھے اور فوج میں رسالدار تھے۔ نو برس کی عمر میں چچا کا بھی انتقال ہو گیا تو انگریزی حکومت نے جاگیر کے بدلے کچھ پینشن مقرر کر دی اور غالب اپنے ننہال میں رہنے لگے۔ تیرہ سال کی عمر میں دہلی کے نواب الٰہی بخش معروفؔ کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد غالبؔ دہلی میں رہنے لگے۔ 15 فروری 1869ء کو غالبؔ کا انتقال ہو گیا۔

شعر و شاعری کا شوق غالب کو بچپن سے تھا۔ شروع میں اسدؔ تخلص کرتے تھے، بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ غالبؔ جس زمانے میں آگرے سے دہلی آئے اس وقت دہلی میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ غالبؔ بہت جلد مشہور ہو گئے۔ وہ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے اردو کے مقابلے میں ان کا فارسی کلام بہت زیادہ ہے۔ مگر انہیں شہرت اپنے اردو کلام ہی کی وجہ سے ملی۔ غالبؔ کو عام راستے سے الگ ہٹ کر نئی راہ پر چلنے کا شوق تھا۔ اس شوق کی وجہ سے وہ کافی مشکل زبان استعمال کرتے تھے لیکن کچھ دوستوں کے مشورے اور اصرار پر بعد میں وہ آسان زبان استعمال کرنے لگے۔

غالبؔ بڑے خوددار انسان تھے۔ انہیں اپنی عزت نفس کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ فطرتاً ذہین اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے۔ ذہانت اور شوخی کی یہ صفات ان کے کلام میں نمایاں ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

غالبؔ نے انسانی فطرت کا بہت غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا اور اکثر ان واقعات اور حالات کو بیان کیا جو لوگوں کو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں جتنے شعر ضرب المثل ہو گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ شعر غالبؔ کے ہیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نوٹ

غالبؔ نے اپنے کلام میں فلسفیانہ مضامین بیان کیے ہیں۔ اسی لیے اکثر انہیں فلسفی شاعر بھی کہا جاتا ہے فکر کی بلندی اور الفاظ کے معنی خیز استعمال کی بدولت ان کی ایک امتیازی شان ہے۔ غالبؔ نے اردو غزل کو خیالات کی تازگی اور موضوعات کی رنگارنگی سے وہ وقار بخشا جس کے سبب اردو دنیا ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔

مقاصد

اس غزل کو پڑھنے کے بعد آپ:

- غزل کے اشعار کی تشریح کر سکیں گے؛
- نئے الفاظ، نئی ترکیبیں اور نئی کہاوتیں سمجھ کر انہیں استعمال کر سکیں گے؛
- غالبؔ کے انداز بیان اور خصوصیات کو اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گے۔

18.1 اصل سبق

آیئے اب غزل پڑھیں:

غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کے وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یہ مسائل تصوف، یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

وصال: ملاقات
وصال یار: دوست سے ملاقات
نیم: آدھا
کش: کھنچا ہوا
نیم کش: آدھا کھنچا ہوا
خلش: چبھن
جگر: مراد دل
مسائل: مسئلہ کی جمع
تصوف:
بادہ خوار:

نوٹ

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

18.2 متن کی تشریح

غزل کے مطلع میں غالبؔ کہتے ہیں کہ دوست سے ملنا ہماری تقدیر ہی میں نہیں تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں مر گیا ورنہ جتنے دن بھی اور زندہ رہتا محبوب سے ملنے کے انتظار میں ہی گذر جاتے۔ وصال یار کبھی نہ ہوتا۔

18.3 زبان کے بارے میں

شاعر نے اگر اور ''جیتے رہتے'' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔

- کسی بات کو براہ راست نہ کہہ کر اس کی طرف صرف اشارہ کر دینا 'کنایہ' کہلاتا ہے۔ مثلاً ہم کسی سے کہیں ''مجھے تم سے اس بات کی امید نہیں تھی۔'' اس جملے میں ہم نے اپنے دوست کی کسی خامی کو براہ راست نہ بتا کر اشارۃً اسے اس کی کمی کا احساس دلایا۔
- لفظ ''وصال'' وصل سے بنا ہے۔ اس کے معنی ''ملاقات'' کے ہیں۔ یہ لفظ اکثر انتقال کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ مرنے کے بعد خدا سے ملاقات ہوگی۔ عورت اور مرد کے باہمی میل ملاپ کو بھی وصل اور وصال کہتے ہیں۔
- لفظ 'یار'' سے مراد محبوب یا دوست کے ہیں۔

تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

18.4 متن کی تشریح

محبوب نے شاعر سے ملاقات کا وعدہ تو کر لیا لیکن شاعر خوب جانتا ہے کہ محبوب اپنا وعدہ کبھی پورا نہیں کرے گا۔ اس لیے شاعر محبوب کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ اگر آج تم مجھے زندہ دیکھ رہے ہو تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ میں نے تمہارے وعدے کو سچ نہیں سمجھا تھا کیونکہ اگر مجھے تمہارے وعدے کی سچائی کا یقین ہو جاتا تو میں اس خوشی کی وجہ سے ہی مر گیا ہوتا۔

'خوشی سے مر جانا'' محاورہ ہے۔ بہت زیادہ خوشی کی وجہ سے موت ہو جانے کو 'شادیٔ مرگ' بھی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خلاف امید کوئی بہت بڑی خوشی کی خبر سن کر بھی انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

متن پر سوالات 18.1

درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

1. "اگر اور جیتے رہتے" کیا ہے؟
   (الف) استعارہ
   (ب) کنایہ
   (ج) تمثیل
   (د) تشبیہ

2. اس شعر میں شاعر کو کس چیز کی شکایت ہے؟
   (الف) محبوبہ کی بے وفائی کی
   (ب) زمانے کی
   (ج) اپنی بد نصیبی کی
   (د) اپنی بے وقت موت کی

3. شاعر کو اپنے محبوب کے وعدے پر اعتبار کیوں نہیں ہے؟
   (الف) شاعر کا محبوب جھوٹا ہے
   (ب) جھوٹ بولنا محبوب کی ایک ادا ہے
   (ج) شاعر نے محبوب سے خود بھی جھوٹ بولا ہے
   (د) شاعر محبوب کے سچ کو بھی جھوٹ سمجھتا ہے

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

18.5 متن کی تشریح

شاعر کہتا ہے کہ تیری نگاہوں کا تیر جو میرے دل میں چبھ کر رہ گیا ہے، اس سے میرے دل میں جو ٹیسیں اٹھ رہی ہیں اور اس میں مجھے ایک عجیب لذت کا احساس ہو رہا ہے۔ اس کی لذت کا حال کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اگر تیرا تیر میرے دل کے آر پار ہو جاتا تو یہ لطف اور یہ لذت کہاں سے حاصل ہوتی۔

18.6 زبان کے بارے میں

تیر نیم کش سے مراد وہ تیر ہے جس کو آدھی کمان کھینچ کر آہستہ سے چھوڑ دیا جائے۔ یعنی نظروں کا وہ تیر جسے ابرو کی کمان سے یا نیچی نظروں سے چھوڑا گیا ہو یہ تیر دل کے آر پار نہیں ہوا بلکہ دل میں چبھ کے رہ گیا ہے اور خلش سی پیدا کر رہا ہے۔

کمان خم لیے ہوئے ہوتی ہے اور ابرو بھی کمان کی طرح خم دار ہوتے ہیں۔ کمان سے تیر چھوڑا جاتا ہے اور ابرو سے اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے غالبؔ کا ''تیر نیم کش'' کہنا بہت خوب ہے۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

18.7 متن کی تشریح

شاعر کہتا ہے کہ میں کیا بتاؤں کہ شب غم یعنی دکھ بھری رات کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ ایک آفت ہے۔ اس میں انسان بار بار موت کی تکلیف اٹھاتا ہے اور پھر بھی اسے موت نہیں آتی۔ ایک بار مر کر انسان کو رنج و غم سے نجات مل جاتی ہے مگر شب غم میں تو ہر لحہ موت کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ہر لحہ مر مر کر گذارتا ہے۔

18.8 زبان کے بارے میں

''مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا'' دوسرے مصرعے میں شاعر نے یہ بات کہی ہے کہ ایک بار مرنا میرے لئے زیادہ تکلیف کا باعث نہیں تھا۔

متن پر سوالات 18.2

درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

1. شاعر بار بار مر کر بھی زندہ رہتا ہے کیونکہ
   (الف) اس نے آب حیات پی رکھا ہے
   (ب) محبوب کی محبت اسے مرنے نہیں دیتی
   (ج) شاعر محاورۃً مرتا ہے۔ واقعی نہیں مرتا

2. 'کنایہ' کے معنی ہیں
   (الف) ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دینا

(ب) کسی بات کو براہ راست نہ کہہ کر اشاروں میں کہنا

(ج) کسی بات کو اس طرح کہنا کہ فوراً سمجھ میں نہ آئے

(د) کسی بات کو استعارے میں کہنا

.5

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

18.9 متن کی تشریح

غزل کے مقطع میں غالبؔ خود سے مخاطب ہیں۔ وہ اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ اے غالبؔ! تو نے تصوف کے مشکل مسائل کو اس خوبی سے بیان کیا ہے اگر تجھے شراب پینے کی بری عادت نہ ہوتی تو میں تجھے ولی یعنی خدا کا مقرب بندہ یا پہنچا ہوا بزرگ مان لیتا۔

18.10 زبان کے بارے میں

شعر میں اپنی تعریف خود کرنے کو 'تعلی' کہتے ہیں۔

اس شعر میں غالبؔ نے خو اپنی تعریف کی ہے۔ اسی طرح غالبؔ کا ایک اور شعر ہے جس میں تعلی پائی جاتی ہے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

تعلی کے اشعار دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتے ہیں مثلاً میر تقی میرؔ نے کہا ہے ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

شاعر شعر میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے کوئی بات کہتا ہے تو اسے 'خود کلامی' کہتے ہیں۔ اس شعر میں 'تجھے' اور 'تیرا' غالبؔ نے اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ اور 'ہم' غالبؔ نے اپنے لئے ہی استعمال کیا ہے۔

دنیا سے بے نیاز ہو کر اللہ سے لو لگانے کو صوفی کہتے اور صوفیانہ خیالات کو تصوف کہتے ہیں۔

نوٹ

متن پر سوالات 18.3

درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

1. غالبؔ خود کو ولی سمجھتے ہیں کیونکہ

(الف) انھوں نے تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں۔

(ب) وہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔

(ج) اس شعر میں شراب کا ذکر ہے۔

2. بتائیے کس شعر میں تعلّی ہے۔

(الف) ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

(ب) دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

(ج) جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

18.11 انداز بیان

غالبؔ کا انداز بیان خوب صورت اور دل پر اثر کرنے والا ہے۔ خود غالبؔ نے مقطع میں انداز بیان کو اپنی شاعری کی اہم خوبی قرار دیا۔ استعارہ، کنایہ کے استعمال نے ان کے اشعار کو بہت خوب صورت بنا دیا ہے۔

اس غزل میں آسان اور سادہ الفاظ کے استعمال اور ان کی خوب صورت ترتیب نے غزل کو مترنم بنا دیا ہے۔

غالبؔ کی غزلیں عام طور پر موسیقیت سے بھرپور ہوتی ہیں۔ اس لئے انہیں گایا جاتا ہے۔

آپ نے کیا سیکھا

1. کسی بات کو براہ راست نہ کہہ کر اس طرح کہنا کہ ذہن فوراً اصل معنی کی طرف پہنچے 'کنایہ' کہلاتا ہے۔
2. کلام میں 'کنایہ' کا استعمال شاعری کے حسن کو نکھارتا ہے۔
3. کلام میں اپنی تعریف بیان کرنے کو 'تعلّی' کہتے ہیں۔
4. خود کو پہچان کر خدا تک پہنچنا صوفیوں کا مسلک ہے۔
5. غالبؔ کا انداز بیان خوب صورت اور دل پر اثر کرنے والا ہے۔
6. غالبؔ کی غزلیں موسیقیت سے بھرپور ہوتی ہیں۔

18.12 مزید مطالعہ

1. اس غزل کا آڈیو کیسٹ تلاش کیجیے اور سنیئے۔
2. غالبؔ کا دیوان پڑھیئے اور جو غزلیں پسند آئیں انہیں کاپی میں لکھئے۔
3. ایسے اشعار تلاش کیجئے اور انہیں کاپی پر لکھئے جن میں تعلّی ہو۔

اختتامی مشق 18.16

1. ہر شعر کا مطلب الفاظ میں بیان کیجیے۔
2. 'کنایہ' کن اشعار میں ہے، ان اشعار کی نشان دہی کرتے ہوئے 'کنایہ' کی وضاحت کیجئے۔
3. غالبؔ کی شعری خصوصیات بتاتے ہوئے ان کے انداز بیان کے بارے میں اپنی رائے لکھئے۔

متن پر سوالات کے جوابات

18.1 (1) ب
(2) الف
(3) ج

18.2 (1) ب
(2) ج
(3) ج

18.3 (1) ج
(2) ب
(3) الف

نوٹ

19

مومن خان مومنؔ

شاعر کا تعارف

محمد مومن خان کے آباو اجداد کشمیری شرفا تھے، جن کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ مومنؔ کے والد حکیم غلام نبی خاں دہلی کے کوچہ چہلان (کوچہ چیلان) میں رہتے تھے۔ مومنؔ کی ولادت 1800ء میں اسی محلے میں ہوئی۔

مومنؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں اس زمانے کے بہترین علما سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری شروع کی تو شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے۔ لیکن جلد ہی اصلاح کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

مومنؔ اپنے زمانے کے ذہین ترین لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہیں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی اور ان کا فارسی کلام بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ انہیں اپنے خاندانی پیشے طبابت کے علاوہ دوسرے بہت سے علوم وفنون مثلاً منطق، ہیئت، نجوم، ریاضی اور شطرنج میں بھی مہارت حاصل تھی۔ 1852ء میں مکان کی چھت سے گرنے سے انتقال ہوا۔

مومنؔ نے اپنی شاعری میں مختلف اصنافِ سخن کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ لیکن جس صنف سخن کے لیے وہ مشہور ہوئے، وہ غزل ہے۔ غزل کی عام روایت کے مطابق مومنؔ کا زیادہ تر کلام حسن وعشق کے گرد ہی گھومتا ہے۔ عاشق اور معشوق کے درمیان جو باتیں اور واقعات ہوتے ہیں، ان کے عاشقانہ بیان کو ''معاملہ بندی'' کہتے ہیں۔ معاملہ بندی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔ اگرچہ اس طرح انہوں نے اپنی غزل کا دائرہ محدود کر لیا۔ لیکن ان کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے اس محدود دائرے میں جدتیں پیدا کی ہیں اور اپنے کلام میں معاملہ بندی کو بڑی خوبی سے نباہا ہے۔

مومنؔ کے اکثر اشعار بہت مشکل ہوتے ہیں کیونکہ وہ اشاروں اور ادھوری باتوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ ان کی تشبیہات واستعارات ان کی سلیقہ مندی کا ثبوت ہیں۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کلام مومنؔ کی اہم خصوصیات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مومنؔ نازک خیالی کے معاملے میں اپنے تمام ہم عصر شعرا، جیسے ذوقؔ، غالبؔ، ظفرؔ، آزردہؔ اور صہبائیؔ وغیرہ سے بھی سبقت لے گئے۔

نوٹ

مقاصد

اس غزل کو پڑھنے کے بعد آپ:

- ''غزل مسلسل'' کی تعریف بیان کر سکیں گے؛
- مختلف صنعتوں کو سمجھ کر بیان کر سکیں گے؛
- اشعار کو سمجھ کر ان کی تشریح اور تحسین کر سکیں گے؛
- مومن کے طرز شاعری پر اظہار خیال کر سکیں گے۔

19.1 اصل سبق

آیئے اب غزل پڑھیں:

غزل

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

قرار: اقرار، عہد، وعدہ

لطف: مہربانی
پیشتر: پہلے
گلہ: شکوہ، شکایت
حکایت: کہانی، قصہ، بات

جی: طبیعت، دل، مزاج

آشنا: واقف کار، جان پہچان والا، چاہنے والا
مبتلا: عاشق، عشق میں گرفتار

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

19.2 متن کی تشریح

عاشق کی روایت ہے کہ عاشق اور محبوب کے درمیان کچھ وعدے ہوتے ہیں، عہد و پیاں باندھے جاتے ہیں اور زندگی ساتھ گذارنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ مطلع میں شاعر اپنی محبت کے ان ہی دنوں کو یاد کرتے ہوئے اپنے محبوب سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان محبت میں کچھ وعدے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے تئیں وفادار رہنے اور ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے یہ وعدے، معلوم نہیں، اب تمہیں یاد ہیں یا نہیں۔ مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔

19.3 زبان کے بارے میں

- شاعر اپنی محبت کے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ محبوب کے دل میں اس کی محبت اب بھی برقرار ہے۔ اسی احساس کی وجہ سے عاشق وعدہ پورا نہ ہونے کی شکایت بھی نہیں کر رہا ہے۔ لیکن بات کرنے کا انداز ایسا ہے کہ اس میں شکایت جھلک رہی ہے۔ شاعر نے بڑی خوب صورتی سے اپنی اس شکایت کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے کہ تم اپنا وعدہ بھول گئے ہو۔
- اس غزل کی ردیف ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کافی لمبی اور مترنم ہے۔ اردو غزل میں اتنی لمبی ردیف بہت کم لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔

متن پر سوالات 19.1

.1 مطلع میں شاعر محبوب کو کیا یاد دلا رہا ہے؟

(i) وصل کا وعدہ

(ii) نباہ کا وعدہ

(iii) یاد رکھنے کا وعدہ

.2 اس شعر کا قافیہ کیا ہے؟

(i) تھا، کا

(ii) یاد ہو، نہ یاد ہو

(iii) وہ، وہی

.3 اس شعر کی ردیف کیا ہے؟

(i) ہو

نوٹ

(ii) یاد ہو

(iii) تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

19.4 متن کی تشریح

اس شعر میں شاعر ان دنوں کو یاد کر رہا ہے جب محبوب اپنے عاشق کا ہر دم خیال رکھتا تھا۔ محبوب کی مہربانیاں اور کرم فرمائیاں، اکثر شاعر کے حصے میں آتی تھیں۔ ان ہی خوب صورت یادوں کے پس منظر میں شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ پہلے تم مجھ پر بہت مہربان تھے اور میرے حال پر بہت کرم کرتے تھے۔ مجھے آج بھی تمہاری ایک ایک مہربانی اچھی طرح یاد ہے۔ حالانکہ تمھیں اپنے یہ لطف و کرم اب یاد نہیں رہے لیکن مجھے بخوبی یاد ہیں۔ یعنی اب تم مجھ پر مہربان نہیں رہے۔

19.5 زبان کے بارے میں

دوسرے مصرعے میں ''ذرا ذرا'' ابہام پیدا کرتا ہے۔ ایک معنی تو ہیں کہ مجھے تمہاری سب مہربانیاں اور کرم فرمائیاں اب بھی تھوڑی تھوڑی سی یاد ہیں۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ مجھے تمہاری سب مہربانیوں اور کرم فرمائیوں کا معمولی معمولی حصہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ یعنی چھوٹی سے چھوٹی مہربانی بھی مجھے خوب یاد ہے۔

''لطف'' اور ''کرم'' مترادف الفاظ ہیں اور عام طور پر ایک ساتھ ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس شعر میں بھی ایک ساتھ ہی استعمال کیے گئے ہیں لیکن طریقہ کچھ مختلف ہے۔

متن پر سوالات 19.2

1. اس شعر میں مترادف الفاظ کون کون سے ہیں؟

(i) کرم، پیشتر

(ii) حال، لطف

(iii) لطف، کرم

2. اس شعر میں لطف و کرم کے معنی ہیں

نوٹ

(i) یاد

(ii) مہربانی

(iii) نفرت

3. اس شعر میں کون سا لفظ ابہام ظاہر کرتا ہے؟

(i) لطف

(ii) کرم

(iii) ذرا ذرا

وہ۔ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

19.6 متن کی تشریح

محبت میں روٹھنے اور منانے کا ایک عام رواج ہے۔ اس شعر میں بھی شاعر اپنے محبوب کو ساتھ گزارے ہوئے ان لمحات کی یاد دلا رہا ہے جب محبوب چھوٹی چھوٹی باتوں پر شکوہ شکایت کرتا اور روٹھ جاتا تھا اور پھر شاعر اسے مناتا تھا۔ شاعر کہتا ہے تم اب وہ گلے شکوے اور روٹھنے منانے کا پرلطف سلسلہ بھی شاید بھول چکے ہو۔

19.7 زبان کے بارے میں

گلہ اور شکایت مترادف الفاظ ہیں۔ عام طور پر اس کے لیے ''شکوہ شکایت'' یا ''گلہ شکوہ'' بیک وقت استعمال کیے جاتے ہیں لیکن مومن نے گلہ اور شکایت استعمال کیے ہیں۔ یہ ایک نیا طریقہ ہے۔

متن پر سوالات 19.3

1. محبوب کے روٹھنے پر عاشق کیا کرتا تھا؟

(i) محبوب کو برا بھلا کہتا تھا

(ii) محبوب کو مناتا تھا

(iii) محبوب سے خود بھی روٹھ جاتا تھا

2. اس شعر میں مترادف الفاظ کون سے ہیں؟

(i) شکایت اور حکایت

(ii) گلہ اور حکایت

(iii) گلہ اور شکایت

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

19.8 متن کی تشریح

محبوب کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھنا اور عاشق کا اسے منانا محبت کا عام دستور ہے۔ تاہم کوئی بات ایسی بھی ہو سکتی ہے جو واقعی محبوب کو بری لگ جائے۔ ایسی صورت میں عاشق اپنی تمام تر کوشش کے بعد بھی محبوب کو نہیں منا پاتا۔ اس شعر میں شاعر ایسے ہی مواقع یاد کراتے ہوئے محبوب سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہو جاتی جو واقعی تمہاری طبیعت پر گراں گزرتی تو اکثر تمہاری محبت جوش مارتی اور تم اس بات کو زبان پر لائے بغیر بھلا دیا کرتے تھے۔ اس کا شکوہ بھی نہیں کرتے تھے۔ اب آخر ایسی کیا بات ہو گئی جسے تم بھلا نہیں سکے اور اب تک روٹھے ہوئے ہو!

19.9 زبان کے بارے میں

ایسے الفاظ جو باہم متضاد ہوں یعنی معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں، ان کے استعمال کو شاعری میں ''صنعت تضاد'' کہتے ہیں۔ جیسے اس شعر میں ''بھولنا'' اور ''یاد ہونا'' میں تضاد ہے۔

متن پر سوالات 19.4

1. جو بات محبوب کے دل کو بری لگتی ہے وہ اسے بیان سے پہلے ہی بھلا دیتا تھا کیونکہ

(i) اسے بھولنے کی عادت تھی

(ii) اسے محبت تھی

(iii) وہ معاف کرنے کا عادی تھا

2. اس شعر میں صنعت تضاد کے لیے کون سے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں؟

(i) بیان، بھولنا

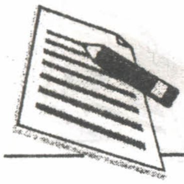

نوٹ

(ii) یاد، بیان

(iii) بھولنا، یاد

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

19.10 متن کی تشریح

گزرے ہوئے واقعات کا ایک طویل سلسلہ بیان کرنے کے بعد شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ جسے تم اپنے جان پہچان والوں، دوستوں میں گنتے تھے اور اپنا وفادار و خیر خواہ سمجھتے تھے، میں آج بھی وہی سچا عاشق ہوں جس سے تم محبت کرتے تھے۔ پھر آج تم مجھے کیوں نہیں پہچانتے؟

19.11 زبان کے بارے میں

مقطع میں شاعر نے محبوب کے دل میں دوبارہ محبت جگانے کی کوشش کی ہے اور خود کو سچا عاشق بتایا ہے۔

مقطع میں ''مومنؔ مبتلا'' سے مراد ''سچا عاشق'' بھی ہے اور ''عاشق مومن'' بھی۔ مقطعے میں تخلص کو اس طرح نبھانا کہ دوسرے الفاظ اسی سے مطابقت رکھتے ہوں ''حسن مقطع'' کہلاتا ہے مومنؔ نے اپنے تخلص کو اکثر اوقات مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں حسن مقطع کی جتنی مثالیں ہیں، کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتیں مثلاً

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مقطع میں محبوب کو پہلے ''آپ'' سے مخاطب کیا گیا ہے۔ پھر ''تم'' سے۔ شعر میں ایک ہی شخص کے لیے تعظیم اور تحقیر کے الفاظ استعمال کرنے کے اس انداز کو ''شتر گربہ'' کہتے ہیں۔

شتر اور گربہ فارسی زبان میں اونٹ اور بلی کو کہتے ہیں۔ اونٹ ایک بڑا جانور ہے جب کہ بلی اس مقابلے میں بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ اس لیے کسی شخص کو بڑوں کی طرح باادب مخاطب کیا جائے اور پھر اپنا رویہ بدل کر اس سے چھوٹوں کی طرح گفتگو شروع کر دی جائے تو یہ طریقہ ''شتر گربہ'' کہلاتا ہے۔

متن پر سوالات 19.5

1. مقطع میں تخلص کو اس طرح نبھانا کہ دوسرے الفاظ اسی سے مطابقت رکھتے ہوں، کیا کہلاتا ہے؟

(i) حسن مطلع

نوٹ

(ii) حسن مقطع

(iii) حسن تخلص

2. شعر میں ایک ہی شخص کے لیے تعظیم و تحقیر کے الفاظ استعمال کرنے کے انداز کو کیا کہتے ہیں؟

(i) شتر گربہ

(ii) شتر بے مہار

(iii) شیر گربہ

19.12 شاعرانہ خوبیاں اور انداز بیان

عام طور پر غزل کے ہر شعر میں الگ الگ مضمون بیان کیے جاتے ہیں اور اشعار میں باہمی ربط نہیں ہوتا۔ لیکن غزل میں مربوط مضامین بیان کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ یعنی شاعر اگر چاہے تو پوری غزل میں ایک ہی بات کو پھیلا کر کہے۔ ایسی غزل کو ''غزل مسلسل'' کہتے ہیں۔ مومن کی زیر مطالعہ غزل بھی ایک ہی مزاج یا کیفیت میں کہی گئی ہے۔ جس میں یادوں کے خوب صورت سلسلے کو دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس غزل میں مومن نے اپنے مخصوص شیریں اور نرم لہجے میں محبوب کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی یاد دلائی ہے۔ غزل میں واردات محبت کی لطافت اور انداز بیان کی حلاوت کے علاوہ بحر کی موسیقیت بے اختیار دل کو کھینچتی ہے۔ اس غزل کی ردیف کبھی جذباتی کیفیت ظاہر کرتی ہے تو کبھی طنزیہ لہجہ اختیار کر لیتی ہے، کبھی شکایت بن جاتی ہے تو کبھی سوال کرنے لگتی ہے۔ غرض اس ردیف کے ذریعے متعدد کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ردیف اتنی لمبی ہے کہ مومن کے علاوہ بہت کم لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔ یہ غزل معاملہ بندی کی بہترین مثال ہے۔

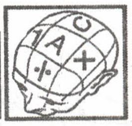

آپ نے کیا سیکھا

1. وہ غزل جس میں مربوط مضمون کو بیان کیا جائے یا پوری غزل میں ایک ہی بات کو پھیلا کر کہا جائے ''غزل مسلسل'' کہلاتی ہے۔
2. عاشق اور معشوق کے درمیان جو باتیں اور واقعات ہوتے ہیں، ان کے عاشقانہ بیان کو ''معاملہ بندی'' کہتے ہیں۔
3. ''معاملہ بندی'' مومن کا خاص میدان ہے۔
4. شعر میں ایک ہی شخص کے لیے تعظیم و تحقیر کے الفاظ استعمال کرنے کے انداز کو ''شتر گربہ'' کہتے ہیں۔ جیسے اس غزل کے مقطعے میں محبوب کو پہلے ''آپ'' اور پھر ''تم'' سے مخاطب کیا گیا ہے۔
5. مقطعے میں تخلص کو اس طرح نبھانا کہ دوسرے الفاظ اس سے مطابقت رکھتے ہوں ''حسن مقطع'' کہلاتا ہے۔
6. مومن کا انداز بیان بہت دل نشیں ہے۔ وہ انداز بیان کو دل کش بنانے کے لیے بحر کا انتخاب بھی موضوع کی مناسبت

نوٹ

سے کرتے ہیں۔ مومن کا لہجہ نرم اور شیریں ہے۔

19.13 مزید مطالعہ

1. مومن کا دیوان حاصل کر کے مختلف غزلوں کا مطالعہ کیجئے۔
2. ''غزلِ مسلسل'' دوسرے شعرا کے ہاں بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' اسی طرح کی غزل ہے۔ اس غزل کا مطالعہ کریں۔

19.17 اختتامی سوالات

1. ''معاملہ بندی'' کسے کہتے ہیں؟
2. دوسرے شعر میں ''ذرا ذرا'' کے ذریعے ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے دونوں معنی بتائیے۔
3. مقطعے میں مومن نے عاشق کی کن کن خصوصیات کا ذکر کیا ہے؟
4. غزل کی ردیف کیا ہے؟ اس میں کیا خوبی ہے؟
5. غزل مسلسل کی تعریف لکھیے۔
6. شتر گربہ کسے کہتے ہیں۔ مثال دے کر سمجھائیے۔
7. صنعت تضاد کی تعریف لکھیے اور دو مثالیں بھی دیجئے۔
8. مومن کے انداز بیان پر تبصرہ کیجئے۔

متن پر سوالات کے جوابات

19.1
1. (ii) نباہ کا وعدہ
2. (i) تھا، کا
3. (iii) تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

19.2
1. (iii) لطف، کرم
2. (ii) مہربانی
3. (iii) ذرا ذرا

19.3	.1	(ii)	محبوب کو مناتا تھا
	.2	(iii)	گلہ اور شکایت
19.4	.1	(ii)	اسے محبت تھی
	.2	(iii)	بھولنا، یاد
19.5	.1	(ii)	حسن مقطع
	.2	(i)	شتر گربہ

20

خواجہ حیدر علی آتش

شاعر کا تعارف

خواجہ حیدر علی آتش کے بزرگ تلاش معاش میں بغداد سے دہلی آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ آتش کے والد خواجہ علی بخش، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دہلی سے فیض آباد چلے گئے۔ وہیں آتش کی پیدائش ہوئی۔ آتش کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ آتش 1777ء پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اعلا تعلیم و تربیت سے محروم رہے کم عمری سے ہی شعر و شاعری کی طرف رجحان تھا۔ لکھنؤ آ کر مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔ جلد ہی ان کی شاعری نے شہرت حاصل کر لی۔

آتش دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول میں عام طور پر تصنع اور بناوٹ کا رواج رہا ہے۔ لیکن آتش نے لکھنؤ کی عام روش سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی۔ انہوں نے سادہ اور عام زبان میں منتخب موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورات کا فن کارانہ استعمال ہے۔ وہ الفاظ و تراکیب کے استعمال سے شعروں میں حسن پیدا کر دیتے ہیں۔

آتش کے کلام میں روزمرہ اور عام بول چال کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ جس سے کلام میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ رنگینی و شوخی اور مضمون کا اختصار ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور مستی و سرشاری بھی۔ ان سب کے باوجود وہ لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کلام میں تصنع بھی ہے اور بے جا رعایت لفظی بھی۔ تاہم ان عام خامیوں پر ان کی انفرادی خوبیاں غالب ہیں۔ انہیں انفرادی اوصاف کی بدولت آتش کا شمار اردو کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔

مقاصد

اس غزل کو پڑھنے کے بعد آپ:

- اشعار کو سمجھ کر ان کی تشریح اور تحسین کر سکیں گے؛
- مختلف صنعتوں کو سمجھ کر انہیں بیان کر سکیں گے؛
- آتش کے اندازِ بیان پر اظہارِ خیال کر سکیں گے۔

20.1 اصل سبق

آیئے اب غزل پڑھیں:

غزل

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

نوٹ

روبرو: آمنے سامنے، مقابل
بے تاب: بے چین، قرار
پیام بر: قاصد، پہنچانے والا
میسر ہونا: حاصل ہونا، ملنا
شرح آرزو: آرزو کی تشریح، آرزو کی تفصیل بیان کرنا
مہ: ماہ کا مخفف، چاند
مہر: سورج
حبیب: دوست، محبوب
جستجو: تلاش
مو: بال
گریباں: پوشاک کا وہ حصہ جو جو گلے کے نیچے ہوتا ہے
چاک کرنا: پھاڑنا
رفو گر: پھٹے ہوئے کپڑے کی مرمت کرنے والا
زنجیر زلف: بالوں کی لڑی
عالم: حسن، خوبصورتی، حالت
اسیر: قیدی
عالم: حالت
برگشتہ: منحرف، باغی
طالعی: قسمت، نصیب
باراں: بارش

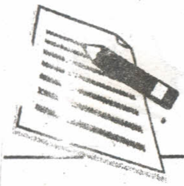

نوٹ

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

20.2 متن کی تشریح

ہر عاشق اپنے محبوب کو دنیا کا حسین ترین سمجھتا ہے۔ شاعر بھی اپنے محبوب کی خوب صورتی کا دیوانہ ہے۔ اسی لیے شاعر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا محبوب پھول سے بھی زیادہ حسین اور پُرکشش ہے۔ اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے شاعر چاہتا ہے کہ وہ اپنے محبوب اور پھول کو آمنے سامنے بٹھائے۔ پھر پھول کے عاشق ''بلبل'' سے بات چیت کرے اور پوچھے کہ کس کا محبوب زیادہ خوب صورت ہے۔

20.3 زبان کے بارے میں

اس شعر میں شاعر نے موازنہ کیا ہے۔ اپنا اور بلبل کا۔ محبوب اور گل کا۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ الفاظ سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کون کس سے بہتر ہے؟ لیکن در پردہ شاعر اپنے آپ کو اور اپنے محبوب کو ہی بہتر سمجھتا ہے۔ شاعر نے دوسرے مصرعے میں بلبل کو ہی ''بے تاب'' کہا ہے لیکن خود شاعر کی بے تابی بھی صاف عیاں ہے۔

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

20.4 متن کی تشریح

عاشق مختلف ذرائع سے اپنے پیغامات محبوب تک پہنچاتے ہیں۔ یہ کام عموماً پیام بر کیا کرتے ہیں۔ لیکن شاعر کو کوئی ایسا پیام بر نہیں ملا جس سے وہ اپنا مدعا کہلا بھیجتا۔ تاہم پیام بر نہ ملنے کو شاعر اچھا بتاتا ہے۔ کیوں کے کسی دوسرے کی زبان سے شاعر کے جذبات، خیالات اور حالات کا اظہار نہیں ہو سکتا۔

20.5 زبان کے بارے میں

☆ پیام بر نہ ملنے پر خوشی ظاہر کرنے میں یہ خواہش بھی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی بات خود محبوب سے کہنا چاہتا ہے۔

☆ ''خوب ہوا'' محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ''اچھا ہی ہوا''۔

☆ پیام بر کے ذریعے پیغام پہنچانے کا مطلب ہے کہ شاعر و محبوب کی باتیں کسی تیسرے شخص پر ظاہر ہوں گی اور اسے محبوب کے قریب جانے کا موقع بھی ملے گا۔ ایسی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ پیام بر ہی شاعر کا رقیب بن جائے۔ اسی لیے شاعر نے دوسرے مصرعے میں پیام بر کو ''غیر'' کہا ہے۔

متن پر سوالات 20.1

1. محبوب کو گل کے روبرو کرنے کا کیا مقصد ہے؟

(i) تعارف کرانا

(ii) حسن کا موازنہ کرنا

(iii) آپس میں دوستی کرانا

2. گل و محبوب کے حسن کا مقابلہ کر کے شاعر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ

(i) اس کا محبوب گل سے زیادہ خوب صورت ہے

(ii) گل اس کے محبوب سے زیادہ خوب صورت ہے

(iii) گل اور محبوب ایک جیسے ہیں

3. دوسرے شعر میں ''غیر'' کس کے لیے استعمال ہوا ہے؟

(i) رقیب (ii) پیام بر

(iii) محبوب

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

20.6 متن کی تشریح

چاند اور سورج نظام قدرت کے تحت مسلسل سفر میں ہیں اور دن رات چلتے رہتے ہیں لیکن شاعر اس کی کچھ اور وجہ بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح میں اپنے محبوب کی تلاش میں مارا مارا بھٹک رہا ہوں، اسی طرح چاند اور سورج بھی اپنے محبوب کی تلاش میں چکر لگا رہے ہیں۔

20.7 زبان کے بارے میں

☆ لفظ ''مہ'' ''ماہ'' کا مخفف ہے جس کے معنی ''چاند'' ہیں۔

☆ مہ اور مہر متضاد الفاظ ہیں۔ کلام میں متضاد الفاظ یک جا کرنا صنعت تضاد کہلاتا ہے۔
مہ اور مہر کا استعمال بھی صنعت تضاد کی مثال ہے۔

☆ کلام میں کسی چیز یا کام کی کوئی ایسی وجہ بتانا جو دراصل اس کی وجہ نہ ہو، حسنِ تعلیل کہلاتا ہے۔ جیسے چاند اور سورج نظام قدرت کے تحت چلتے رہتے ہیں لیکن شاعر نے ان کے مسلسل سفر کی وجہ محبوب کی تلاش بتائی ہے۔

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ موَ کرتے

20.8 متن کی تشریح

تبدیلی زندگی کا ایک اہم جز ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے حالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ انسان بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپے تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے کالے بال اپنا رنگ بدل کر سفید ہو جاتے ہیں۔

20.9 زبان کے بارے میں

☆ ''رنگ بدلنا'' ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں انقلاب ہونا یا حالات بدلنا۔

☆ سفید اور سیاہ متضاد الفاظ ہیں۔ یہ بھی صنعتِ تضاد کی مثال ہے۔

متن پر سوالات 20.2

1. کلام میں کسی چیز یا کام کی کوئی ایسی وجہ بتانا جو دراصل اس کی وجہ نہ ہو، کیا کہلاتا ہے؟
   (i) حسنِ مقطع
   (ii) حسنِ تعلیل
   (iii) حسنِ مطلع

2. شاعر اور مہ و مہر میں کون سی بات ایک جیسی ہے؟
   (i) تینوں خاموش ہیں
   (ii) تینوں آوارہ ہیں

(iii) تینوں روشن ہیں

3. ''رنگ بدلنا'' کس طرف اشارہ ہے؟

(i) کالے بالوں کا سفید ہونا

(ii) حالات بدلنا

(iii) آنکھیں بدلنا

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

20.10 متن کی تشریح

جب عشق میں شدت آجاتی ہے اور محبوب سے ملاقات کی امید نظر نہیں آتی تو عاشق جنونی ہو جاتا ہے۔ جنوں کی حالت میں عاشق اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے۔ شاعر پر جنون کی یہ شدت ہمیشہ طاری رہی۔ اسی لیے وہ مسلسل کپڑے پھاڑتا رہا اور رفو کرنے والے انہیں رفو کرتے رہے۔

20.11 زبان کے بارے میں

☆ ''رفو گر'' اور ''رفو'' استعاراتی الفاظ کے طور پر بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی 'سمجھانے والے' شاعر کو ہمیشہ ''سمجھاتے'' تھے لیکن شاعر کے عشق کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

☆ شاعر نے کپڑے پھاڑنے والی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا بھی ایک صنعت ہے جسے ''مبالغہ'' کہتے ہیں۔

☆ ''چاک کرنا'' معنی ہیں 'پھاڑنا'۔ چاک کو دوبار لکھ کر شاعر نے اپنی بات میں زور پیدا کیا ہے۔

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

20.12 متن کی تشریح

شاعر خود اپنے محبوب کی زلفوں کا اسیر ہے یعنی اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا

نوٹ

نہیں ہیں اور آزاد ہیں، اگر وہ بھی میرے محبوب کی خوب صورت زلفوں کو دیکھ لیں تو ان زلفوں میں قید ہونے کی تمنا کریں۔

20.13 زبان کے بارے میں

☆ ''زلفوں کا اسیر ہونا'' کے معنی ہیں ''عاشق ہونا'' ''محبت میں گرفتار ہونا''۔

☆ ''آزاد'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہیں۔

☆ ''آزاد'' اور ''اسیر'' متضاد الفاظ ہیں جن سے صنعتِ تضاد بنتی ہے۔

☆ ''زنجیر'' اور ''اسیر'' ایسے الفاظ ہیں، جن میں آپسی تعلق ہے۔ کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن میں آپسی تعلق ہو، لیکن یہ تعلق تضاد کا نہ ہو، مراعات النظیر کہلاتا ہے۔

متن پر سوالات 20.3

1. پانچویں شعر میں شاعر نے ''چاک'' دو مرتبہ لکھا ہے کیونکہ

(i) شاعر جنون کی حالت میں ہے

(ii) اس سے مبالغہ پیدا ہوتا ہے

(iii) اس سے بات میں زور پیدا ہوتا ہے

2. ''زلف کا اسیر'' ہونا سے مراد ہے۔

(i) زلف میں پھنس جانا

(ii) محبت میں گرفتار ہونا

(iii) قیدی کی زلفیں

3. شعر نمبر چھے میں صنعت مراعات النظیر کے لیے کون سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں؟

(i) زنجیر اور آزاد

(ii) زنجیر اور اسیر

(iii) اسیر اور آزاد

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

20.14 متن کی تشریح

جب قسمت انسان کا ساتھ نہیں دیتی تو اس کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ لیکن اگر قسمت باغی ہو جائے تو تمام کام خواہش کے خلاف ہونے لگتے ہیں۔ شاعر کی قسمت بھی اس کے مخالف ہوگئی ہے۔ اسی لیے مایوس ہے اور اسے خطرہ ہے کہ میری ہر آرزو کے برخلاف نتیجہ برآمد ہوگا۔ شاعر کو اندیشہ ہے کہ اگر بارش کی آرزو کرے گا تو آسمان سے پانی کے بجائے آگ برسنے لگے گی۔

20.15 زبان کے بارے میں

☆ اس شعر میں قسمت کی خرابی کا بیان مبالغے کے ساتھ کیا گیا ہے۔

☆ ''آگ'' اور ''باراں'' متضاد الفاظ ہیں جن کے استعمال سے صنعتِ تضاد بنتی ہے۔

☆ ''آگ برسنا'' ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ''بہت سخت گرمی پڑنا''۔

20.4 متن پر سوالات

1. اس شعر میں شاعر نے کس بات کا اظہار کیا ہے؟
   - (i) قسمت اچھی ہونے کا
   - (ii) قسمت خراب ہونے کا
   - (iii) قسمت مخالف ہونے کا

2. اس شعر میں کن کن صنعتوں کا استعمال کیا گیا ہے؟
   - (i) تضاد اور کنایہ
   - (ii) تضاد اور مبالغہ
   - (iii) مبالغہ اور حسن تعلیل

20.16 شاعرانہ خوبیاں اور انداز بیان

دبستان لکھنؤ میں آتش کا لب ولہجہ اور انداز بیان بالکل منفرد ہے۔ ان کے یہاں بیان میں صفائی اور طرز ادا میں سلاست و

نوٹ

روانی پائی جاتی ہے۔ اپنے اظہار خیال کے لیے آتش نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں بڑی مناسبت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب، موزونیت اور ترکیب میں انہیں کمال حاصل ہے۔ آتش نے صرف فارسی تراکیب و الفاظ کو نہیں برتا بلکہ محاورے اور روزمرہ کو بھی بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ آتش کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ وہ شعری صنعتوں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔ انہوں نے عام لکھنوی مزاج کے برخلاف اردو شاعری کو وقار اور سنجیدگی عطا کی۔ ان کے یہاں عشقیہ مضامین اور تصوف کے ساتھ کہیں کہیں زندگی کا فلسفہ بھی بیان ہوا ہے۔

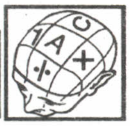

آپ نے کیا سیکھا

☆ کسی چیز یا کام کی کوئی ایسی وجہ بتانا جو دراصل اس کی اصل وجہ نہ ہو، حسن تعلیل کہلاتا ہے۔

☆ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا بھی ایک صنعت ہے جسے ''مبالغہ'' کہتے ہیں۔

☆ کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جن میں آپسی تعلق ہو، لیکن یہ تعلق تضاد کا نہ ہو، صنعت مراعات النظیر کہلاتا ہے۔

☆ آتش دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

☆ آتش کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورات کا فنکارانہ استعمال ہے۔

☆ آتش کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔

20.17 مزید مطالعہ

☆ یہ ایک طویل غزل ہے جس کے سات منتخب اشعار آپ کے نصاب میں شامل کیے گئے ہیں ''کلیات آتش'' تلاش کر کے مکمل غزل کا مطالعہ کیجیے اور اپنی کاپی میں لکھیے۔

☆ آتش نے اپنی شاعری میں محاورے اور روزمرہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ آتش کی مختلف غزلوں میں سے دس ایسے اشعار اپنی کاپی میں نوٹ کیجیے جن میں محاروہ یا روزمرہ کا استعمال ہوا ہو۔

20.21 اختتامی سوالات

1. ''حسنِ تعلیل'' کسے کہتے ہیں؟ مثال دے کر سمجھایئے۔
2. ''مبالغہ'' کی تعریف لکھیے اور مثال بھی دیجیے؟
3. اس غزل میں صنعت تضاد کا کن اشعار میں استعمال ہوا ہے؟
4. صنعت مراعات النظیر اور صنعت تضاد میں کیا فرق ہے؟ مثالوں کے ساتھ سمجھایئے؟

نوٹ

5. ''آتش کے کلام کی ایک خوبی محاورات کا استعمال ہے۔'' اس غزل کی روشنی میں اس بیان کی وضاحت کیجیے۔

6. آتش کے انداز بیان پر اظہار خیال کیجیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

20.1 1. (ii) حسن کا موازنہ کرنا

2. (i) اس کا محبوب گل سے زیادہ خوب صورت ہے

3. (ii) پیام بر

20.2 1. (ii) حسنِ تعلیل

2. (ii) تینوں آوارہ ہیں

3. (ii) حالات بدلنا

20.3 1. (iii) اس سے بات میں زور پیدا ہوتا ہے

2. (ii) محبت میں گرفتار ہونا

3. (ii) زنجیر اور اسیر

20.4 1. (iii) قسمت مخالف ہونے کا

2. (ii) تضاد اور مبالغہ

21

حسرت موہانی

شاعر کا تعارف

فضل الحسن نام حسرتؔ تخلص اردو کے صف اول کے شاعر، ادیب، صحافی اور جنگ آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ قصبہ موہان کے اپنے خاندانی مکان میں جسے ''بارہ دری'' کہا جاتا تھا پیدا ہوئے یہ قصبہ لکھنؤ اور کانپور کے درمیان واقع ہے۔

حسرت کے آباواجداد نیشاپور سے التمش کے زمانے میں ہندوستان آئے اور موہان میں سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ پہنچے اور بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ شعروادب کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ علی گڑھ کی مقامی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ شاعری میں تسلیم کی شاگردی اختیار کی جن کا سلسلہ حکیم مومن خاں مومنؔ سے ملتا ہے۔

حسرت کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک ادبی اور دوسرا سیاسی۔ حسرت دونوں میں یکساں طور پر سرگرم عمل رہے۔ ایک طرف شاعر کی حیثیت سے نہایت اہتمام سے شعر کہتے ہیں۔ ''نکات سخن'' لکھ کر اردو ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ پابندی سے ادبی رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' نکالتے ہیں اور دوسری طرف اسی شدومد کے ساتھ سیاست سے وابستہ ہیں اور ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے ہر لحہ فکر منداور کوشاں ہیں۔ انگریزی سرکار نے انہیں کئی بار گرفتار کیا اور جیل میں ڈالا۔ مگر وہ اپنی بے باکی صاف گوئی اور فکر مندانہ پرستی سے کبھی باز نہیں آئے۔

حسرت نے یوں تو نظمیں بھی کہی ہیں مگر انہیں غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی شہرت دوام حاصل ہوئی۔ جب انہوں نے شاعری شروع کی تو اردو غزل کے بارے میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو چکی تھیں مثلاً غزل میں بدلتے حالات کے اظہار کی طاقت نہیں ہے۔ غزل زمیندارانہ نظام کی پیداوار ہے، غزل میں ریزہ خیالی اور انتشار ہے اس لیے غزل کو ترک کر دینا چاہیے وغیرہ۔ ان حالات میں حسرت نے غزل کا مکمل دفع کیا اس کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے برابر غزلیں کہتے رہے۔ غزل کو نئے رنگ و آہنگ عطا کئے۔ حسرت کے کوششوں سے غزل کا احیا ہوا اور اس کا کھویا ہوا وقار حاصل ہو گیا۔

نوٹ

مومن کی غزل کی طرح کلام حسرت میں بھی عشق کی ساری کیفیتیں اور حسن کے سارے روپ نظر آتے ہیں۔ حسرت نے زیادہ دیوانوں پر مشتمل اپنا کلیات ۱۹۴۳ء میں شائع کیا اس کے علاوہ نکات سخن اردو کے کلاسیکی شعرا کا انتخاب شائع کیا۔ ''مشاہدات زنداں'' میں جیل کی زندگی کے تجربات کا اظہار کیا اور پابندی سے روزنامہ بھی لکھتے رہے۔ حسرت نے اپنی غزل میں ایک ایسے محبوب کا تصور پیش کیا جو خیالی نہیں تھا۔ حسرت کا خیالی محبوب ہماری دنیا کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ ایک ایسی لڑکی کا کردار جو شوخ ہے۔ حسرت اپنے محبوب کے جسم، لباس، رنگ اور خوشبو کا ذکر غزلوں میں بڑے فطری اور مہذب انداز میں کرتے ہیں ان کا عشق پاکیزہ اور ان کا محبوب چنچل مگر پاکباز ہے۔ اس لیے ان کے؟

مقاصد

اس غزل کو پڑھنے کے بعد آپ:

شعر کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اس کے حسن ادا سے محظوظ ہو سکیں گے؛

شعر کی زبان، تراکیب اور لفظوں کے استعاراتی معنی کو جان سکیں گے؛

حسرت کے انداز غزل کو پرکھ اور پہچان کر سکیں گے؛

حسرت کی غزلیہ شاعری کے کچھ خاص پہلوؤں سے واقف ہو سکیں گے۔

21.1 اصل سبق

آیئے غزل پڑھتے ہیں:

غزل

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام
اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بہ خود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
ہے ناز حسن سے جو فروزاں جبینِ یار
لبریز آب نور ہے چاہ ذقن تمام

جمالِ یار: محبوب کی خوبصورتی، محبوب کا حسن

آتشِ گل: (ترکیب ہے) گل کی آگ مراد پھول کا انتہائی لال ہونا معلوم ہو کہ پھول نہیں دہکتا ہوا شعلہ ہے۔

پیرہن: پوشاک، لباس

اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حبِ وطن تمام
شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

○

"روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

21.2 متن کی تشریح

اردو کی غزلیہ شاعری میں محبوب کے حسن اور ادا کی تعریف کرنے کی روایت موجود رہی ہے۔ حسرت نے اس روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے رنگ میں محبوب کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے۔

اس شعر میں شاعر نے اپنی مخصوص عشقیہ نگاہوں سے محبوب کا مشاہدہ کیا ہے جن کی رو سے محفل میں اس کے محبوب کی موجودگی سے ہی روشنی یعنی چمک دمک یا زندگی ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح سے گلشن میں کسی خاص پھول کی سرخی سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ پھول نہیں بلکہ دہکتی ہوئی آگ ہے جس سے پورا گلشن دہک اٹھا ہے۔

دراصل محبوب کی خوبصورتی کو ظاہر کرنے کے لیے دوسرے مصرعے میں "آتشِ گل" کی ترکیب کو تشبیہہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی حسرت نے محبوب کے حسن و جمال کے اظہار کے لیے "آتشِ گل" کی ایک نئی ترکیب نکالی ہے۔

21.3 زبان کے بارے میں

شعر میں مستعمل دو ترکیبوں پر غور کرنے سے شعر کے مفہوم سے گہرے طور پر آگاہی ہوتی ہے اس شعر کا مقصد محبوب کے حسن کی تعریف ہے۔ اس لیے پہلی ترکیب "جمالِ یار" کو تشبیہی ترکیب "آتشِ گل" سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یہاں قافیہ "تمام" کل اور "سب" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اگر ہم اس شعر کو عشق حقیقی کے طور پر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حسرت نے خدا کے جلوؤں کا ذکر کیا ہے یعنی اسی کے نور سے اس دنیا میں روشنی ہے اور اسی کے حسن سے یہ دنیا بھی حسین و جمیل بن گئی ہے۔

نوٹ

اہلِ جور: ظلم کرنے والا
شورش: ہنگامہ
حبِ وطن: وطن کی محبت
سوز و گداز: سوز بمعنی جلن کے ہیں گداز بہ معنی ملائم کے ہیں۔ عطفی ترکیب استعارہ ہے مراد: درد مندی کا۔
لطفِ سخن: فن کا لطف
تمام: سب، مکمل، خیر، خاتمہ
آبِ نور: چھپا تا پانی
لبریز: بھرا ہوا
چاہِ ذقن: ٹھڈی کا گڑھا
چاہ: کنواں
ذقن: تھوڑی یا ٹھڈی

''اللہ رے'' جسم یار کی خوبی کہ خود بہ خود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

21.4 متن کی تشریح

اس شعر میں بھی محبوب کی تعریف انوکھے انداز میں کی گئی ہے۔ یہاں محبوب کے حسین جسم کی تعریف کی گئی ہے۔ اللہ رے دراصل فجائیہ کلمہ ہے جو تعجب یا کسی بھی شئے کی قدر و قیمت میں اضافے کے لیے بولا یا تحریر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً حیرت کے وقت اللہ اکبر یا باپ رے باپ وغیرہ۔ پیرہن ہر انسان زیب تن کرتا ہے اور اچھے اچھے پیرہن یا کپڑے پہن کر اپنے آپ کو جاذب نظر بنانا چاہتا ہے۔ کپڑا یقیناً کسی کسی پہ ہی ہے۔ جس پر کپڑا؟؟ ہے اس کا راز اس پہننے والے کے جسم میں مگر یہاں اس شعر میں ایک خوبصورت رنگین، رنگ اور ڈوبا ہوا جسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس پر کپڑے کا اثر نہیں یا اس جسم کی خوبصورتی میں اضافہ کپڑے نے نہیں کیا ہے بلکہ کپڑے پر اس رنگین جسم کا اثر پڑ گیا ہے اور کپڑا یعنی پوشاک یا لباس جسم کی رنگینیوں کی وجہ سے مزید رنگین اور دلکش ہو گیا ہے۔

21.5 زبان کے بارے میں

اردو شاعری میں شاعروں نے محبوب کی آنکھ، ناک، رخسار، لب، پیشانی وغیرہ کا ذکر اکثر کیا ہے اور اکثر اس کا بھونڈا اظہار بھی ہوا ہے یہاں حسرت نے محبوب کے جسم کی تعریف تو کی ہے مگر اخلاق کا پاس رکھا ہے۔ ''اللہ رے'' کا استعمال مبالغے کے طور پر ہوا ہے مبالغہ کسی بھی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا نام ہے۔ مبالغہ کلام میں شدت تاثیر پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

متن پر سوالات 21.1

1. مندرجہ ذیل لفظوں میں سے تراکیب کی پہچان کریں اور ان پر () صحیح کا نشان لگائیں۔

الف) روشن، انجمن، جمالِ یار

ب) انجمن تمام، چمن تمام، آتشِ گل

ج) خود بہ خود، پیرہن تمام، جسم یار

2. اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بہ خود۔

مندرجہ بالا مصرعے میں ''اللہ رے'' کا استعمال شاعر نے کیوں کیا ہے؟ صحیح جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

الف) اللہ کو یاد کرنے کے لیے کیا ہے

نوٹ

ب) شعر میں کوئی حسن پیدا کرنے کے لیے کیا ہے

ج) مبالغے کے طور پر کیا ہے

3. جمالِ یار اور آتشِ گل کے درمیان کونسا رشتہ ہے۔ صحیح جواب پر صحیح کا نشان لگائیں

الف) استعارے کا

ب) علامت کا

ج) تشبیہہ کا

4. حسرت نے ان اشعار میں کس کی طرف پر زور دیا ہے۔ صحیح پر (✓) کا نشان لگائیں۔

الف) محبوب کی تعریف پر

ب) چمن کی تعریف پر

ج) آتش کی تعریف پر

ہے ناز حسن سے جو فروزاں جبینِ یار
لبریز آب نور ہے چاہ ذقن تمام

21.6 متن کی تشریح

اس شعر میں بھی محبوب کے حسن کی تعریف کی گئی ہے مگر حسرت نے یہاں زبان و بیان کا کمال دکھایا ہے۔ حسن کی ایک صفت غرور اور ناز و نخرہ ہے۔ یہ وہ ادا ہے جس سے محبوب کے حسن میں انوکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ چہرے پر فخر و انبساط کی ایسی چمک دمک ہوتی ہے جسے اس شعر میں ''نازِ حسن'' سے تعبیر کیا ہے اور فروزاں جبین یار کی صورت میں بیان کیا ہے یعنی حسن کے ناز و نخرے سے محبوب کی پیشانی روشن رہتی ہے۔ اتنا ہی نہیں محبوب کی ٹھڈی جو گڑھا ہوتا ہے اس کی؟؟ شاعر نے آب نور کہا ہے۔ یعنی محبوبکے چہرے پر طرح طرح کے حسین مناظر بکھرے پڑے ہیں جس سے محبوب کا چہرہ حسن و جمال کا ایک آئینہ بن گیا ہے۔

21.7 زبان کے بارے میں

''چاہ ذقن''، ٹھڈی کے گڑھے کو کہا جاتا ہے۔ چاہ کنویں کو کہتے ہیں اور ذقن ٹھڈی کو۔ چاہ ذقن سے ذہن میں ''چاہ بابل'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ چاہ بابل عراق کے شہر بابل کا ایک کنواں تھا جس کی بابت مشہور ہے ہاروت، ماروت وہاں قید ہیں۔

آب نور اور جبین یار دو تراکیب ہیں۔ جبین یار محبوب کی پیشانی ہے۔ جس کی دمک نے شاعر کے ذہن کو نور کی جانب مبذول کر دیا اور شاعر نے آب نور کی ترکیب وضع کی۔

نوٹ

متن پر سوالات 21.2

1. ''چاہِ ذقن'' کی ترکیب سے کیا مراد ہے'' مندرجہ ذیل بیانات میں سے اس کا صحیح جواب چنیں اور اس پر (✓) کا نشان لگائیں۔

الف) حسن کا ناز

ب) محبوب کا غرورِ حسن

ج) محبوب کی ادائیں

2. چاہ بابل اور چاہ ذقن کا فرق واضح کریں۔صحیح جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

الف) ایک شہر بابل کا کنواں ہے اور دوسرا ٹھڈی کا کنواں یعنی گڈھا ہے

ب) چاہ بابل، بابل کے اس کنویں کا نام ہے جس میں کبھی ہاروت ماروت فرشتے قید کئے گئے تھے۔چاہ ذقن ٹھڈی کے گڑھے کا نام ہے۔

اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں

پھیلے گی یونہی شورش حب وطن تمام

21.8 متن کی تشریح

اس شعر میں محبوب کی تعریف نہیں کی گئی ہے۔غزل کے ہر شعر میں جدا جدا مفاہیم بیان کیے جاتے ہیں۔اس شعر میں آزادی کی جدوجہد کی یاد تازہ کی گئی ہے۔اس زمانے میں آزادی کے سپاہیوں پر انگریز کیسے کیسے مظالم ڈھاتے تھے اس بات کا ثبوت تاریخ کے صفحوں میں موجود ہے۔حسرت نے اس شعر میں ترکیب یہ نکالی ہے کہ انھوں نے ان کے ظلم وستم کو بھی آزادی کی لڑائی کا ہتھیار بتایا ہے کیونکہ وہ لوگ جتنے مظالم ڈھائیں گے آزادی کے سپاہیوں کی شہرت اور حوصلوں میں اور اضافہ ہوگا اور اس طرح چھوٹے پیمانے پر آزادی کی چلائی جارہی تحریک کا اتنا شور ہوگا کہ ملک کا بچہ بچہ جان جائے گا کہ وطن کی محبت کیا ہوتی ہے اور آزادی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔اس طرح وطن کے ہر آدمی کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوجائے گی۔

21.9 زبان کے بارے میں

''اچھا ہے'' بول چال اور روزمرہ کا فقرہ ہے جسے شعر میں برت کر حسرت نے غزل میں سادگی پیدا کی ہے۔بظاہر یہ لفظ سختیوں کی تائید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ شورش حب وطن اور حب وطن کی تشہیر کے لیے استعمال

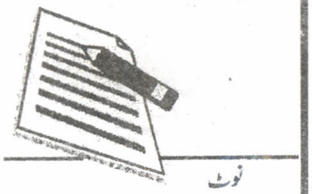

نوٹ

ہوا ہے۔اہلِ جور کا مطلب ظلم ڈھانے والے لوگ ہیں یہاں اشارہ انگریزوں کی طرف ہے۔

حب وطن ہر انسان کی اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کو اپنے ملک سے محبت ہوتی ہے۔اس شعر کو سمجھنے کے لیے ان باتوں پر ضرور توجہ دینی ہوگی۔

متن پر سوالات 21.4

1. اہل جور سے شاعر کی مراد ہے
   - الف) ظلم کرنے والے انسان
   - ب) سختی کرنے والے انسان
   - ج) انگریز جو کہ ہندوستانیوں پر ظلم ڈھا رہے تھے

2. مندرجہ بالا شعر کا مرکزی خیال ہے۔
   - الف) حب وطن یعنی وطن کی محبت
   - ب) ظلم کرنے والے سے زیادہ مضبوط ظلم سہنے والا ہوتا ہے
   - ج) آزادی کا جذبہ

شیرینی نسیم ہے سوز و گداز میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

21.10 متن کی تشریح

اردو شاعری میں ایک اور روایت رہی ہے جسے ہم شاعرانہ تعلی کہتے ہیں۔اس میں شاعر اپنے کلام کی تعریف خود ہی کرتا ہے مگر اس تعریف میں وہ اپنی روایت سے وابستہ بڑے شاعروں کے فن سے بھی اپنا رشتہ استوار کرتا ہے اور اس طور پر اپنے پیشرو شاعروں کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

دیا شنکر نسیم اپنی مثنوی گلزار نسیم سے اردو شعر و ادب میں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں جن کے کلام کی شیرینی یعنی مٹھاس کو ان کے شعر کی پہچان قرار دی گئی ہے۔اسی طرح میر تقی میر یعنی شہنشاہ غزل اپنے کلام میں پائے جانے والے سوز و گداز کی وجہ سے مشہور عام و خاص ہیں۔ان دونوں شاعروں کی یاد دلاتے ہوئے حسرت اپنی غزل اپنے کلام کی خصوصیت کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ حسرت کی شاعری پر ان دونوں روایتوں کا خاتمہ ہوگیا۔اس مبالغہ آمیز تعریف کے

نوٹ

ذریعے حسرت نے اپنے کلام کو ایسا کلام کہا ہے جس پر لطف سخن یعنی کلام کی بلاغت اور اس کے حسن کا خاتمہ ہو گیا ہے کہ اب ان کے جیسا شاعر پیدا نہیں ہوگا۔

اس شعر کو سمجھنے کے لیے میر تقی میر کی غزل کی خصوصیات اور دیا شنکر نسیم سے واقفیت ضروری ہے۔ ساتھ ہی شیرینی نسیم، سوز و گداز، لطفِ سخن جیسی ترکیبوں کے معنوی حسن سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

کلام میں شیرینی کا مطلب ہے بات کو نرمی اور خوش اسلوبی سے کہنا۔ سوز و گداز سے مراد شعر میں درد انگیزی اور ملائمیت ہے۔ لطفِ سخن سے مراد کلام میں پائی جانے والی جمالیاتی خصوصیت ہے۔

متن پر سوالات 21.4

1. شیرینی نسیم سے مراد ہے۔
   - الف) نسیم ایک ہوا ہے اس کی مٹھاس
   - ب) دیا شنکر نسیم کے کلام کی خصوصیت بھی شیرینی ہے
   - ج) میٹھے بول
2. سوز و گداز میر سے مراد ہے۔
   - الف) میر کے کلام میں پائی جانے والی ایک اہم خصوصیت درد انگیزی
   - ب) دیوانہ پن
   - ج) میر کا جلنا اور میر کا نرم و ملائم ہونا
3. لطف سخن سے مراد ہے۔
   - الف) کلام میں پائی جانے والی اعلیٰ درجے کی لطافت۔
   - ب) سخن کا لطف، بات چیت کا لطف
4. اس شعر میں بھی شاعر نے اپنے محبوب کی تعریف کی ہے اگر نہیں تو کیا؟
   - الف) وطن کی محبت کی تعلیم دی ہے
   - ب) جنگ آزادی میں شریک سپاہیوں کو ایک نیا حوصلہ دیا ہے تاکہ وہ آزادی سے منہ نہ موڑ لیں
   - ج) اپنے فن غزل گوئی کی خصوصیات بیان کی ہیں

21.11 شاعرانہ خوبیاں اور انداز بیان

حسرت نے اردو غزل کو ایک نئے دور میں داخل کیا اس کا احیا کیا اس میں نئی روح پھونکی اور اس وقت غزل کو معیار و وقار عطا کیا

جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم کے عروج کے آگے غزل کے زوال کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا حسرت نے اردو غزل کو محبوب کا نیا تصور دیا۔ ان کی شاعری میں ہمارے معاشرے کی ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جس کا وجود خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔

ان کی شاعری کا بڑا حصہ محبوب سے لگاوٹ اور اس کے حسن و جمال کے ذکر سے لبریز ہے۔ انہوں نے غزل کے پرانے انداز کو ترک کر دیا یعنی انہوں نے کا استعمال کم کر کے اردو غزل میں سادگی کو رواج دیا انہوں نے فلسفے اور تصوف کی پیچیدگیوں کو موضوع نہیں بنایا۔ حسرت کے نزدیک اچھی شاعری کے تین اوصاف ہیں۔ جذبات نگاری، جذبات عالی اور واقعہ نگاری اور یہی ان کے اسلوب کا طرّہ امتیاز ہے۔ حسرت نے اردو غزل میں وحدت تاثر کو داخل کیا اور واقعہ نگاری اور بیانیہ عناصر کو پہلی بار مضبوطی سے غزل کی روایت اور اسلوب کا حصہ بنایا۔

آپ نے کیا سیکھا

- اردو شاعری میں محبوب کے حسن اور اس کی اداؤں اور جسم کی نزاکتوں کی تصویر کشی کی روایت رہی ہے حسرت نے اس روایت کو حسن و خوبی کے ساتھ اس طرح سے برتا کہ یہ پہلو ان کی شاعری کی پہچان بن گیا۔
- حسرت سے پہلے اردو شاعری کا محبوب خیالی تھا یا مرد تھا۔ مومن کے یہاں اس تصور سے پہلی بار انحراف ملتا ہے لیکن حسرت نے محبوب کے تصور کو بدل دیا۔ ان کا محبوب متوسط اور شریف گھرانے کی ایک عورت معلوم ہوتی ہے۔
- حسرت کی سماجی حیثیت اور شاعری میں تضاد ہے۔ سماج کے لیے وہ ایک جنگ آزادی کے عظیم مجاہد ہیں جب کہ شاعری میں وہ ایک عاشق کے روپ میں ابھرتے ہیں۔
- حسرت کے محبوب اور ان کی محبت میں زمین کی مہک ہے۔ ان کی شاعری میں نظر آنے والا محبوب اور عاشق دونوں اس زمین پر رہنے والے گوشت پوست کے انسان نظر آتے ہیں۔
- جمالِ یار کی جیتی جاگتی تصویر، محبوب کے خوبصورت بدن کی جمالیاتی تصویر، لباس اور زیورات کا غیر روایتی بیان حسرت کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔
- حسرت کا اسلوب عام طور سے روایتی غزل سے لیا گیا ہے مگر مضامین کی ندرت نے پرانے اسلوب میں نئی روح پھونک دی ہے۔
- حسرت کے یہاں سیاسی شاعری بھی جگہ پاتی ہے مگر ان کی پہچان ان کی عشقیہ غزلوں سے ہے۔
- حسرت نے غزل میں وحدت تاثر کا رنگ پیدا کیا۔
- مبالغہ کلام میں شدت تاثیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

نوٹ

21.12 مزید مطالعہ

حسرت کی زیر مطالعہ غزل میں گیارہ اشعار ہیں جس میں سے پانچ منتخب اشعار نصاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ کلیات حسرت حاصل کریں اور اس غزل کا مطالعہ کریں۔ حسرت نے طویل غزلیں کہی ہیں۔ غلام علی کی گائی ہوئی اس غزل کو سنئے جس کا مطلع ہے چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے، ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے۔ یہ مشہور غزل بھی حسرت موہانی کی ہے۔

21.16 اختتامی سوالات

1. مبالغے کی تعریف کیجئے اور مثالیں دے کر سمجھایئے۔
2. اس غزل میں حسرت نے محبوب کے حسن کے کن کن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لکھئے۔
3. چاہ ذقن اور چاہ بابل کے بارے میں لکھئے کچھ دوسرے اشعار تلاش کر کے لکھئے۔
4. حسرت کی شاعرانہ خوبیوں اور ان کے اسلوب پر روشنی ڈالیے۔
5. حسرت کی غزل کی خصوصیات بیان کیجئے۔

متن پر سوالات کے جوابات

21.1 .1 (الف) جمالِ یار (ب) آتشِ گل (ج) جسم یار

.2 ج .3 ج .4 الف

21.2 .1 ج .2 ب .3 الف

21.3 .1 ج .2 ج

21.4 .1 ب .2 الف .3 الف .4 ج

ماڈیول - 3

اردو غزل کا ارتقا

نوٹ

22

محمد علوی

شاعر کا تعارف

محمد علوی کا تعلق گجرات کے مشہور صنعتی شہر احمد آباد سے ہے۔ ان کی پیدائش 10 / اپریل 1927 میں ہوئی۔ ان کے خاندان میں مذہبی و ثقافتی روایات کی پاسداری کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے، محمد علوی کی شاعری اس فکر اور روایت کی بھرپور نمایندگی کرتی ہے۔

1960 کے بعد اردو کے جدید شاعروں میں اپنی پہچان قائم کرنے والوں میں محمد علوی کو اپنے مخصوص انداز بیان اور لب ولہجہ کی وجہ سے ایک خاص اور منفرد مقام حاصل ہے۔ محمد علوی نے غزلیں اور نظمیں دونوں کہی ہیں اور انہیں دونوں صنفوں پر برابر عبور حاصل ہے۔ علوی کی شعری کائنات میں ذاتی حالات و کیفیات کے ساتھ ساتھ فطرت، گاؤں کے مناظر، کھیت کھلیان، گھر خاندان، بیوی بچے، گلی، محلّہ یعنی درمیانہ مسلم سماج کی تہذیبی، ثقافتی، مذہبی صورت حال اور ماضی کی یادوں کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اسی لیے علوی کی شاعری میں پیڑ، پودے، چرند، پرند اور دیہی وقصباتی زندگی سے متعلق الفاظ کثرت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ علوی کی شاعری کے اب تک چار مجموعے ''خالی مکان'' (1936) ''آخری دن کی تلاش'' (1968) ''تیسری کتاب'' (1978) اور ''چوتھا آسمان'' (1991) اور ایک کلیات ''رات ادھر اُدھر روشن'' (1995) شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کے سب سے بڑے ادبی ادارے ساہتیہ اکادمی نے محمد علوی کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ'' سے سرفراز کیا۔ محمد علوی نے اپنی شاعری کے بارے میں خود کہا ہے ؎

باتیں کہی کہی سی ہیں
پھر بھی نئی نئی سی ہیں

محمد علوی کے اشعار میں لطافت، مسرت اور تازگی کا راز یہی ہے کہ وہ اپنے شعری ہنر سے مانوس الفاظ کو ایک ایسے انوکھے معنی

نوٹ

کی طرف موڑ دیتے ہیں کہ کہی کہی سی باتیں نئی نئی سی لگنے لگتی ہیں اس طور پر محمد علوی کی شاعری سہل ممتنع سے عبارت ہے ——
اس سبق میں، ہم محمد علوی کی جس غزل کا مطالعہ کریں گے، اس میں زبان اور بیان دونوں سطحوں پر ان کی شاعرانہ خصوصیات موجود ہیں۔

مقاصد

اس غزل کو پڑھنے کے بعد آپ:

- غزل کے اشعار کی تشریح اور تحسین کر سکیں گے؛
- غزل میں استعمال کیے گئے الفاظ، تراکیب، کہاوتوں اور ان کے استعمال سے واقف ہو سکیں گے؛
- محمد علوی کے اندازِ بیان اور شاعرانہ خصوصیات سے واقفیت حاصل کر سکیں گے؛
- شاعر اور خاص طور سے غزل میں الفاظ کے استعمال کے فن کی باریکیوں سے آگاہ ہو جائیں گے؛
- دیہی اور قصباتی زندگی کی غزل میں شمولیت کا ہنر سیکھ سکیں گے۔

22.1 اصل سبق

آیئے اب غزل کا مطالعہ کریں:

غزل

دروازے پر پنجرے میں طوطا ہوگا
جھوٹے برتن گھر میں کوئی دھوتا ہوگا

اب بھی گاؤں میں نوٹنکی آتی ہوگی
کٹھ پتلی کا کھیل اب بھی ہوتا ہوگا

پھر اپنا بچپن آنکھوں میں گھوم گیا
اک بچہ سکول میں پھر روتا ہوگا

سارا جنگل بھرا ہوا ہے پیڑوں سے
جنگل میں بھی پیڑ کوئی بوتا ہوگا
کس نے گھر کی پہلی اینٹ رکھی ہوگی

نوٹنکی: ایک قسم کا ڈرامائی کھیل جس میں رقص وموسیقی کے ساتھ تماشے دکھائے جاتے ہیں۔
کٹھ پتلی: کاٹھ یعنی لکڑی کی مورتی یا گڑیا جسے بہت باریک تاروں کے ذریعے انگلیوں کی مدد سے نچایا اور کھیل تماشا دکھایا جاتا ہے۔
گھر کی پہلی اینٹ رکھنا: گھر کی بنیاد رکھنا
ہل: کھیتی اور باغبانی کے لیے زمین تیار کرنے کا ایک مخصوص اوزار یا آلہ۔

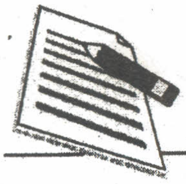

نوٹ

دن چڑھ آنا: سورج بلند ہو جانا، صبح کا وہ وقت جب دھوپ تھوڑی تیز اور گرم ہو جاتی ہے

سب سے پہلے ہل کس نے جوتا ہوگا
کوئی نہیں کہتا اب علوی جاگو بھی
دن چڑھ آیا اتنا کوئی سوتا ہوگا

○

دروازے پر پنجرے میں طوطا ہوگا
جھوٹے برتن گھر میں کوئی دھوتا ہوگا

22.2 متن کی تشریح

شاعر نے اس شعر میں جن خیالات اور احساسات کا بیان کیا ہے ان کا تعلق خود شاعر کی ذات اور اس کے گرد و پیش کے سماجی حالات سے ہے۔ دراصل شاعر ایک ترقی یافتہ عہد اور سوسائٹی میں اس قصباتی زندگی اور سماج کو یاد کر رہا ہے جس میں اس نے اپنے بچپن کا زمانہ گزارا ہے۔ اس وقت کا منظر شاعر کی آنکھوں میں بسا ہوا ہے جب عام طور پر گھر کے دروازے پر پنجرے میں طوطا ہوا کرتا تھا اور گھر کے جھوٹے برتن گھر کی بڑی بزرگ شخصیت یعنی ماں دھویا کرتی تھی۔ گویا آج جب کہ شاعر گاؤں چھوڑ کر شہر کی ترقی یافتہ زندگی بسر کر رہا ہے، اپنے بچپن کے قصباتی زمانے کو یاد کر کے ایک قسم کی لذت اور طمانیت محسوس کرتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ وہاں زندگی آج بھی اسی نہج پر رواں دواں ہوگی۔

محمد علوی نے اس شعر میں اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے ماضی کی اور متوسط طبقے کی قصباتی زندگی کو بیان کیا ہے جس سے اس وقت کے معیار زندگی اور سماجی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

22.3 زبان کے بارے میں

محمد علوی نے اس شعر میں نہایت آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ الفاظ سادہ سلیس اور روزمرہ زندگی کے ہیں۔ کوئی مشکل اور ثقیل لفظ یا ترکیب نہیں استعمال نہیں کی گئی۔ طوطا لفظ توتا بھی لکھا جاتا ہے اور اب کثرت کے ساتھ یہی مستعمل ہے۔ طوطا (توتا) میں لاحقہ لگا کر کئی الفاظ بنتے ہیں جیسے طوطا چشم بمعنی بے وفا، بے مروت، توتے اڑنا یعنی ہوش اڑنا، حیرت زدہ ہونا، توتے کی طرح رٹنا یعنی بغیر سوچے سمجھے یاد کرنا۔ فنی اعتبار سے مطلع کے دونوں مصرعوں میں لفظ طوطا اور دھوتا قافیہ کے تصور پر آیا ہے اور دونوں مصرعوں میں یکساں لفظ "ہوگا" ردیف ہے۔

اب بھی گاؤں میں نوٹنکی آتی ہوگی
کٹھ پتلی کا کھیل اب بھی ہوتا ہوگا

22.4 متن کی تشریح

غزل کے مطلع کی طرح اس شعر میں محمد علوی نے گاؤں اور قصبے کی اسی مخصوص زندگی اور تہذیب وثقافت کی منظر کشی کی ہے جہاں عام لوگوں اور بچوں کی دلچسپی اور تفریح کا ذریعہ ریڈیو، ٹی۔وی اور سینما نہیں بلکہ نوٹنکی اور کٹھ پتلی کا کھیل تماشا ہوا کرتا تھا۔اس طرح سے اس شعر میں بھی شاعر نے اپنے بچپن کے انہیں ایام کو پیش کیا ہے، جب وہ گاؤں میں رہتا تھا اور نوٹنکی اور کٹھ پتلی کے کھیل تماشوں سے دل بہلایا کرتا تھا۔شاعر سوچتا ہے کیا وہ کھیل اب بھی ہوتے ہوں گے۔؟ اور یہ بھی خیال کرتا ہے کہ شاید ہوتے ہوں شعر کے لہجے میں خواہش تجسس اور افسردگی سبھی کچھ ہے۔

22.5 زبان کے بارے میں

غزل کے اس شعر میں بھی زبان عام فہم، صاف اور رواں ہے۔ الفاظ کا استعمال فن کاری سے کیا گیا ہے۔لفظ کٹھ پتلی اور نوٹنکی محاورے کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں جیسے کسی کی کٹھ پتلی ہونا یعنی کسی دوسرے کے حکم کے تابع ہونا۔کٹھ پتلی کی طرح ناچنا یعنی بہت زیادہ مصروف ہونا۔اسی طرح نوٹنکی کرنا یعنی دکھاوے کے لیے کوئی کام کرنا۔

متن پر سوالات 22.1

1. اس غزل کا کون سا شعر مطلع ہے؟
   (الف) پہلا شعر
   (ب) دوسرا شعر
   (ج) آخری شعر
   (د) کوئی شعر نہیں

2. غزل کے دوسرے شعر میں کون سا لفظ قافیہ ہے؟
   (الف) طوطا
   (ب) دھوتا
   (ج) نوٹنکی

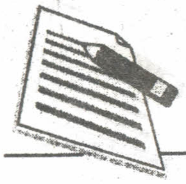

نوٹ

(د) ہوتا

3. اس غزل میں پیش کیے گئے خیالات کے بارے میں کون سی بات درست ہے؟

(الف) ان باتوں کا تعلق قصباتی زندگی سے ہے۔

(ب) ان اشعار میں شاعر نے شہری زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

(ج) شاعر نے کسی بھی تہذیب کا نقشہ نہیں پیش کیا ہے۔

22.6 متن کی تشریح

پھر اپنا بچپن آنکھوں میں گھوم گیا
اک بچہ سکول میں پھر روتا ہوگا

اس شعر میں شاعر نے اپنے بچپن کے اس زمانے کو یاد کیا ہے جب وہ اسکول جایا کرتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکول جانے یا اسکول سے آتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر شاعر کو اپنا بچپن اور وہ اسکول یاد آنے لگتا ہے جہاں بچے اپنی خاص نفسیات اور مزاج کے تحت گھر کو یاد کر کے، بھوک پیاس، استاد کی سختی یا اپنی آزادی سلب ہونے کی وجہ سے روتے تھے۔ شاعر نے ان باتوں کو کچھ ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہونے لگتا ہے کہ اس تمام عمل میں وہ خود بھی شریک تھا۔

22.7 زبان کے بارے میں

اس شعر کی زبان بہت عام فہم اور سادہ ہے۔ شاعر نے اپنی بات بتانے کے لیے براہ راست انداز کی جگہ بالواسطہ پیرایہ اختیار کیا ہے لیکن پہلے مصرع میں لفظ ''پھر'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر شاعر خود اپنے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ ''اک'' اور ''سکول'' ایک اور اسکول کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہاں پر شعری ضرورت کے لیے الف حذف کر دی گئی ہے۔ شاعری میں اشعار کو بحر اور وزن پر لانے کے لیے ایسا کرنا درست ہے۔ آنکھوں میں گھومنا محاوراتی استعمال ہے جس کا مطلب ماضی کی یادوں یا گزری ہوئی باتوں کا ذہن میں آنا ہے۔ لفظ رونا سے محاورے بھی بنائے جاتے ہیں جیسے رونا رونا یعنی اپنی روئداد بیان کرنا۔ اندھے کے آگے رونا یعنی اپنی بات بیان کرنا بے کار وقت برباد کرنا۔

سارا جنگل بھرا ہوا ہے پیڑوں سے
جنگل میں بھی پیڑ کوئی بوتا ہوگا

22.8 متن کی تشریح

اس شعر میں شاعر نے دیہات سے تعلق رکھنے والے فطری مناظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی عام نفسیات اور مشاغل

بھی بیان کیے ہیں۔ عام طور پر دیہات اور قصبوں میں بچے کھلے میدان اور باغات میں کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ شاعر کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے جب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ جنگلوں میں پیڑ پودے لگایا کرتا تھا۔ شاعر جن مناظر اور ماحول کا ذکر کر رہا ہے وہ اس کے حافظے کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو اپنی جڑوں سے وابستہ رکھنے کا وسیلہ بھی ہے۔ جنگل جو پہلے ہی درختوں اور پیڑ پودوں سے بھرا ہوتا ہے، اس میں پیڑ بونا شاعر کی مخصوص نفسیات اور حافظے کا غماز ہے۔

22.9 زبان کے بارے میں

اس شعر کا اندازِ بیان نثر کی خصوصیات سے بھرپور ہونے کی وجہ سے بے حد سلیس اور عام فہم ہے۔ شاعر نے پیڑ بونا استعمال کیا ہے۔ پیڑ اس درخت کو کہتے ہیں جس میں تنا ہوتا ہے۔ یہاں پیڑ بونے سے مراد نئے پیڑ لگانا ہے۔ اصل میں بیج بونا کہتے ہیں۔ یہاں پر شعر رعایت سے پیڑ بونا استعمال کیا گیا ہے۔

دوسرے مصرعے میں ایک معصومانہ تجسس اور خود کلامی کی کیفیت ہے گویا شاعر خود اپنے آپ سے استفسار کر رہا ہو۔ لہجہ بڑا معنی خیز ہے۔

متن پر سوالات 22.2

1. آنکھوں میں بچپن گھوم گیا میں کس زمانے کی طرف اشارہ ہے؟
   - (الف) ماضی
   - (ب) حال
   - (ج) مستقبل
2. شعر میں بچہ کے کس جگہ رونے کا ذکر ہے۔
   - (الف) گھر میں
   - (ب) سڑک پر
   - (ج) میدان میں
   - (د) اسکول میں
3. جنگل میں ''پیڑ بونے'' سے کیا مراد ہے؟
   - (الف) پیڑ کاٹنا
   - (ب) پیڑ لگانا
   - (ج) جنگل کے پیڑ پودے گھر لے جانا
   - (د) جنگل میں اضافہ کرنا

نوٹ

22.10 متن کی تشریح

کس نے گھر کی پہلی اینٹ رکھی ہوگی
سب سے پہلے ہل کس نے جوتا ہوگا

ظاہری طور پر اس شعر میں کھیتی کی ابتدا اور گھر کی تعمیر سے متعلق مضمون بیان کیا گیا ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ شعر تخلیق کائنات اور دنیا میں حضرت آدم کی آمد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ''گھر کی پہلی اینٹ رکھنا'' دنیا میں انسان کی پہلی بار بودوباش اختیار کرنے اور ''ہل جوتنا'' دنیا میں زندگی گزر بسر کرنے کے لیے وسائل کی تلاش کرنے کی جانب اشارہ ہے اور یہ کام دنیا میں حضرت آدم کے آنے سے شروع ہوا تھا۔

22.11 زبان کے بارے میں

اس شعر میں گھر کی پہلی اینٹ رکھنا ایک محاورہ ہے، جس سے مراد گھر کی بنیاد رکھنا ہے اور اس سے مراد دنیا میں آدمؑ کی آمد ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ شعر بہت سلیس اور بلیغ ہے۔ استفہامیہ یا سوالیہ انداز نے شعر کو معنوی تہہ داری اور حسن کی کیفیت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ پہلا ہل جوتنے سے مراد زمین کی پہلی کھیتی یعنی کاشتکاری کی ابتدا ہے۔ اور اس سے دنیا میں زندگی کے وسائل کی طرف اشارہ ہے۔

کوئی نہیں کہتا اب علوؔی جاگو بھی
دن چڑھ آیا اتنا کوئی سوتا ہوگا

22.12 متن کی تشریح

مقطع میں شاعر نے خالص ذاتی حوالے سے کام لیتے ہوئے پوری غزل میں پیش کی گئی فضا کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا ہے اور بچپن سے وابستہ انہیں یادوں سے مربوط کر دیا ہے جن سے غزل شروع ہوئی تھی۔ شاعر اپنے بچپن کے ان ایام کو یاد کر رہا ہے جب وہ دیر تک سوتا تھا اور اس کی ماں اس کو بار بار جگایا کرتی تھی۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اب جب کہ وہ بڑا اور ؟؟؟ ہو چکا ہے۔ اب دیر تک سونے پر کوئی جگانے والی شخصیت موجود نہیں ہے۔

22.13 زبان کے بارے میں

پیرایۂ اظہار کے اعتبار سے اس شعر کی زبان نثر کے قریب ہونے کی وجہ سے بہت سلیس اور عام فہم ہے جس کی وجہ سے شعر میں

سہل ممتنع کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے سہل ممتنع محمد علوی کی شاعری کی عمومی خصوصیت ہے اور ان کی بیشتر غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ جب کسی شعر میں ایسے بیانات پیش کیے جائیں جو بہت سادہ، عام فہم اور رواں ہو اور جس پر قاری یا سامع کو یہ گمان گزرے کہ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں مگر جب کوشش کرے تو اس کے لیے ایسا کرنا آسان نہ ہو۔ شعر کی اس خصوصیت کو ''سہل ممتنع'' کہتے ہیں۔ محمد علوی کی زیر مطالعہ پوری غزل سہل ممتنع کی خصوصیت سے بھرپور ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنا تخلص ''علوی'' استعمال کیا ہے۔ اس لیے یہ شعر مقطع کا شعر ہے۔ دن چڑھ آیا محاورہ ہے جس سے مراد سورج بلند ہونا اور تیز دھوپ نکل آنا ہے۔

متن پر سوالات 22.3

1. گھر کی پہلی اینٹ رکھنے کا مطلب ہے۔
   (الف) گھر بنانا
   (ب) گھر کی بنیاد رکھنا
   (ج) گھر کی دیوار کھڑی کرنا
   (د) گھر ڈھانا

2. ہل جوتنے سے مراد ہے؟
   (الف) فصل کاٹنا
   (ب) فصل بونے کے لیے زمین تیار کرنا
   (ج) فصل بونا
   (د) فصل کی سینچائی کرنا

3. مقطع اس شعر کو کہتے ہیں، جس میں:
   (الف) شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے
   (ب) دونوں مصرعوں میں قافیہ ردیف ہوتا ہے
   (ج) غزل کا آخری شعر ہوتا ہے
   (د) سہل ممتنع ہو

22.14 انداز بیان

محمد علوی کا شمار اردو کے جدید شعرا میں ایک اہم اور نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کا کلام نظموں اور غزلوں دونوں پر

مشتمل ہے اور انہیں دونوں پر دسترس حاصل ہے۔ زیر مطالعہ غزل محمد علوی کی غزلیہ شاعری کا نمایندہ ہے اور اپنے انداز۔ زبان و بیان لفظیات اور پیرایۂ اظہار کے لحاظ سے ان کی شاعری کی تمام خصوصیات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ محمد علوی کی غزلوں میں عام فہم الفاظ، رواں اور سلیس بیانات اور پیش کردہ فضا اور ماحول سے مناسبت رکھنے والے الفاظ غزل کو ابلاغ اور ترسیل کے جملہ لوازمات سے ہمکنار کرتے ہیں۔ زیر مطالعہ غزل میں پنجرہ، دروازہ، جھوٹا برتن، نوٹنکی، کٹھ پتلی، پیڑ بونا، ہل جوتنا وغیرہ الفاظ میں غزل کو پیش کردہ تہذیبی و سماجی پس منظر سے بھرپور وابستگی کی بنا پر قابل توجہ بنا دیا ہے۔

نوٹ

آپ نے کیا سیکھا

- بچپن اور ماضی کی یادیں انسان کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتی ہیں۔
- پہلے زمانے میں گاؤں اور قصبوں میں دلچسپی اور تفریح کا اہم ذریعہ نوٹنکی اور کٹھ پتلی کا کھیل تھا۔
- دیہی اور قصباتی تہذیب میں بڑوں اور بزرگوں کو ایک خاص متبرک مقام حاصل تھا اور ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔
- محمد علوی کی شاعری میں عام حالات اور مسائل عمومی انداز میں بیان ہوئے ہیں۔
- محمد علوی کی شاعری میں ''سہل ممتنع'' کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔
- ماضی کے حوالوں سے حال کی منظر نگاری محمد علوی کی شاعری کی عمومی خصوصیت ہے۔
- مشکل الفاظ سے گریز محمد علوی کی امتیازی خوبی ہے۔
- محمد علوی محسوسات کے شاعر ہیں، مگر وہ اپنے محسوسات براہِ راست بیان نہیں کرتے بلکہ کسی نہ کسی حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

22.18 اختتامی سوالات

1. زیر مطالعہ غزل کے مطلع اور مقطع کے اشعار کی تشریح اپنے لفظوں میں کیجیے۔
2. گاؤں اور قصبوں میں بچوں کی دلچسپی کے کھیل تماشوں کی ایک فہرست بنائیے۔
3. غزل کے بارے میں اپنے خیالات ایک پیراگراف میں تحریر کیجیے۔
4. محمد علوی کی شامل نصاب غزل میں استعمال قافیوں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔
5. محمد علوی کی شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیجیے۔
6. اس غزل کے پانچویں شعر کی تشریح اس طرح کیجیے کہ اس کا تہذیبی اور سماجی پس منظر بھی واضح ہو جائے۔

7. زیر نظر غزل میں کھیت جوتنے اور پیڑ بونے کا کیا مطلب ہے وضاحت کیجئے۔

8. مقطعے اور مطلعے میں فرق کی واضح کیجئے۔

22.15 مزید مطالعہ

محمد علوی کے کلیات ''رات ادھر اُدھر روشن'' سے اپنی پسند کی ایک ایسی نظم اور ایک ایسی غزل کا انتخاب کیجئے جن میں آپ کے نصاب میں شامل غزل کے مضامین موجود ہوں اور ان کی تفہیم وتشریح کیجئے۔

متن پر سوالات کے جوابات

22.1
1. الف
2. د
3. الف

22.2
1. الف
2. د
3. ب

22.3
1. ب
2. ب
3. الف

ماڈیول -4 نظم کی دیگر اصناف

سبق نمبر	عنوان		
23-	نظم کی دیگر اصناف۔	(تاریخ)	
24-	سودؔا	(قصیدہ)	فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک
25-	مرزا دبیؔر	(مرثیہ)	ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰ
26-	مرزا شوقؔ	(مثنوی)	جائے عبرت سرائے فانی ہے
27-	فراقؔ اور تلوک چند محرؔوم	(رباعیات)	
28-	اختر انصاری	(قطعات)	فطرت، دھوپ اور مینہ، آلامِ روزگار، دل کا باغ

فہرست

کتاب نمبر 2

ماڈیول -4 نظم کی دیگر اصناف

صفحہ نمبر	عنوان			سبق نمبر
77		نظم کی دیگر اصناف۔ (تاریخ)		23۔
91	فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک	(قصیدہ)	سوداؔ	24۔
103	ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰ	(مرثیہ)	مرزا دبیرؔ	25۔
111	جائے عبرت سرائے فانی ہے	(مثنوی)	مرزا شوقؔ	26۔
121		فراقؔ اور تلوک چند محروم (رباعیات)		27۔
131	فطرت، دھوپ اور مینہ، آلامِ روزگار، دل کا باغ	(قطعات)	اخترؔ انصاری	28۔

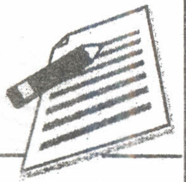

23

نظم کی دیگر اصناف

تعارف

اردو ادب کو موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک نثری ادب اور دوسرا شعری ادب۔ شعری ادب کو ہم نظم اور غزل کے دو بڑے زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اردو شاعری کا جب بھی تذکرہ ہوتا ہے تو عام طور سے اس سے مراد اردو غزل ہوتی ہے۔ بہ قول مسعود حسین رضوی..

''غزل ہماری شاعری کی وہ صنف ہے جس کی خصوصیتیں ہر نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں' ہر دل میں گھر کرتی ہیں اور ہر محفل کو گرماتی ہیں۔ مقدار کے لحاظ سے بھی غزل کا پلہ بھاری ہے۔ مگر قصیدے مثنویاں، رباعیاں، قطعے اور مسلسل نظمیں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ بلکہ مجموعی حیثیت سے غزلوں سے کہیں زیادہ ہیں۔''

شعری ادب میں نظم اب ایک علیحدہ صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور جدید دور میں اس کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ نظم کے لغوی معنی ''لڑی میں موتی پرونا'' ہیں۔ نظم کے دوسرے معنی ''ترتیب یا آرائش'' بھی ہیں۔ اردو میں اصطلاح کے طور پر نظم کا لفظ دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ عام اور وسیع مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مدّ مقابل کے طور بولا جاتا ہے اور اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے اور اس میں وہ تمام اوصاف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں۔ مخصوص اور محدود مفہوم میں نظم شاعری کی اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص موضوع پر مسلسل کلام کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ نظم میں ایک سے زیادہ موضوعات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا ہوتا ہے۔ ارتقار بھی نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقار واضح ہوتا ہے۔ مختصر نظموں میں یہ اکثر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔ نظم کی ان خصوصیات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں غزل کے علاوہ جتنی بھی اصنافِ شاعری وہ سب نظم میں داخل ہیں لیکن اپنی

چند الگ الگ خصوصیات کی بنا پر کچھ اصناف جیسے قصیدہ مثنوی' مرثیہ' قطعہ وغیرہ کے نام متعین ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان اصناف کو نظم نہ کہہ کر انہیں دوسرے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

اردو کے شعری حصے میں صنف غزل اور صنف نظم پر الگ الگ کتابیں ہیں۔ اس کتاب میں آپ کو نظم کی دوسری اہم اصناف سخن یعنی قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی اور قطعے سے متعارف کرایا گیا ہے۔

32.1 قصیدہ

قصیدہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس کا دامن موضوع کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ اس میں تعریف اور مذمت کے علاوہ دوسرے موصوعات کا بیان بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مناظر قدرت، مذہبی خیالات، پند و نصیحت، معاشی بدحالی، سیاسی انتشار وغیرہ۔

قصیدہ کی ابتدا، عرب سے ہوئی۔ ایران میں جب شعر و شاعری شروع ہوئی تو شاعروں نے عرب والوں کی تقلید کی۔ قصیدہ ایک صنف سخن ہے جس سے انعام واکرام وغیرہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے فارسی شاعری نے اس صنف کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اردو میں قصیدے کا فن فارسی شاعری ہی سے لیا گیا ہے۔

عربی زبان میں قصیدے کے معنی ''دل دار'' یا ''گاڑھے گودے'' کے ہیں۔ قصیدہ میں شاعر چونکہ انتہائی ذہنی قوت صرف کرتا ہے، اسی لئے اس کا نام قصیدہ ہو گیا۔ کچھ علما، کا خیال ہے کہ قصیدہ لفظ ''قصد'' سے بنا ہے۔ کیونکہ اس میں شاعر ایک خاص موضوع پر ارادہ کر کے پوری توجہ کے ساتھ شعر کہتا ہے۔ اصطلاح میں ایسی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف یا مذمت (ہجو) کی جائے۔ ابتدا، میں اس کا استعمال ذاتی غرض یا کسی لالچ کے لئے نہیں ہوتا تھا، مگر بعد میں انعام واکرام کے لالچ میں قصیدوں میں بادشاہوں اور نوابوں کی بے جا تعریف کی جانے لگی اور پھر یہی رواج ہو گیا اور قصیدہ کو صرف تعریف یا مذمت کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

قصیدہ کی بناوٹ یا ہئیت

غزل کی طرح قصیدے کے بھی پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جو ''مطلع'' کہلاتے ہیں، باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعے ہی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدے کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ قصیدے میں کبھی کبھی ایک سے زیادہ مطلع بھی ہوتے ہیں۔

قصیدے کی قسمیں

(الف) خطابیہ: جو قصیدہ براہ راست اصل موضوع یعنی مدح یا مذمت سے شروع ہوتا ہے، وہ

نوٹ

خطابیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

(ب) تمہیدیہ: جو قصیدہ براہ راست مدح یا مذمت سے شروع نہیں ہوتا بلکہ شروع میں کچھ اشعار تمہید کے طور پر شامل کئے جاتے ہیں، وہ تمہیدیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

مضمون کے اعتبار سے قصیدہ کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) مدحیہ : جس میں کسی کی تعریف کی جائے۔

(۲) ہجویہ : جس میں کسی کی برائی کی جائے یا زمانے کا گلہ شکوہ کیا جائے۔

(۳) وعظیہ : جس میں نصیحت کے مضامین ہوں۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی

۱۔ تشبیب یا نسیب ۲۔ گریز ۳۔ مدح یا مذمت ۴۔ دعا یا حسن طلب

۱۔ تشبیب یا نسیب: عرب کے شعرا، قصیدے کی ابتدا، عشقیہ اشعار سے کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے اس حصے کو تشبیب یا نسیب کا نام دیا گیا۔ لیکن اردو میں شعرا نے تشبیب میں حسن وعشق کے علاوہ پند ونصیحت، فلسفہ و حکمت، موسم بہار کی کیفیت وغیرہ کو نظم کر کے اسے وسعت عطا کی۔ اکثر تشبیب کا اصل موضوع یعنی مدح یا مذمت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں عام طور سے شاعر کو اپنی علمیت وقابلیت اور قادر الکلامی دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے۔ مطلع کے لیے ضروری ہے کہ دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ مطلع کی خوبی یا خرابی قصیدے کے باقی تمام اشعار کا پتہ دیتی ہے، اس لیے شاعر پوری کوشش کرتا ہے کہ مطلع ایسا ہو کہ سننے اور پڑھنے والا چونک پڑے اور اس کی توجہ قصیدے کی طرف مبذول ہو جائے۔ مثلاً سوداؔ کے ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

صباحِ عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

۲۔ گریز: تشبیب کے بعد شاعر اصل موضوع یعنی مدح، مذمت پر آنا چاہتا ہے، مگر تشبیب اور اصل موضوع چونکہ دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے شاعر ایک یا ایک سے زیادہ شعر کہتا ہے۔ ان اشعار کو ''گریز'' کہتے ہیں۔ یہ تشبیب اور مدح کے درمیان کڑی کا کام کرتا ہے۔ گریز قصیدے کا سب سے نازک حصہ ہے۔ گریز کے اشعار جتنے خوبصورت اور انوکھے ہوتے ہیں۔ قصیدہ اتنا ہی معیاری مانا جاتا ہے۔

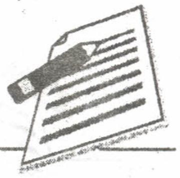

نوٹ

۳۔ مدح یا مذمت: قصیدے کا اصل موضع مدح یا مذمت ہے۔ مدح میں جس کی تعریف کی جاتی ہے اس کا علم وفضل، عدل وانصاف، دلیری اور سخاوت وغیرہ کو بہت بڑھا چڑھا کر مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مدح اگر بزرگان دین کی ہوتی ہے تو اشعار میں عقیدت اور احترام جھلکتا ہے، اور اگر قصیدہ انعام کی غرض سے کہا جاتا ہے تو اشعار میں مبالغہ آمیز تعریف وتوصیف پائی جاتی ہے۔

۴۔ دعا یا حسنِ طلب: یہ قصیدے کا آخری حصہ ہے۔ مدح کے بعد بزرگان دین کے توسط سے خدا سے دعا مانگی جاتی ہے۔ اور اگر قصیدہ کسی شخص کی مدح میں ہے تو حسنِ طلب سے کام لے کر شاعر اپنے لیے انعام کا طالب ہوتا ہے۔ بعض قصیدوں میں صرف ممدوح کی صحت اور درازی عمر وغیرہ کی دعا مانگ کر قصیدہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

23.2 قصیدے کا ارتقاء

دکن میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو قصیدہ نگاری کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی، کیوں کہ اس زمانے میں اردو شاعری سے دلچسپی لینے والے لوگ عام طور پر صوفیائے کرام تھے۔ اس لیے ایسے قصیدے زیادہ کہے گئے جن میں خدا اور بزرگان دین کی مدح کی جاتی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ غالباً پہلا شاعر ہے جس نے قصیدہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس نے حمد، نعت، منقبت وغیرہ کے ساتھ ساتھ مذہبی تہواروں اور موسموں پر بھی نظمیں کہیں جو قصیدے ہی کی ایک شکل ہیں۔

سودؔا کے زمانے تک اردو میں اچھے خاصے قصیدے کہے جا چکے تھے۔ لیکن سودؔا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اگر انہیں اس فن کا امام کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے حمد، نعت اور منقبت بھی کہے اور بادشاہوں اور امیروں کی مدح بھی کی۔ قصیدے کا انداز بیان دوسرے اصناف سخن سے مختلف ہوتا ہے، مضمون آفرینی، جوش بیان، پُر شکوہ الفاظ، روانی، سلاست اور جدت وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سودؔا کے قصیدوں میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی زمانے میں میر تقی میرؔ اور قائمؔ چاند پوری وغیرہ نے بھی قصیدے کہے۔ لیکن سودؔا کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔

اردو قصیدہ نگاری میں سودؔا کے بعد انشاؔ کا نام آتا ہے۔ انشاؔ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قصیدے کہے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی، جوش وخروش اور زور بیان تو ضرور ہے لیکن فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ کے استعمال کی وجہ سے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

نوٹ

مصحفی انشا کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے بھی عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں قصیدے کہے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں وہ شان وشوکت اور بلند پروازی ملتی ہے جو قصیدے کے لیے ضروری ہے لیکن وہ جوش وخروش نہیں ہے جو سودا اور انشا کے قصدوں میں پایا جاتا ہے۔

سودا کے بعد اردو کے سب سے بڑے قصیدہ نگار شیخ محمد ابراہیم ذوق ہیں۔ انہیں بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف بھی حاصل تھا، اس لیے ان کے تمام قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ بہ قول مولانا محمد حسین آزاد، ذوق نے قصیدے کو ایسی اونچی محراب پر سجایا ہے کہ یہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔'' ذوق کے قصیدوں میں جو رنگین بیانی، شکوہ الفاظ، زور بیان اور استادانہ فن کاری ہے، وہ ان کے بعد کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہوسکی۔

ذوق کے ہم عصروں میں غالب اور مومن نے چند اچھے قصیدے کہے۔ مومن کے قصیدے زیادہ تر بزرگان دین کی مدح میں ہیں۔ غالب کے اردو میں چار قصیدے ملتے ہیں، جن میں دو حضرت علی کی مدح میں ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں اور علمیت اور فن شعر میں مہارت کے ضامن ہیں۔

مومن اور غالب کے بعد قصیدہ نگاری میں ایک اہم نام محسن کاکوری کا ہے جنہوں نے بہت سے قصیدے کہے۔ ان کا ایک قصیدہ ''سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل'' بہت مقبول ہوا۔ محسن کاکوری کے علاوہ داغ دہلوی، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، جلال لکھنوی، عزیز لکھنوی اور جلیل مانک پوری وغیرہ نے بھی چند قصیدے کہے مگر انہیں کوئی خاص شہرت حاصل نہ ہوسکی۔ آج نہ بادشاہ ہیں اور نہ ان کا دربار، اور نہ ہی انعام واکرام کی بارش کرنے والے اور فن کی قدر کرنے والے قدر دان، ایسی حالت میں اگر قصیدے کو زوال نہ آتا تو تعجب کی بات تھی۔ آج اس صنف کو گھن لگ گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ذاتی مفاد سے اوپر اُٹھ کر کام کرنے والوں کی عزت اور حوصلہ افزائی صرف اسی صنف کے ذریعے ممکن ہے۔

23.3 مرثیہ

مرثیہ لفظ ''رثا'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں رونا، ماتم کرنا۔ اصلاً مرثیہ سے مراد وہ نظم ہوتی ہے، جو کسی شخص کے مرنے پر لکھی جائے اور جس میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جائیں اور اپنے غم کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اردو میں مرثیے کا ایک خاص مفہوم متعین ہوگیا ہے۔ یعنی مرثیے سے مراد وہ نظم ہے جس میں حضرت امام حسینؓ اور دیگر کربلا کے شہیدوں کا ذکر کیا جائے۔ اس کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیے کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً حالی نے غالب کے مرنے پر مرثیہ غالب لکھا اور اقبال نے داغ کا مرثیہ لکھا۔ چکبست نے گوکھلے کا مرثیہ لکھا۔

ابتدا میں مرثیے مختصر لکھے جاتے تھے اور ان کے لیے کوئی خاص شکل بھی مقرر نہیں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سودا پہلے شاعر ہیں

جنھوں نے مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت استعمال کی۔ میر خلیقؔ اور میر ضمیرؔ کے زمانے میں مسدس کو مقبولیت حاصل ہوئی اور پھر مرثیے کے لیے صرف یہی ہیئت مخصوص ہوگئی۔ میر ضمیرؔ نے مرثیے کے اجزائے ترکیبی متعین کیے جو حسب ذیل ہیں۔

نوٹ

۱۔ چہرہ : چہرہ، مرثیے کی تمہید کو کہتے ہیں۔ اس میں شاعر ایسے مضامین نظم کرتا ہے جن کا اصلی موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جیسے صبح کا منظر، رات کا سماں، گرمی کی شدت، دنیا کی بے ثباتی، سفر کے مصائب، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت وغیرہ۔

۲۔ سراپا: اس میں مرثیے کے ہیرو کے قد و قامت، خدوخال اور دیگر اوصاف کا بیان کیا جاتا ہے۔

۳۔ رخصت: اس حصے میں ہیرو کو میدان جنگ میں جانے کے لیے حضرت امام حسینؓ سے اجازت لیتے ہوئے اور تمام عزیزوں سے رخصت ہوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

۴۔ آمد: اس حصے میں ہیرو کے گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ میدان جنگ میں آنے کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ اس میں گھوڑے کی مبالغہ آمیز تعریف بھی نظم کی جاتی ہے۔

۵۔ رَجز: ہیرو اپنے خاندان کی تعریف، اپنے بزرگوں کے کارناموں کا ذکر اور جنگ کے معاملات میں اپنی مہارت اور بہادری کا بیان کرتا ہے۔ دشمن کی فوج کے جس پہلوان سے مقابلہ ہوتا ہے، وہ بھی اپنے اسلاف کی بہادری کا بیان کرتا ہے۔

۶۔ جنگ: ہیرو مقابل فوج کے کسی نامور پہلوان سے یا پوری فوج سے بڑی شجاعت اور بہادری کے ساتھ لڑتا ہے۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کی تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

۷۔ شہادت: ہیرو میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے آخر کار دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہو جاتا ہے۔ مرثیے کے اس جز میں اسی شہادت کا بیان انتہائی موثر انداز میں کیا جاتا ہے۔

۸۔ بین: یہ مرثیے کا آخری جزو ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اسے علیحدہ جز و شمار نہیں کرتے بلکہ شہادت ہی میں شامل کرتے ہیں۔ اس آخری حصے میں اس منظر کی تصویر کشی کی جاتی ہے، جب ہیرو کی لاش پر اس کے عزیز و اقارب خاص طور پر عورتیں اس کی خوبیوں کا بیان کر کے روتی ہیں۔ انیسؔ کو اس صفت میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جن میں تمام اجزائے ترکیبی ملتے ہیں۔ ایسے مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں صرف حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر اظہار غم کیا گیا ہے۔

اردو مرثیے کا آغاز دکن میں پندرھویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ ابتدائی مرثیے عام طور پر پانچ سات شعروں سے زیادہ کے نہیں ہوتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی کے یہاں اس قسم کے مرثیے ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں میرؔ اور سوداؔ سے قبل مرثیہ

نوٹ

کہنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ سودا اور میر دونوں کے کلیات میں مرثیوں کی اچھی تعداد ہے۔ ان دونوں کے بعد بھی دہلی میں شاعروں نے مرثیے لکھے لیکن ان میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ہے۔

لکھنؤ میں میر خلیق پہلے شاعر ہیں جنہوں نے صرف مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ خلیق نے غزل گوئی سے شاعری کی ابتدار کی تھی لیکن بعد میں تمام توجہ صرف مرثیہ گوئی پر مرکوز کر دی۔ ان کے مرثیوں کی زبان صاف پاکیزہ ہے۔ اسی لیے ان کے مرثیوں میں سوز و گداز اور درد و اثر ہے۔ خلیق کے ہم عصروں میں میر ضمیر بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مرثیے کے بہت سے اجزائے ترکیبی کی ایجاد اور ان کی ترتیب میر ضمیر ہی نے کی۔

میر ببر علی انیس کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ انیس نے شاعری کی ابتدا، غزل سے کی لیکن بہت جلد غزل چھوڑ کر مرثیہ کہنے لگے۔ انیس کی سب سے بڑی خوبی ان کی قادر الکلامی ہے۔ واقعہ نگاری میں میر انیس کو پوری قدرت حاصل ہے۔ زبان و بیان کے معاملے میں انیس کا مقابلہ کوئی اور مرثیہ گو نہیں کر سکتا۔ ان کے کلام میں جو سلاست، روانی، فصاحت، بلاغت اور شگفتگی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

میر انیس کے ہم عصر اور حریف مرزا دبیر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات اور استعارات کا برجستہ استعمال ہے۔ دبیر اپنے مرثیوں میں پُرشکوہ الفاظ، شاعرانہ استدلال اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ انیس اور دبیر نے مرثیہ گوئی کو ایک اعلا فن کا درجہ دیا، اسے استحکام بخشا اور اجزائے مرثیہ کو بڑی خوبی کے ساتھ نبھایا۔ انیس اور دبیر کے بعد بھی مرثیے لکھے گئے لیکن کوئی اس فن کو ان دونوں سے آگے نہ لے جا سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ مرثیوں کی ترقی سے اردو شاعری میں رزمیہ شاعری (جنگ سے متعلق شاعری) کی جو کمی محسوس ہوتی تھی وہ پوری ہو گئی بلکہ منظر نگاری، جذبات نگاری اور دیگر اخلاقی مضامین سے اردو شاعری اور نکھر گئی۔

23.4 مثنوی

مثنوی کے لغوی معنی ہیں ''دوہرا کیا ہوا'' یا ''دو دو والا''۔ اصطلاح میں ان مسلسل اشعار کے مجموعے کو مثنوی کہتے ہیں جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر شعر میں الگ الگ قافیہ لایا جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے مثنوی کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مطلع ہوتا ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔

اردو میں طویل اور مختصر دونوں طرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ طویل مثنویوں کی مثالیں میر حسن کی ''سحرالبیان'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم'' ہیں۔ اور مختصر مثنویوں میں میر تقی میر کی مثنویوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ طویل مثنویوں میں عام طور پر مندرجہ ذیل اجزا، پائے جاتے ہیں۔

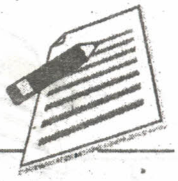

نوٹ

1. حمد و مناجات
2. نعت
3. منقبت
4. حاکم وقت کی مدح
5. اپنی شاعری کی تعریف
6. مثنوی لکھنے کا سبب
7. قصہ یا واقعہ
8. خاتمہ

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مثنوی میں یہ تمام اجزا موجود ہوں۔

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مثنوی ایک اہم صنف سخن ہے۔ اس میں جن اور پریوں کے قصے اور مافوق الفطرت واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن و عشق کے قصے، خوشیوں اور غموں، جنگ، بزم طرب، شادی اور موت کی رسموں، اخلاقی قصوں، تصوف کے مسائل اور مذہبی تعلیمات کا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ کسی زمانے کے سیاسی، سماجی حالات، رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے، لباس اور زیورات وغیرہ کی تفصیلات جاننے کے لیے مثنوی کا مطالعہ سب سے زیادہ مفید ہے۔

دکنی اردو میں آغاز ہی سے مثنویاں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ میراں جی شمس العشاق نے ''شہادت الحقیقت'' اور ''خوش نامہ'' لکھیں۔ نظامی نے ''کدم راؤ پدم راؤ'' مثنوی لکھی۔ یہ مثنوی ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ سید اشرف بیابانی نے ایک مثنوی ''نوسر ہار'' لکھی۔ مقیمی کی مثنوی ''چندر بدن'' اور غواصی کی مثنوی ''سیف الملوک'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' بھی دکن کی مشہور مثنوی ہے جس میں محمد علی قطب شاہ اور ایک رقاصہ بھاگ متی کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ ابن نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' کو بھی بڑی شہرت ملی۔ سراج کی مثنوی ''بوستان خیال'' اک اہم مثنوی ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز ہی سے اچھی مثنویوں کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ شاہ مبارک آبرو کی ''وعظ آرائشِ معشوق'' اور حیدر بخش حیدری کی ''شاہ نامہ'' شمالی ہند کی ابتدائی مثنویاں ہیں۔ اسی زمانے میں سودا اور میر کی مثنویاں بہت اہم ہیں۔ ان دونوں نے مثنوی کو ہجو اور مدح دونوں کے لیے استعمال کیا ہے۔

خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر دہلوی کی مثنوی ''خواب و خیال'' اسی زمانے میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کا کوئی پلاٹ نہیں۔ ایک معمولی سی حسن و عشق کی داستان بیان کی گئی ہے لیکن اس میں جو سراپا بیان کیا گیا ہے، وہ بہت خوبصورت ہے۔ اس مثنوی کی سب سے اہم خوبی میر اثر کا انداز بیان ہے۔ زبان میں سادگی، روانی اور شگفتگی ہے۔ شمالی ہند کی یہ پہلی کامیاب مثنوی ہے۔

مثنوی خواب وخیال دہلی میں لکھی گئی تھی لیکن ہر لحاظ سے سب سے زیادہ کامیاب مثنوی لکھنؤ میں لکھی گئی جس کا نام ''سحرالبیان'' ہے اور اسے میر حسنؔ نے لکھا ہے۔ اس مثنوی کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اردو میں پہلی بار کسی شاعر نے ہندوستانی تہذیب وتمدن، رہن سہن آداب واطوار، زیور اور لباس وغیرہ کا اتنا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پوری مثنوی میں جو سلاست، روانی، شگفتگی اور رنگینی ہے وہ اس سے پہلے کسی مثنوی میں نہیں ملتی۔

اردو کی ایک عظیم مثنوی ''گلزارنسیم'' ہے۔ جسے دیا شنکر نسیمؔ نے لکھا ہے۔ نسیمؔ نے اس مثنوی میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں لفظی تکلفات، الفاظ کا تناسب، تشبیہیں اور استعارے اور رعایت لفظی کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ مثنوی ''سحرالبیان'' دلّی کی اور ''گلزارنسیم'' لکھنؤ کی نمائندہ مثنویاں ہیں۔

اسی زمانے میں نواب مرزا شوقؔ نے بھی چھ مثنویاں لکھیں۔ لیکن مثنوی ''بہارعشق'' اور مثنوی بسنے والے گوشت پوست کے انسان ہیں۔ مرزا نواب شوقؔ کو میر اثرؔ کی مثنوی ''خواب وخیال''، بہت پسند تھی۔ اس لیے ان کی مثنوی پر ''خواب وخیال'' کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

مولانا حالیؔ اور مولانا محمد حسین آزادؔ کے زمانے سے مثنوی کے اسلوب اور موضوعات میں نمایاں فرق آیا، اور اس میں عوامی موضوعات اور مسائل نظم کیے جانے لگے۔ حالیؔ کی مثنوی ''برکھارت'' اور ''چپ کی داد'' کو بہت شہرت ملی۔ مولانا محمد حسین آزادؔ، اسمٰعیل میرٹھی، اور شوقؔ قدوائی نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔

جوشؔ نے ''جنگل کی شہزادی'' تخلیق کر کے شہرت حاصل کی۔ ان کی مثنوی ''بیوہ سہاگن'' بھی نہایت پُر تاثیر ہے۔
اردو شاعری کے آغاز سے لے کر 1857 تک بہت کم شعرا ایسے ہوں گے جنہوں نے مثنویاں نہ کہی ہوں لیکن شہرت انہیں مثنویوں کو ملی جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

23.5 ''رباعی''

غزل، قصیدے اور مثنوی کی طرح رباعی کا نام بھی عربی سے نکلا ہے۔ یہ لفظ ''ربع'' سے بنا ہے، جس کے معنی ''چار'' کے ہیں۔ اس اعتبار سے رباعی چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں۔ رباعی کو دوبیتی اور ترانہ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر چار مصرعے والی نظم کو رباعی نہیں کہتے۔ رباعی ایک خاص بحر اور مخصوص وزن کے تحت لکھی جانے والی چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے۔ اس بحر کا نام ''ہزج'' ہے۔

رباعی کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو۔ کبھی کبھی تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہوتا ہے۔ قطعے کے پہلے دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔ مضمون کے اعتبار سے چاروں مصرعوں سے بات کا مطلب واضح ہوتا ہے۔

نوٹ

رباعی کا آخری مصرعہ خاص طور سے بہت زوردار ہوتا ہے۔ یہ پوری رباعی کا نچوڑ اور نقطۂ عروج ہوتا ہے۔

معنی کے اعتبار سے رباعی میں حسن وعشق، اخلاق، فلسفہ، تصوف، مذہب، پندونصیحت اور شاعر کے ذاتی حالات کا بیان ہوتا ہے۔ رباعی میں الفاظ کے انتخاب اور اسلوب بیان میں متانت اور موزونیت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اردو شاعری میں رباعی کی روایت زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ شمالی ہند میں بیشتر شاعروں نے کچھ نہ کچھ رباعیاں ضرور کہی ہیں۔ شمالی ہند کے مشہور شاعروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ نے تقریباً تمام مضامین باندھے ہیں۔ ان کی ایک مدحیہ رباعی دیکھیے جس میں چوتھے مصرعے کے مبالغے نے رباعی کو لافانی کردیا ہے۔

ایوانِ عدالت میں تمہارے اے شاہ
کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا جو واں طاق سے رپٹے ہے پاؤ
پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

خواجہ میر دردؔ کو رباعی کہنے پر پوری قدرت تھی۔ انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رباعیاں کہی ہیں۔ میر تقی میرؔ بھی کامیاب رباعی نگار ہیں۔ غزل میں ان کا جو انداز بیان ہے، وہ یہاں بھی قائم ہے۔ اسی لیے ان کی رباعی میں بھی حزن و یاس اور سوز وگداز ہے۔ انھوں نے رباعی میں بہت سے مضامین باندھے ہیں۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے۔

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سر بام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں پیش ہمت دشوار

قائم چاند پوری، مرزا جعفری علی حسرتؔ، احسن اللہ خان بیاںؔ وغیرہ کے کلام میں بھی رباعیاں ملتی ہیں۔ اس کے بعد کے شعرا میں مصحفی قابلِ ذکر رباعی گو ہیں۔ اس کے بعد انیسؔ اور دبیرؔ کے زمانے تک بیشتر شاعروں نے رباعیاں کہیں۔ مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

میر انیسؔ کی رباعیاں میں تمام مضامین ملتے ہیں۔ انھوں نے مذہبی موضوعات پر بہت زیادہ رباعیاں کہیں۔ چونکہ بنیادی اعتبار سے وہ مرثیہ گو تھے اس لیے انھوں نے واقعات کربلا پر رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے۔

جب دفن ہوا شیر خدا کا خانی
سجاد نے کی قبر پر آب افشانی

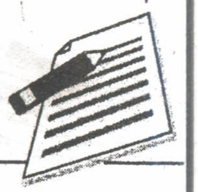

نوٹ

شبیر کی پیاس کا کہوں میں کیا اثر
پیتی گئی خاک جتنا چھڑکا پانی

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد جب تمام ہندوستان پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہوگیا تو ہندوستانیوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ مغربی تعلیم حاصل کریں۔ اس سیاسی انقلاب اور مغربی علوم کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں میں نیا شعور پیدا ہوا اور رباعی میں ایسے مضامین کہے جانے لگے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کہے گئے تھے۔ ایسے شاعروں میں مولانا الطاف حسین حالؔی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حالؔی نے جہاں اخلاقی، فلسفیانہ رباعیاں کہیں، وہاں اصلاحی اور سیاسی رباعیاں کہہ کر قوم کو سدھارنے کی کوشش بھی کی۔ مثلاً

اے علم! کیا تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

جوش ملیح آبادی دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن انہیں رباعی گوئی میں بھی پوری مہارت حاصل ہے۔

فراقؔ گورکھپوری نے اردو میں اعلا درجے کی رباعیوں کا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے رباعیوں میں اپنے محبوب کے سراپا بیان کیے ہیں اور ہندوستانی زندگی کا عکس اُتارا ہے۔ اگر کہا جائے کہ فراقؔ نے اردو رباعی کو نئی زبان دی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہندی الفاظ کا اتنی کثرت سے استعمال کیا ہے، اور پھر ان الفاظ کے استعمال میں پورے سلیقے سے کام لیا ہے۔ ان کی ایک رباعی پیش ہے۔

غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے
مطرب کو ساز چھیڑ جائے جیسے
یوں پھوٹ رہی ہے مسکراہٹ کی کرن
مندر میں چراغ جھلملائے جیسے

23.6 قطعہ

غزل کے دو یا دو سے زائد ایسے اشعار جن میں کوئی مضمون یا خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو 'قطعہ' کہا جاتا تھا۔ غزل گو شاعر اگر اپنے خیال کو ایک شعر میں مکمل نہیں کر پاتا تھا تو ایک سے زیادہ اشعار میں خیال ادا کر کے اسے قطعہ بند کر دیتا تھا، اور اس کے لیے ''ق'' کی علامت لگا دی جاتی تھی۔ لیکن جدید شاعری میں دو اشعار یا چار مصرعوں کے قطع کو ایک علیحدہ صنف

نوٹ

کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ قطعہ میں دو سے زیادہ اشعار بھی ہو سکتے ہیں۔ قطعہ سے ہماری مراد وہ صنف سخن ہے، جس میں شاعر دو یا دو سے زیادہ اشعار کو خیال اور مضمون کے اعتبار سے تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ قطعہ اور غزل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قطعہ کے تمام اشعار معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں، جب کہ غزل کے ہر شعر کی ایک آزاد اور جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔

قطعہ کی اہمیت

رباعی کی طرح قطعہ بھی دو اشعار یا چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ رباعی میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے، جب کہ قطعے میں دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی عام طور سے قطعے میں مطلع نہیں ہوتا۔ رباعی کی ایک بحر مخصوص ہے جب کہ قطعہ کسی بھی بحر میں کہا جا سکتا ہے۔

اختر انصاری نے اپنے قطعات کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ معنی اور مضمون کے اعتبار سے ان کے قطعات اعلا درجے کے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

''ہم قطعہ کے ذریعے ایک مختصر نظم کو سمیٹ کر چھوٹا بنا دیتے ہیں۔''

قطعہ گو شاعر چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال کو پوری شدت اور تاثیر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی بھی اپنے قطعات کے لیے مشہور ہیں۔ دور حاضر میں شعرا، نئے نئے مضامین کو قطعات میں پیش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وسیم بریلوی کا ایک مشہور قطعہ ہے ؎

ٹوٹی ہوئی قبروں پر بال بکھرائے
جب کوئی ماہ جبیں روتی ہے
میں یہ اکثر خیال کرتا ہوں
موت کتنی حسین ہوتی ہے

آپ نے کیا سیکھا

- اردو کے شعری ادب کو نظم اور غزل کے دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
- اردو میں غزل کے علاوہ جتنی بھی دوسری اصناف شاعری ہیں مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور قطعہ وغیرہ سب نظم ہی میں داخل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی چند خصوصیات کی بنا پر ان کے یہ نام متعین ہو گئے ہیں۔

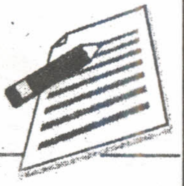

نوٹ

- قصیدے کی ابتدا، عرب سے ہوئی۔ عربی شاعری سے یہ صنف فارسی شاعری میں داخل ہوئی اور اردو میں یہ فن، فارسی شاعری سے لایا گیا۔
- مضمون آفرینی، جوشِ بیانی، شکوہِ الفاظ، روانی اور جدت قصیدہ کی خصوصیات ہیں۔
- قصیدے کے دو بڑے شاعر محمد رفیع سوداؔ اور محمد ابراہیم ذوقؔ ہیں۔
- مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسینؓ اور دیگر شہدائے کربلا کا ذکر کیا جائے اور ان کی شہادت پر بین اور ماتم کا بیان کیا جائے۔
- اس کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیہ کا نام دیا جاتا ہے۔
- مرثیے کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں۔

  چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بَین۔
- مرثیے کے فن کو میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرتبۂ کمال تک پہنچایا۔
- مرثیے کا خاص مقصد رونا، رُلانا اور رونے کی ترغیب دینا ہے۔
- مثنوی میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو نثری داستانوں میں ملتی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ اور مولانا محمد حسین آزادؔ کے زمانے میں مثنوی کے موضوعات میں بہت وسعت آ گئی۔
- کسی زمانے کے سیاسی، سماجی، حالات، رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے اور لباس و زیورات اور تیج تہوار وغیرہ کی تفصیلات جاننے کے لیے مثنوی کے مطالعے کی بڑی اہمیت ہے۔
- اردو کی دو مشہور مثنویوں کے نام ''سحرالبیان'' اور ''گلزارِ نسیم'' ہیں۔
- مثنوی کے دو مشہور شعرا میر حسنؔ اور دیا شنکر نسیمؔ ہیں۔
- رباعی چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔
- رباعی کے مشہور شعرا، مولانا الطاف حسین حالیؔ، جگت موہن لال رواںؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری ہیں۔
- امجدؔ حیدر آبادی اردو کے واحد شاعر ہیں جن کی تمام تر شہرت رباعی گوئی کی بدولت ہے۔
- رباعی کی طرح قطعہ بھی دو اشعار یا چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ رباعی میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے، جب کہ قطعے میں دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔
- قطعہ گو شاعر چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال کو پوری شدت اور تاثیر کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
- اختر انصاری نے اپنے قطعات کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔

نوٹ

23.9 اختتامی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی میں لکھیے۔

1. اردو کے شعری ادب میں نظم اور غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن کیا ہیں؟ ان کے نام لکھیے۔
2. قصیدے کے انداز بیان کی خصوصیات لکھیے اور دو مشہور قصیدہ گو شعراء کے نام لکھیے۔
3. مرثیہ کسے کہتے ہیں؟ دو مشہور مرثیہ نگاروں کے نام لکھیے۔
4. مرثیے کے اجزائے ترکیبی لکھیے۔
5. مثنوی کی خصوصیات کیا ہیں؟ مثنوی پڑھنے کے کیا فائدے ہیں؟
6. اردو کی دو مشہور مثنویوں اور ان کے
9. چار مشہور رباعی گو شعراء کے نام لکھیے۔
10. دو مشہور قطعہ گو شعراء کے نام لکھیے۔

نوٹ

24

سودا

شاعر کا تعارف

مرزا محمد رفیع سودا 1713ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء واجداد کابل سے تجارت کی غرض سے آئے تھے اور ہندوستان میں بس گئے تھے۔ سودا کے والد مرزا محمد شفیع سوداگر تھے۔ سودا نے قدیم رسم ورواج کے مطابق عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ روزگار کی تلاش میں انہوں نے فوج میں نوکری کرلی اور سپاہی ہوگئے۔ مگر جلد ہی ملازمت سے الگ ہوگئے۔ سودا بچپن ہی سے ذہین اور موزوں طبع تھے۔ کچھ عرصہ شاہ حاتم کے شاگرد رہے۔ اپنی ذہانت کی وجہ بہت جلد نام پیدا کیا۔ دہلی کے بادشاہ شاہ عالم آفتاب بھی سودا سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ سودا کی شہرت سُن کر نواب شجاع الدولہ نے انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس وقت تو جانے سے انکار کردیا لیکن جب حالات ناسازگار ہوئے تو لکھنؤ تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور بدلے میں انعام واکرام اور خوب داد وتحسین پائی۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے آصف الدولہ نے ان کی خاطر خواہ عزت افزائی کی اور وہیں ستر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

سودا بڑے باکمال اور قادرالکلام شاعر تھے۔ انہوں نے غزلوں میں طبع آزمائی کی اور ایک مخصوص انداز اختیار کیا جس میں درد مندی کی جگہ شوخی، سوز وگداز کی جگہ نشاط نمایاں ہے۔ سودا نے مرثیہ نگاری بھی کی اور مسدس کی شکل میں مرثیوں کی باقاعدگی عطا کی۔

سودا مزاجاً قصیدے کے شاعر ہیں۔ ان کے مزاج میں شوخی، دراکی اور جوش وولولہ تھا۔ اس لیے وہ قصائد میں بہت کامیاب ہوئے۔ ان کا مرتبہ قصیدہ گوئی میں سب سے بلند ہے۔ ان کے قصائد شوکتِ الفاظ، تازگی مضامین اور بلند خیالی کی وجہ سے فصاحت وبلاغت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

آج جو قصیدہ آپ پڑھنے جارہے ہیں وہ انہوں نے نواب غازی الد ں کی شان میں لکھا تھا۔ یہ قصیدہ تو کافی لمبا ہے۔ اس کا کچھ حصہ آپ پڑھیں گے۔

نوٹ

مقاصد

اس قصیدہ کو پڑھنے کے بعد آپ:

- اس قصیدہ کو سمجھ کر اس کا مطلب بیان کر سکیں گے؛
- اشعار کی تشریح و تحسین کر سکیں گے؛
- مختلف صنعتوں سے واقف ہو کر ان کی تعریف بیان کر سکیں گے؛
- سوداؔ کی قصیدہ نگاری پر اظہارِ خیال کر سکیں گے۔

24.1 اصل سبق

آیئے ایک بار پورا قصیدہ پڑھ لیتے ہیں۔

فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک
دی وہیں آکے خوشی نے درِ دل پر دستک
پوچھا میں، کون ہے؟ بولی کہ میں ہوں غافل
نہ لگے شوق میں جس کے، کبھو شائق کی پلک

سن کے یہ مژدۂ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ
اشعۂ نور کی سی، مجھ کو نظر آئی جھلک
آنکھیں مل کرکے جو دیکھوں ہوں تو اک بادلہ پوش
سر سے لے، غرق جواہر میں وہ ہے پانو تلک

چہرے پہ ایسی ہے گرمی کہ شب و روز جسے
باؤ کرتی ہی رہے دامن مژگاں کی جھپک
زلفیں یوں بکھری ہوئی چہرے پہ مانگیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہٹیں دو بالک
کرکے دریافت یہ مجھ سے، کہا اس نے کہ مگر
سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک

در: دروازہ
دستک: دروازہ پر ہاتھ مارنا تاکہ آواز نکلے کھٹکھٹانا
غافل: بے خبر
شوق: خواہش، رغبت
شائق: آرزومند
مژدہ: خوش خبری
جاں بخش: تازگی دینے والا
اشعہ: روشنی کی لپک
نور: روشنی
بادلہ: سونے چاندی کے تار سے بنا ہوا لباس
پوش: پہنے ہوئے
غرق: ڈوبا ہوا
جواہر: جوہر کی جمع قیمتی پتھر
باؤ: ہوا
دامن: آنچل
مژگاں: مژہ کی جمع، پلک
بالک: بچہ

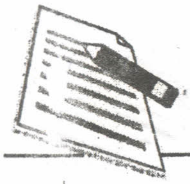

نوٹ

سمع: کان سننے کی طاقت
شادی: خوشی
ملک: فرشتہ
عہد: زمانہ، دور
غیور: غیرت مند
کوچک: چھوٹا، کوتاہ
سحاب: بادل
نیساں: بیساکھ کا موسم
برق: بجلی
متبسم: مسکرانے والا
چشمک: آنکھ کا اشارہ
حلم: بردباری
ہم وزن: برابر وزن کا
فلک: آسمان
سہو: بھول
خطا: غلطی
گاوِ زمین: وہ بیل جس کی سینگ پر زمین ٹکی ہوئی بتائی جاتی ہے
مرداں: مرد کی جمع، بہادر جوان
مردک: کم ہمت
باب: دروازہ
اجابت: قبولیت
بابِ اجابت: قبولیت کا دروازہ
منور: روشن
تاابد: ہمیشہ

آج اس شخص کی ہے سالگرہ کی شادی
کہ بہ صورت ہے وہ انسان، بہ سیرت ہے ملک
یعنی نواب سلیماں فرد نام آصف جاہ
عہد میں جس کے، یہ غیور، بزرگ و کوچک

ہو گہر بار تجھ آگے، جو سحاب نیساں
برق ہوکر متبسم اسے مارے چشمک
حلم تیرے کے، جو ہم وزن فلک سے کچھ شئے
ڈال دیوے ز رہِ سہو وخطا کوئی ملک

صدمہ ایسا کمر گاوِ زمیں کو پہنچے
شاخیں ہر چند وہ کھنچوائے تو نکلے نہ کسک
تجھ کو للکار کے میداں میں صف مرداں کی
سامنے آئے ترے، کون ہے ایسا مردک

ختم کر اب تو دعائیہ پہ سوداؔ یہ کلام
آ میں کرنے کو گئے بابِ اجابت پہ ملک
یا الٰہی جو یہ تیرا ہے چراغِ دولت
تاابد اس سے منور رہے قندیل فلک

24.2 متن کی تشریح

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک
دی وہیں آکے خوشی نے درِ دل پر دستک
پوچھا میں، کون ہے؟ بولی کہ میں ہوں غافل
نہ لگے شوق میں جس کے، کبھو شائق کی پلک

یہ اشعار تشبیب (تمہید) کے ہیں۔ شاعر نے نہایت خوبصورت اور نیا انداز اختیار کیا ہے۔ قصیدے کی شروعات وہ اس طرح

نوٹ

کرتا ہے کہ فجر کے وقت جب وہ ہلکی نیند میں تھا تو اس نے کسی کو اپنے بہت قریب محسوس کیا۔ اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے ہی پوچھا۔ تم کون! اس نے جواب دیا "بڑی حیرت کی بات ہے کہ تم مجھے نہیں پہچانتے۔ میں وہ چیز ہوں جس کی طلب لوگوں کو بے چین رکھتی ہے۔ میری چاہت کسی کو سونے نہیں دیتی۔ میری خواہش ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے۔ میرا نام خوشی ہے۔"

24.3 زبان کے بارے میں

آنکھ جھپکنا محاورہ ہے۔ اس کے معنی "نیند آنا" ہے۔ ہلکی نیند میں جب کوئی شخص ہو، نہ تو پوری طرح سو رہا ہو اور نہ پوری طرح جاگ رہا ہو۔ اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے "آنکھ جھپکنا" استعمال کرتے ہیں۔

شاعر نے دوسرے شعر میں شوق اور شائق کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دونوں کا اصل ایک ہے۔ (ش و ق) جب کلام میں اس طرح کے الفاظ لائے جائیں جن کا اصل ایک ہو تو اسے صنعتِ اشتقاق کہتے ہیں۔

24.4 متن کی تشریح

سُن کے یہ مژدۂ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ
اشعۂ نور کی سی مجھ کو نظر آئی جھلک
آنکھیں مل کر کے جو دیکھوں ہوں تو ایک بادلہ پوش
سر سے لے غرق جواہر میں وہ ہے پانو تلک

یہ اشعار بھی تشبیب کے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں نے یہ خوشخبری سنی کہ خوشی میرے پاس خود چل کر آئی ہے تو میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ مجھے روشنی کی ایک لپک نظر آئی۔ میں نے آنکھیں مل کر کے غور سے اس لپک کو دیکھا تو خوشی کو انسان کے روپ میں پایا۔ وہ سونے اور چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور سر سے پاؤں تک ہیرے، موتیوں اور جواہرات سے سجی ہوئی تھی۔ چونکہ شاعر نے خوشی کو انسانی روپ دیا ہے چنانچہ اسی مناسبت سے اس کے جسم، پہناوے اور زیورات کا ذکر کیا ہے۔

24.5 زبان کے بارے میں

شاعر نے پہلے مصرعہ میں "میں آنکھ کھولی" استعمال کیا ہے حالانکہ قواعد کی رو سے "میں نے آنکھ کھولی" ہونا چاہیے۔ ایسا شاعر نے ایک تو ضرورتِ شعری کی بنا پر کیا ہے، دوسرے یہ کہ اس زمانے میں اس طرح کی زبان استعمال کی جاتی تھی۔

24.6 متن کی تشریح

چہرے پہ ایسی ہے گرمی، کہ شب و روز جسے
باؤ کرتی ہی رہے دامن مژگاں کی جھپک
زلفیں یوں بکھری ہوئی چہرے پہ مانگیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہٹیں دو بالک

یہ اشعار بھی تشبیب کے سلسلے ہیں۔ شاعر خوشی کا سراپا یوں بیان کر رہا ہے کہ اس کا چہرہ تمتما رہا ہے اور پلکیں اس کی تمتماہٹ کو کم کرنے کے لیے پنکھا جھلتی رہتی ہیں۔ اس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں اس طرح بکھری ہوئی ہیں کہ بے اختیار دل اس کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس سے اس کی خوبصورتی بہت بڑھ گئی ہے اور ہر دل اسے پانے کے لیے مچل رہا ہے۔ جس طرح دو بچے ایک ہی کھلونے کے لیے ضد کرتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں کہ اسے لے کر ہی رہیں گے، اس کے چہرے کے دونوں طرف زلفیں اس طرح چمٹی ہوئی تھیں جیسے ایک کھلونے کو پانے کے لیے دو لڑکے ضد کرتے ہیں۔

24.7 زبان کے بارے میں

شاعر نے پلکوں کے جھپکنے کو پنکھا جھلنے سے تشبیہ دے کر ایک خوبصورت انداز بیان اختیار کیا ہے۔
بالک ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ''بچے'' کے ہیں۔ بال ہٹ کا استعمال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ بچوں کی ضد کافی مشہور ہے۔ جب وہ کسی چیز کے لیے اڑ جاتے ہیں تو اسے لے کر رہتے ہیں۔

متن پر سوالات 24.1

1. شاعر کے دل کے دروازے کو کس نے کھٹکھٹایا؟
   (الف) شوق
   (ب) خوشی
   (ج) دوست
2. صنعت اشتقاق کسے کہتے ہیں؟
   (الف) جب کلام میں ایک ہی اصل کے بہت سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔
   (ب) جب کلام میں ایک ہی اصل کا صرف ایک لفظ استعمال کیا جائے۔
   (ج) جب کلام میں مختلف قسم کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

نوٹ

3. خوشی شاعر کے پاس کس لباس میں آئی؟

(الف) سونے چاندنی کے تاروں سے بنے لباس میں۔

(ب) چاند ستاروں سے مزین لباس میں۔

(ج) لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے لباس میں۔

4. ''بالک'' کس زبان کا لفظ ہے؟

(الف) انگریزی

(ب) ہندی

(ج) فارسی

24.8 متن کی تشریح

کر کے دریافت یہ مجھ سے کہا اس نے کہ مگر
سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک
آج اس شخص کی ہے سال گرہ کی شادی
کہ بہ صورت ہے وہ انسان بہ سیرت ہے ملک
یعنی نواب سلیمان فرد نام آصف جاہ
عہد میں جس کے، یہ غیور بزرگ و کوچک

یہ اشعار گریز کے ہیں۔ یعنی وہ اشعار جن کے ذریعے شاعر قصیدہ میں تشبیب سے اصل مدعا کی طرف آتا ہے اور اپنے ممدوح کی تعریف کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ خوشی نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ خوش خبری ابھی تک تجھ کو نہیں ملی کہ آج ایک عظیم شخص کی سالگرہ ہے۔ وہ شخص صورت سے انسان ہے اور سیرت میں فرشتہ صفت ہے۔ وہ بہت نیک دل اور شریف انسان ہے۔ ان کا نام نواب سلیمان آصف جاہ ہے۔ ان کی خوبیوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ بہت سخی اور فراخ دل ہے۔ اس نے اپنی رعایا کو مالا مال کر دیا یہ اس لیے اس کے عہد میں کسی کو ہاتھ پھیلانے اور سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ سبھی غیرت مند ہو گئے۔

نوٹ

24.9 زبان کے بارے میں

دوسرے شعر میں شاعر نے اپنے ممدوح کو سیرت میں ملک یعنی فرشتہ قرار دیا ہے۔ یہ مبالغہ ہے۔ مبالغہ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کو کہتے ہیں۔

متن پر سوالات 24.2

1. شاعر کس بات سے بے خبر ہے؟
   - (الف) شادی کی سالگرہ
   - (ب) شاعری کی سالگرہ
   - (ج) ممدوح کی سالگرہ
2. مبالغہ کسے کہتے ہیں؟
   - (الف) کسی بات کو گھٹا کر بیان کرنا
   - (ب) کسی بات کو بڑھا کر بیان کرنا
   - (ج) کسی بات کی تشریح کرنا

24.10 متن کی تشریح

ہو گہر بار تجھ آگے جو سحابِ نیساں
برق ہوکر متبسم اسے مارے چشمک

اب شاعر اصل موضوع کی طرف آتا ہے اور اپنے ممدوح کی تعریف شروع کرتا ہے۔ یہ قصیدہ کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے میرا ممدوح بہت سخی اور فیاض ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو بجلی کڑک کر اس کا مذاق اُڑاتی ہے اور چمک کر کہتی ہے کہ تو بھلا میرے محبوب کا کیا مقابلہ کرے گی وہ تو دریا دل ہے۔ مبالغہ سے کام لیتے ہوئے شاعر نے ممدوح کی سخاوت کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بارش بھی اتنی تیزی سے نہیں برستی جتنی تیزی سے وہ دولت بانٹتا ہے۔ سحاب نیساں کی مناسبت سے شاعر نے گہر بار کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کیونکہ عام روایت ہے کہ نیساں کا ایک قطرہ جب سیپ کے اندر گرتا ہے تو وہ موتی بن جاتا ہے۔

نوٹ

24.11 زبان کے بارے میں

بارش ہونے پر بجلی کا چمکنا ایک عام بات ہے۔ لیکن شاعر اس کی وجہ یہ بیان کر رہا ہے کہ بجلی کڑک کر بارش کا مذاق اڑا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ تو جتنا بھی برس لے ہمارے ممدوح کی عنایتوں کی بارش کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسے اصطلاح میں حسنِ تعلیل کہتے ہیں۔

24.12 متن کی تشریح

حلم تیرے کے جو ہم وزن فلک سے کچھ شے
ڈال دیوے زرہِ سہو و خطا کوئی ملک
صدمہ ایسا کمر گاوِزمیں کو پہنچے
شاخیں ہر چند وہ کھنچوائے تو نکلے نہ کسک

ان اشعار میں شاعر اپنے ممدوح کی بُردباری کی تعریف کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ نہایت سنجیدہ اور باوقار شخص ہے۔ ایک عام روایت بیان کی جاتی ہے کہ کسی گائے کی سینگ پر یہ زمین ٹکی ہوئی ہے۔ اگر ممدوح کی بردباری کے ہم وزن کوئی چیز آسمان سے زمین پر گرائی جائے تو اس گائے کی کمر بوجھل ہو جائے۔ وہ اسے سیدھی کرانے کی لاکھ کوشش کرے مگر وہ سیدھی نہ ہو پائے اور اس کی تکلیف میں کوئی کمی نہ ہو۔

24.13 زبان کے بارے میں

''زرہِ سہو و خطا'' میں زرہ مخفف ہے۔ دراصل یہ ازراہِ تھا، مگر ضرورت شعری کی بنا پر ''زرہِ'' کرلیا گیا۔ دردِ کمر سے نجات پانے کے لیے عام طور پر مالش کرواتے ہیں۔ اس سے رگیں کھنچتی ہیں۔ اسے شاخیں کھنچوانا کہتے ہیں۔

24.14 متن کی تشریح

تجھ کو للکار کے میداں میں صفِ مرداں کی
سامنے آئے ترے کون ہے ایسا مردک

اس شعر میں شاعر اپنے ممدوح کی بہادری کی تعریف کرتا ہے۔ وہ بہت بہادر، جوانمرد اور نڈر ہے۔ جب وہ میدانِ جنگ میں آگے نکلتا ہے تو سب خوف کے مارے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ کسی مرد کی مجال نہیں کہ وہ مقابلہ کے لیے سامنے آئے۔ وہ مقابلہ سے پہلے ہی ڈر جاتے ہیں۔

نوٹ

24.15 زبان کے بارے میں

''مردک'' اسم تصغیر ہے جو 'مرد' میں 'ک' لگا کر بنایا گیا ہے۔

کبھی کبھی حقارت یا کم تر کے معنی پیدا کرنے کے لیے الفاظ میں چند حروف کا اضافہ کرتے ہیں۔ کسی لفظ میں ''چہ'' لگا کہ یہ اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے

کتاب سے کتابچہ

باغ سے باغیچہ

متن پر سوالات 24.3

1. ''گاؤ زمین'' سے کیا مراد ہے؟
   (الف) وہ گائے جو دودھ دیتی ہے
   (ب) گاؤ تکیہ جس سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہیں
   (ج) وہ گائے جس کی سینگ پر زمین ٹکی ہوئی ہے

2. ''مردک'' کیا ہے؟
   (الف) اسم تصغیر
   (ب) اسم تفصیل
   (ج) اسم مبالغہ

3. شاعر نے ممدوح کی کن خوبیوں کی تعریف کی ہے؟
   (الف) سخاوت، شرافت اور حیا
   (ب) سخاوت، حلم اور بہادری
   (ج) شرافت، علم اور بہادری

4. جب ممدوح میدان جنگ میں آگے نکلتا ہے تو اسکے مقابلے کے لیے کون آتا ہے؟
   (الف) بہادر لوگ
   (ب) بڑے بڑے لوگ
   (ج) کوئی نہیں

24.16 متن کی تشریح

ختم کر اب تو دعائیہ پہ سودا یہ کلام
آمیں کرنے کو گئے باب اجابت پہ ملک
یا الٰہی جو یہ تیرا ہے چراغِ دولت
تا ابد اس سے منور رہے قندیل فلک

یہ قصیدہ کا آخری حصہ ہے۔ اس میں شاعر دعائیہ کلمات پر اپنی بات ختم کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے اپنے ممدوح کے لیے جو دعائیں مانگی ہیں اس پر آمین کہنے کے لیے فرشتے قبولیت کے دروازے پر گئے ہیں۔ چونکہ شاعر خود وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے فرشتے اس کی دعاؤں کو خدا کے حضور قبولیت کے لیے لے گئے ہیں تا کہ شاعر کا ممدوح ہمیشہ خوش وخرم رہے اور لوگوں کو مالا مال کرتا رہے۔ اس کی عزت و دولت قائم رہے۔

24.17 زبان کے بارے میں

''باب'' کے معنی ہیں دروازہ اور اجابت کے معنی قبولیت۔ ''باب اجابت'' قبولیت کے دروازے کو کہتے ہیں جہاں سے کوئی دعا ناکام واپس نہیں آتی بلکہ خدا اسے قبول کر لیتا ہے۔

متن پر سوالات 24.4

1. یہ اشعار قصیدہ کا کون سا حصہ ہے؟
   (الف) تشبیب
   (ب) مدح
   (ج) مقطع
2. باب اجابت پہ آمین کہنے کے لیے کون گیا ہے؟
   (الف) فرشتے
   (ب) شاعر
   (ج) سبھی لوگ

نوٹ

24.18 انداز بیان

سوداؔ اردو قصیدہ نگاری میں اپنی انفرادیت کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے قصائد میں شکوہِ الفاظ، متانت اور جوش بیان پوری طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔ انہوں نے قصائد کو اپنے حسن بیان سے نہایت شگفتہ اور سلیس بنا دیا ہے۔ فارسی تراکیب کے ساتھ ساتھ نرم اور سبک ہندی الفاظ کا استعمال ان کے قصیدوں میں ایک عجیب لطیف پیدا کر دیتا ہے۔ ان کا انداز بیان دلچسپ، منفرد اور متاثر کن ہے۔

آپ نے کیا سیکھا

- سوداؔ نے اپنی قصیدہ نگاری میں پُر شکوہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔
- جب شعر میں ایک اصل کے کئی الفاظ لائے جائیں تو اسے صنعت اشتقاق کہتے ہیں۔
- کسی بات کو بڑھ چڑھا کر بیان کرنے کو مبالغہ کہتے ہیں۔
- کسی عمل کے واقع ہونے کی وجہ کچھ اور ہو لیکن شاعر اس کے لیے کوئی اور سبب بیان کرے تو اُسے حسن تعلیل کہتے ہیں۔
- کبھی کبھی حقارت یا چھوٹا پن کے معنی پیدا کرنے کے لیے الفاظ میں چند حروف کا اضافہ کرتے ہیں۔ اسے اسم تصغیر کہتے ہیں۔

24.20 مزید مطالعہ

سوداؔ کا ایک مشہور قصیدہ شہر آشوب ہے۔ اس میں انہوں نے دلّی شہر کی زبوں حالی کی سچی اور دلچسپ تصویر پیش کی ہے۔ اسے ضرور پڑھیے۔

24.23 اختتامی سوالات

1. قصیدے کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔
2. حسنِ تعلیل کسے کہتے ہیں؟
3. کس شعر کے ذریعہ شاعر نے ممدوح کی سخاوت کی تعریف کی ہے؟ اسے کاپی پر لکھئے۔
4. سوداؔ کے انداز بیان پر روشنی ڈالیے۔
5. اس شعر کی تشریح کیجیے۔

تجھ کو للکار کے میداں میں صفِ مرداں کی
سامنے آئے ترے کون ہے ایسا مردک

متن پر سوالات کے جوابات

24.1 (1) ب (2) الف (3) الف (4) ب

24.2 (1) ب (2) ب

24.3 (1) ج (2) الف (3) ب (4) ج

24.4 (1) ج (2) الف

نوٹ

25

مرزا سلامت علی دبیرؔ

شاعر کا تعارف

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ اپنے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور مستقل طور پر رہنے لگے۔ محنت اور شوق کی بدولت اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق فطری اور مرثیہ گوئی سے بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد ہوئے اور ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے نام کمایا۔ دبیرؔ اودھ کے دربار سے وابستہ تھے۔ مرزا دبیرؔ کی شہرت کے زمانے میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے اور ان دونوں مرثیہ گویوں میں مقابلے ہونے لگے۔ میر انیسؔ کی طرف کے لوگ ''انیسیے'' اور مرزا دبیرؔ کے لوگ ''دبیریے'' کہلاتے تھے۔ یہ مقابلے تہذیب اور متانت کی حدود میں ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے تھے۔

مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ انہوں نے رباعیات، سلام اور نوحے بھی لکھے ہیں۔ محرم ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور اپنے گھر میں ہی دفن ہوئے۔

مقاصد

یہ سبق پڑھ کر آپ:

- مرثیے میں پیش کیے گئے جذبات کو اپنے الفاظ میں بیان کرسکیں گے؛
- اس مرثیے کے اشعار کی تشریح و تحسین کرسکیں گے؛
- مسدس کی تعریف بیان کرسکیں گے؛
- نئے الفاظ اور رعائت لفظی کی شناخت کرلیں گے۔

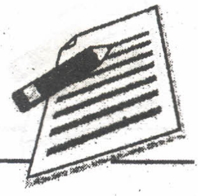
نوٹ

25.1 اصل سبق

آیئے اب مرثیے کو ایک بار پڑھ لیں۔

حضرت امام حسین کا حضرت علی اصغر کے لیے پانی مانگنا

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰ
لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو، نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گو میں بقول عمر و شمر، ہوں گناہ گار
یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
شش ماہہ، بے زبان، نبی زادہ، شیر خوار
ہفتم سے سب کے ساتھ پیاسا ہے بے قرار

سبط: پوتا، نواسا
سبط مصطفیٰ: حضرت محمدؐ کے نواسے یعنی حضرت حسینؓ
عدو: دشمن
آبرو: عزت
سوال کرنا: مانگنا
رنگ فق ہونا: رنگ اڑ جانا
پسر: بیٹا
عمر: عمر ابن سعد، یزیدی فوج کا سپہ سالار
شمر: حضرت حسین کا قاتل
شش ماہہ: چھ مہینے کا

سِن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زباں ہے تمہیں کچھ خیال ہے
دُرِ نجف ہے بانوے بے کس کا لال ہے
لو مان لو تمہیں قسم ذوالجلال ہے
یثرب کے شاہ زادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علی کا تم سے طلب گارِ آب ہے
دے دو کہ اس میں ناموری بے حساب ہے
پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زبان لبوں پہ جو اس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

25.2 متن کی تشریح

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰ
لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو، نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

نوٹ

سن: عمر
مظلوم: جس پر ظلم کیا گیا ہو
مظلوم زادہ: مظلوم کا بیٹا
درِ نجف: ایک سفید پتھر جو نجف میں پایا جاتا ہے نجف عراق کے ایک شہر کا نام ہے جہاں حضرت علی کا مزار ہے۔ حضرت علی اصغر حضرت علی کے پوتے تھے، اس رعایت سے انہیں درِ نجف کہا گیا ہے۔
بانو: حضرت حسین کی زوجہ اور حضرت علی اصغر کی والدہ شہر بانو
ذوالجلال: صاحب جلال، دبدبے والا مراد خدائے تعالیٰ
ناموری: نیک نامی، شہرت
نورِعین: آنکھوں کی روشنی، مراد بیٹا

نوٹ

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال، پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرّا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں
گر میں بقول عمر وشمر، ہوں گناہ گار
یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
شش ماہہ، بے زبان، نبی زادہ شیر خوار
ہفتم سے سب کے ساتھ پیاسا ہے بے قرار
سِن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

ان تین بندوں میں شاعر نے حضرت امام حسین کی طبیعت کی خودداری اور عزت نفس کا بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب حضرت شہر بانو حضرت علی اصغر کو پیاس سے تڑپتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکیں، تو انہوں نے حضرت امام حسین سے کہا کہ آپ اسے یزید کی فوج کے پاس لے جائیے شاید انہیں معصوم پر ترس آجائے۔ حضرت امام حسین بھی بچے کی سوکھے ہونٹ دیکھ کر مجبور ہو گئے اور بچے کو گود میں لے کر دریا کی طرف چل پڑے حضرت امام حسین کی طبیعت میں اس قدر خودداری تھی کہ انہوں نے اپنی جائز ضرورت کے لئے بھی اپنی زندگی میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ مگر اس وقت بچے کی حالت دیکھ کر پانی مانگنے کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ اسی لئے غیرت کی وجہ سے ان کے قدم نہیں اٹھتے تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ وہاں جا کر کیا کہوں گا اور پانی کس طرح مانگوں گا۔

یہی سوچتے ہوئے وہ یزید کی فوج کے قریب پہنچ گئے مگر ان لوگوں کی طرف دیکھ کر گھبرا گئے، شرم کے مارے چہرے کا رنگ، اڑ گیا اور زبان بند ہو گئی۔ بچے کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر حضرت علی اصغر کا پیاس کی شدت کا نڈھال چہرہ ان لوگوں کے سامنے کر دیا اور بس اتنا ہی کہہ سکے کہ میں اپنے لئے کچھ مانگنے یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ یہ معصوم بچہ مجھے یہاں لے آیا ہے۔ اس کے بعد آنکھیں جھکا کے بولے کہ عمر بن سعد اور شمر کے کہنے کے مطابق تمہار گناہ گار تو میں ہوں۔ اس لئے مجھے جو چاہے سزا دے لو۔ مگر چھ مہینے اس کے دودھ پیتے بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ خدا کے لے اس کے اوپر رحم کرو اور اسے ایک گھونٹ

نوٹ

پانی پلادو کہ یہ اب پیاس کے مارے مرنے کے قریب ہے۔

24.3 زبان کے بارے میں

رنگ فق ہونا۔ سوال کرنا۔ تھرّا جانا۔ آنکھیں جھکانا۔ یہ سب محاورے ہیں۔

'فوج عمر' سے مراد یزید کی فوج ہے۔ عمر بن سعد یزید کی فوج کا سپہ سالار تھا اسی لئے اسے فوج عمر کہا ہے۔ دوسرے بند میں گھبرا کے، شرما کے، تھرا کے، آنکھیں جھکا کے، قافیے استعمال کر کے شاعر نے حضرت امام حسین کی خودداری اور غیرت کا بیان کیا ہے۔

تیسرے بند میں شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب کوئی غیرت مند انسان کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے تو اس کی آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔

مرثیے کا ہر بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔ پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور باقی دو مصرعوں میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہوتا ہے۔ ان مصرعوں کا قافیہ پہلے چار مصرعوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ایسی نظم کو مسدس کہتے ہیں۔

متن پر سوالات 25.1

درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے۔

1. سبطِ مصطفیٰ کسے کہا گیا ہے؟
   - (i) حضرت علی اصغر کو۔
   - (ii) حضرت علی اکبر کو۔
   - (iii) حضرت امام حسین کو۔
2. ''لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا''
   اس مصرعے سے حضرت امام حسین کی طبیعت کی کون سی خوبی کا پتہ چلتا ہے؟
   - (i) خودداری
   - (ii) احساس کمتری
   - (iii) سرکشی
3. ''آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں'' اس مصرعے میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
   - (i) حضرت حسین بہت غیرت مند تھے۔

(ii) امام حسین اپنے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔

(iii) امام حسین نے تعظیماً آنکھیں جھکا لی تھیں۔

نوٹ

25.4 متن کی تشریح

یہ کون بے زباں ہے، تمھیں کچھ خیال ہے
درِ نجف ہے، بانوئے بے کس کا لال ہے
لو مان لو، تمھیں قسمِ ذوالجلال ہے
یثرب کے شاہ زادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علی کا تم سے طلب گارِ آب ہے
دے دو کہ اس میں ناموری بے حساب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر

باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زبان لبوں پہ جو اس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

پچھلے تین بندوں میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ حضرت امام حسین نے چونکہ یزید کی فوج کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا، اس لئے ذرا دبے ہوئے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ مگر پھر حضرت کو جلال آ گیا اور آپ نے اونچی آواز میں کہا، تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ یہ معصوم، بے زبان اور پیاس کی شدت سے نڈھال بچہ کون ہے۔ یہ نجف کا موتی اور ایران کی شہزادی شہر بانو کا لال ہے۔ تمھیں خدا کی قسم ہے اس بے کس اور بے زبان کی فریاد سن لو کہ مدینے کا شہزادہ اور حیدر کرار کا پوتا تم سے پانی مانگ رہا ہے۔ اگر تم اس معصوم کو اس وقت پانی پلا دو گے تو تاریخ میں تمہارا نام نیکی اور احترام کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ تمھیں اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ تم لوگ یہی چاہتے تھے تاکہ ہمیں جھکنے پر مجبور کردو۔ لو تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوگئی۔ اب اس معصوم کے سوکھے ہونٹوں کو تر کردو۔

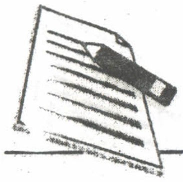

نوٹ

پھر حضرت امام حسین حضرت علی اصغر سے مخاطب ہوئے اور بولے۔ میرے بچے! تمہاری پیاس بجھانے کے لئے میں ان لوگوں کو جتنی خوشامد کر سکتا تھا وہ میں نے کر لی۔ اب میرے پاس کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اب تم بھی منہ کو کھول کر اپنی پیاس سے اکڑی ہوئی زبان انہیں دکھادو۔ شاید ظالموں کو ترس آجائے اور یہ تمہیں پانی پلادیں۔ جب حضرت علی اصغر نے بمشکل تمام اپنا منہ کھولا اور زبان باہر نکالی تو حضرت امام حسین سے بچے کی طرف دیکھا نہ گیا۔ بچے کی تکلیف کو دیکھ کر وہ کانپ اٹھے اور انہوں نے بے اختیار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر گویا خدا سے فریاد کی۔

25.5 زبان کے بارے میں

چوتھے بند میں شاعر نے رجز کا انداز اختیار کر لیا ہے اور حضرت علی اصغر کو عراق کا موتی، حضرت شہر بانو کا لال، یثرب کا شہزادہ اور علی کا پوتا کہہ کر حضرت علی اصغر کے مقام و مرتبے کو جتانے کی کوشش کی ہے۔

آخری بند میں شاعر نے حضرت امام حسین کی مجبوری و بے بسی دکھائی ہے۔ اسی لئے اس نے، جو کہنا تھا کہہ چکا' باقی رہی نہ بات کوئی' 'سوکھی زبان تم بھی دکھادو نکال کر' جیسے لفظ استعمال کئے ہیں۔ جن سے دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔

چوتھے اور پانچویں بند میں رعایتِ لفظی کا استعمال کیا گیا ہے۔

چوتھے بند میں حضرت علی اصغر کے لئے 'درنجف' بانوے بے کس کا لال' یثرب کا شہزادہ اور پانچویں بند میں 'پسر اور نورعین جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

جب کلام میں ایک لفظ کی رعایت سے دوسرے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں تضاد کا رشتہ نہیں ہوتا تو اسے صنعتِ رعایتِ لفظی کہتے ہیں۔ جیسے پسر اور نورعین ایک دوسرے کی رعایت سے استعمال کئے گئے ہیں۔

متن پر سوالات 25.2

درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے۔

1. جب ایک لفظ کی رعایت سے دوسرے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو اسے کہتے ہیں:

(i) استعارہ

(ii) حسن تعلیل

(iii) رعایتِ لفظی

2. 'سوکھی زبان تم بھی دکھادو نکال کر'

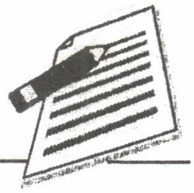

اس مصرعے میں حضرت حسین کی کیا حالت بیان کی گئی ہے؟

(i) بےبسی و مجبوری کی

(ii) گھمنڈ و غرور کی

(iii) بے نیازی کی

3. مرزا اسلام علی دبیؔر مرثیے کے مشہور شاعر ہیں اور میر انیسؔ کے ہم عصر ہیں۔

ایسی نظم جس کا ہر بند چھ مصرعوں سے مختلف ہو، مسدس کہلاتی ہے۔

رعایتِ لفظی اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں کوئی لفظ کسی دوسرے لفظ کی رعایت سے استعمال ہوتا ہے۔

25.6 مزید مطالعہ

دبیؔر کے اس مرثیے کو تلاش کر کے پورا پڑھیے۔

شبلی کی کتاب ''موازنہ انیس و دبیؔر پڑھیے۔

25.9 اختتامی سوالات

1. اس مرثیے میں حضرت علی اصغر کے لئے کیا الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔
2. یزید کی فوج کی طرف جاتے ہوئے حضرت امام حسین کے دل میں کیا خیالات آرہے تھے اور کیوں؟
3. آخری بند میں شاعر نے حضرت امام حسین کے کن جذبات کی ترجمانی کی ہے۔
4. اس مرثیے کو پڑھنے کے بعد آپ کے دل پر کیا اثر ہوتا ہے، چند جملوں میں بیان کیجئے۔
5. نظم کی کس قسم کو مسدس کہتے ہیں؟

متن پر سوالات کے جوابات

25.1 .1 (iii) .2 (i) .3 (ii)

25.2 .1 (iii) .2 (i) .3 (iii)

نوٹ

26

نواب مرزا شوقؔ

شاعر کا تعارف

نواب مرزا کا اصل نام تصدیق حسین خان اور شوقؔ تخلص تھا۔ مرزا شوق 1780ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت لکھنؤ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا اس وجہ سے مرزا شوق کو بھی شعر کہنے کا ذوق پیدا ہوا۔
مرزا شوقؔ خواجہ حیدر علی آتشؔ کے کے شاگرد تھے۔

مرزا شوقؔ کی سب سے پہلی مثنوی فریبِ عشق ہے، مثنوی، بہار عشق، اس کے بعد لکھی گئی اور آخر عمر میں انہوں نے مثنوی ''زہرِ عشق''، لکھی۔ ان کی آخری مثنوی بہت مشہور ہوئی۔ اس مثنوی میں دنیا کی بے ثباتی اور موت کی حقیقت پر بڑے پُر اثر اشعار ملتے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور مرزا شوق کا بیان بڑا آفرین ہے۔

اس مثنوی میں شاعر نے ایسے سماجی قصے نظم کئے ہیں جن کا تعلق پرانی کہانیوں سے نہیں بلکہ ان واقعات سے ہے جو ہماری زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔ اس مثنوی میں ایک سوداگر کی لڑکی کی اور ایک لڑکے کے عشق کی کہانی بیان کی گئی ہے مگر مثنوی کے اس حصے میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے شاید لکھنؤ کی سلطنت کے ختم ہونے کا اثر تھا جس سے متاثر ہو کر یہ اشعار قلم بند کئے گئے ہیں۔
1871ء کو 91 سال کی عمر میں مرزا شوقؔ کا انتقال ہو گیا۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

- مثنوی کے اشعار کی تشریح و تحسین کر سکیں گے؛

نوٹ

- پوری مثنوی کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گے؛
- مشکل الفاظ کے معنی سمجھ کر ان کا استعمال کر سکیں گے؛
- صنعتِ تلمیح اور صنعتِ مراعات النظیر کو سمجھا سکیں گے۔

26.1 اصل سبق

آیئے اب مثنوی کے اس حصے کو پڑھ کر دیکھیں:

جائے عبرت سرائے فانی
موردِ مرگ نوجوانی
اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانہ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حور و مہ جبیں نہ رہے
ہے مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم
ہوئے جاجا کے زیر خاک مقیم

جا: جگہ
سرائے: مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ
فانی: فنا ہوجانے والا/ختم ہوجانے والا
مورد: وہ جگہ جہاں سے کوئی گزرے
مرگ: موت
گور: قبر
خار: کانٹا
بوم: الّو
نوبت: نقارہ
نشان: جھنڈا
صاحب نوبت ونشاں: مراد وشوکت والا
مہ جبیں: مراد خوب صورت
مکین: رہنے والا
ہفتِ اقلیم: سات سلطنتیں کل کائنات، پوری دنیا کا بادشاہ

کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام
کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب اُن کا غرور

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردش چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی اُن کا نہیں نشانِ قبور

تاج میں جن کے تکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

نوٹ

بہرام: ایران کے بادشاہ کا نام
رُستم اور سام: ایران کے دو پہلوان

فرق: سر

خودسر: سرکش/مغرور

مٹی کا عطر: لکھنؤ کی خاص ایجاد ہے، نواب نصیرالدین حیدر نے عطر گل یعنی مٹی کا عطر ایجاد کروایا تھا
چرخ: آسمان
گردشِ چرخ: آسمان کی گردش
استخواں: ہڈیاں
قیصر: روم کا بادشاہ
فغفور: چین کا بادشاہ

کاسہ: پیالہ

منقلب: بدلتا ہوا

نوٹ

کوہ کن: پہاڑ کاٹنے والا مرد: فرہاد
نل دمن: سنسکرت کہانی ایک کے اہم کردار
لیلی: لیلیٰ
طائر: پرندے
خوش الحان: سریلی آواز
کل من علیہا فان: ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ سب کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے
رستگاری: نجات، چھٹکارا

ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے اُلفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں ''کل من علیہا فان''
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

26.2 متن کی تشریح

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تن گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرتِ حور ومہ جبیں نہ رہے
ہے مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جاجا کے زیرِ خاک مُقیم

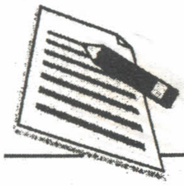

نوٹ

ان اشعار میں شاعر نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے جیسی ہے جہاں مسافر رات بھر کے لیے ٹھہرتے ہیں اور صبح ہوتے ہی اپنی منزل کی طرف چل پڑتے ہیں، اسی طرح انسانوں کے لیے اس دنیا کی حیثیت بھی ایک سرائے جیسی ہے۔ جس طرح سرائے میں مسافر ہمیشہ ٹھہرنے کے لیے نہیں آتے بلکہ تھوڑا سا وقت گزار کر آگے چل دیتے ہیں، اسی طرح انسان بھی اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ اسے کچھ وقت گزار کر اپنی زندگی پوری کر کے دنیا کو چھوڑ دینا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ صرف انسانوں کو ہی نہیں بلکہ یہ دنیا بھی اور جو کچھ اس میں ہے، یہ سب ایک نہ ایک دن فنا ہو جانے والا ہے اس لیے ہمیں اس فانی دنیا سے دل نہیں لگانا چاہیے۔

شاعر آگے کہتا ہے کہ ایسے ایسے مشہور لوگ جو عالی شان مکانوں میں رہتے تھے اور جہاں خوب صورت پھول کھلتے تھے۔ آج نہ وہ لوگ باقی ہیں نہ ان کے عالی شان مکانوں کا پتہ ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگر کچھ مشہور بادشاہوں کے محلوں کے آثار باقی بھی ہیں تو ان میں رہنے والے ختم ہو چکے ہیں۔ ان سب باتوں سے شاعر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس دنیا میں بادشاہ ہو یا فقیر ہو، مشہور ہو یا گم نام ہو، انجام سب کا ایک ہی ہے یعنی سب کو فنا ہونا ہے اور بڑے بڑے محلوں اور مکانوں کو چھوڑ کر تنگ و تاریک قبروں میں چلا جانا ہے۔

26.3 زبان کے بارے میں

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ ناگہانی ہے

ان اشعار میں شاعر نے نصیحت کی ہے کہ ہمیں اس دنیا کی چمک دمک اور اس کی رنگینی دیکھ اس میں گم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس سے سبق لینا چاہیے کیوں کہ یہ دنیا وہ جگہ ہے جہاں ہر وقت موت کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ شاعر نے مشہور لوگوں، بڑی بڑی عمارتوں، خوب صورت باغوں اور بڑے بڑے بادشاہوں کے ختم ہو جانے کی مثالیں دے کر اپنی بات میں وزن پیدا کیا ہے۔ اس حصے میں شاعر نے تقریباً ہر شعر میں صنعتِ تضاد کا خوب صورت استعمال کیا ہے مثلاً اونچے اونچے مکان، تنگ گور، شگوفہ و گل اور خار، بُلبل اور بوم وغیرہ۔

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

ایک محاورہ ہے، اُلو بولنا۔ اس کے معنی ہیں کسی جگہ کا اُجاڑ اور ویران ہو جانا۔ شاعر نے اس محاورہ کو آشیانۂ بوم کہہ کر استعمال کیا ہے۔

متن پر سوالات 26.1

درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

1. یہ دنیا کیسی جگہ ہے؟
   - (i) ہمارے لیے سبق سیکھنے کی جگہ
   - (ii) اُجاڑ اور ویران جگہ
   - (iii) ہمیشہ رہنے کی جگہ

2. شاعر نے کون سے شعر میں نصیحت کی ہے؟
   - (i) جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانہ بوم
   - (ii) جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم — ہوئے جاجا کے زیرِ خاک مقیم
   - (iii) جائے عبرت سرائے فانی ہے — موردِ مرگِ ناگہانی ہے
   - (iv) اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

متن کی تشریح 26.4

کوئی لیتا نہیں اب ان کا نام
کون سے گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خود سر جہاں میں مشہور
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

نوٹ

تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی ان کا نہیں نشانِ قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے ان کو آسماں و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ان اشعار میں دنیا کے چند مشہور لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو یا تو دنیا کے مشہور پہلوان تھے یا دنیا کے مشہور بادشاہ تھے۔اور دنیا میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا لیکن موت کے ہاتھوں سے کوئی نہ بچ سکا مثلاً ایران کے مشہور بادشاہ بہرام اور وہاں کے دو مشہور پہلوانوں رستم اور سام تو مٹی میں مل گئے ،لوگ آج صرف ان کا نام جانتے ہیں۔اسی طرح چین اور روم کے بادشاہ بھی اپنے زمانے کے بڑی بڑی فوجیں رکھنے والے اور مضبوط قلعوں میں رہنے والے بڑے طاقت ور بادشاہ تھے مگر آج لوگوں کو ان مشہور لوگوں کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم ہے۔کہ ان کی قبریں کہاں ہیں ان کے علاوہ بڑے بڑے مغرور اور سرکش بادشاہ بھی ہوئے ہیں مگر موت کے ہاتھوں سب کا غرور خاک میں مل گیا۔ایسے نفاست پسند لوگ بھی اس دنیا میں تھے جو مٹی کا عطر اس وجہ سے نہیں لگاتے تھے کہ اس میں سے مٹی کی خوشبو آتی ہے مگر آہ، آج ان کی ہڈیاں تک اسی مٹی میں مل گئی ہیں۔اور ایسے ایسے نوجوان اور خوب صورت لوگ جن کا حسن حضرت یوسف کے لیے باعث رشک تھا، آج ان کا نام و نشاں بھی باقی نہیں ہے۔

شاعر ان لوگوں کی مثالیں دے کر ہمیں ایک بار پھر عبرت دلا رہا ہے اور ڈرا رہا ہے کہ اس دنیا کا تو یہی طریقہ ہے کہ جو کل زندہ تھے وہ آج نہیں ہیں اور جو آج زندہ ہیں وہ کل ختم ہو جائیں گے تو پھر اس دنیا سے دل لگانے کا کیا فائدہ ہے؟

26.5 زبان کے بارے میں

جب کلام میں کسی مشہور واقعے یا مشہور شخصیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسے صنعت تلمیح کہتے ہیں۔دیکھئے مثنوی کے اس حصے میں شاعر نے کون کون سی مشہور شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

بہرام، رستم، سام، قیصر، فغفور، حضرت یوسف، یہ سب تاریخ کی مشہور شخصیتیں ہیں۔

خاک میں ملنا اور خاک ہو جانا دونوں محاورے ہیں، جس کے معنی ہیں ختم ہو جانا۔فنا ہو جانا اس میں ایک شعر یہ ہے

نوٹ

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

اسی خیال کو میر تقی میرؔ نے اس طرح بیان کیا ہے

کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

متن پر سوالات 26.2

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے:

1. کلام میں جب کسی مشہور واقعے یا مشہور شخصیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُسے کیا کہتے ہیں۔
   (i) تشبیہ
   (ii) تلمیح
   (iii) تضاد

2. کاسۂ سر سے کیا مراد ہے؟
   (i) ٹوپی
   (ii) پیالہ
   (iii) کھوپڑی

26.6 متن کی تشریح

ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

نوٹ

ان اشعار میں بھی کئی تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔اس میں شعر نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے عشق کی کہانیاں آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں مثلاً شیریں فرہاد، نل اور دمینتی اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ سب موت کے ظالم ہاتھوں سے نہ بچ سکے مگر ان کی محبت کی خوشبو زمانے بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔یعنی ان کی محبت کی داستانیں آج بھی کہی اور سنی جاتی ہیں۔آخر میں شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز آنی جانی ہے اور موت سے کوئی کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ یہاں تک کہ صبح کے وقت پرندے بھی اپنی سریلی آواز میں یہی نغمہ سناتے ہیں کہ ایک دن سب کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے سب کو فنا ہونا ہے۔جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے جانا ہے۔موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں ہے۔بس فرق یہ ہے کہ آج کوئی دوسرا آدمی ہماری آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے جا رہا ہے، کل ہم بھی کسی کے سامنے اس دنیا سے چلے جائیں گے۔

26.7 زبان کے بارے میں

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مثنوی کے اس ٹکڑے کو پڑھنے کے بعد آپ کچھ سوچنے لگتے ہیں۔شاعر کا پیغام آپ کے دل کو چھولیتا ہے آپ کو ان اشعار میں سچائی نظر آتی ہے۔شاعری کی زبان میں اسے اثر آفرینی کہتے ہیں۔آپ نے پڑھا کہ شاعر نے 'لیلیٰ' کو 'لیلی' لکھا ہے۔شاعر نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اسے شعر کے قافیے 'پھیلی' کے وزن کا کوئی لفظ لانا تھا اس لیے 'لیلیٰ' کو 'لیلی' کر دیا۔اسے 'ضرورت شعری' کہتے ہیں۔یعنی ضرورت پڑنے پر شاعر کسی لفظ کو گھٹا، بڑھا سکتا ہے۔

متن پر سوالات 26.3

درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

1. کوہ کن کے معنی ہیں۔
   - (i) مزدور
   - (ii) فرہاد
   - (iii) پتھر کاٹنے والا
2. کون سا مصرع ضرب المثل بن گیا ہے؟
   - (i) بوئے الفت تمام پھیلی ہے
   - (ii) پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
   - (iii) موت سے کس کا رستگاری ہے
   - (iv) ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا

نوٹ

آپ نے کیا سیکھا؟

1. مرزا شوق کی یہ مثنوی لکھنؤ کی مختصر مثنویوں میں سب سے اچھی تصور کی جاتی ہے۔
2. اس مثنوی میں بڑے پُر اثر انداز میں زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کیا گیا ہے۔
3. کلام میں کسی مشہور واقعے یا مشہور شخصیت کا ذکر کرنا صنعت تلمیح کہلاتا ہے۔
4. مرزا شوق کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ انداز بیان اثر انگیز ہے۔
5. اس مثنوی کے اکثر مصرعے ضرب المثل بن گئے ہیں۔

26.11 اختتامی سوالات

1. شاعر نے مثنوی کے اس حصے میں کس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟
2. تلمیح کسے کہتے ہیں۔ تعریف بیان کیجئے اور مثال بھی دیجئے۔
3. شاعر نے جن اشعار میں تلمیحات کا استعمال کیا ہے انہیں چن کر اپنی کاپی میں لکھئے۔
4. مثنوی کے مفہوم کو اپنی کاپی میں لکھئے۔
5. جائے عبرت سرائے فانی ہے   موردِ مرگ ناگہانی ہے

متن پر سوالات کے جوابات

26.1	1.	(i)	2.	(ii)
26.2	1.	(ii)	2.	(ii)
26.3	1.	(iii)	2.	(iii)

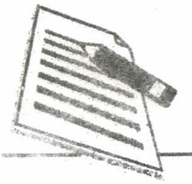

نوٹ

27

فراق گورکھپوری

شاعر کا تعارف

فراق گورکھپوری کا پورا نام رگھوپتی سہائے اور تخلص فراق ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸ راگست ۱۸۹۶ء لکشمی بھون گورکھپور میں ہوئی۔ گورکھپور میں ابتدائی تعلیم ہوئی اور الہ آباد میووسنٹرل کالج سے بی۔اے کیا۔ کئی جگہ ملازمت کرنے کے بعد فراق گورکھپوری الہ آبادی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرر ہوئے۔ انہوں نے بارہ شعری مجموعے بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے شعری وادبی خدمات کا اعتراف میں ملک کی کئی تنظیموں اور اداروں نے انہیں انعامات واعزازات سے نوازا۔

فراق گورکھپوری کو اردو غزل کا اہم ستون قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے غزل میں اس وقت ایک نئی روح پھونکی جب ہر سو نظم کا شہرہ تھا۔ اپنی منفرد آواز اور غزل میں نئے اسلوب اور نئے مضامین کے لیے یاد کئے جانے والے فراق گورکھپوری کی پہچان ان رباعیوں سے بھی نہیں جنہیں ہم روپ کی رباعیوں کے نام سے جانتے ہیں۔ اپنی شاعری میں عشق کو ایک نئے معنی میں برتنے والے نے اردو میں عشقیہ شاعری کی روایت پر باضابطہ ایک تنقیدی کتاب بھی لکھی۔ فراق کی بیشتر رباعیاں عشقیہ ہیں جب کہ اردو میں رباعی کی شاعری کا اصلی مضمون بے ثباتی دنیا یا پند ونصائح رہا ہے۔ ان کی رباعیوں کو دو ادوار کئے جاسکتے ہیں۔ پہلے دور کی رباعی پر آسی غازی پوری، انیس اور حالی کا اثر نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ... جو ۱۹۲۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی رباعیوں کا اسلوب الگ ہے۔ خیالات میں انوکھاپن اور ہندوستانیت کا غلبہ ہے۔ یہ رباعیاں عشقیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی تو ہیں مگر عشق کا یہ رنگ خالص ہندوستانی ہے۔ یہاں فراق نے معشوق کی ہر ہر ادا پر اپنی نگاہیں جمائی ہیں اور ان کا بیان نرالے ڈھنگ سے کیا ہے۔ یعنی ان رباعیوں میں سنگھار رس اور جذباتی لہریں اس طرح مل جل گئی ہیں کہ اب ان میں کسی قسم کا امتیاز دشوار ہے۔ ان رباعیوں میں ہندو کلچر کے جمال کو غالباً پہلی بار اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ فراق نے اپنی غزلوں میں بھی ہندی اور سنسکرت کے خوش نما الفاظ کے استعمال سے زبان اور بیان میں وسعت پیدا کی ہے۔

فراق کی رباعیوں کی اصل پہچان محبوب کے سراپا کا معصوم بیان ہے۔ ان کی مضمون آفرینی اور جدت نے ایک ایسا اسلوب خلق کیا ہے جسے پڑھنے والا فوراً پہچان لیتا ہے۔

مقاصد

ان رباعیات کو پڑھنے کے بعد آپ:

- رباعی کی تعریف بیان کرسکیں گے؛
- فراق گورکھپوری اور محروم کی رباعیوں کے شعری حسن پر اظہار خیال کرسکیں گے۔

27.1 اصل سبق

آیئے پہلے فراق کی رباعیات پڑھ لیں۔

پہلی رباعی

صحرا میں زمان ومکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق
تہذیبیں کیوں غروب ہوجاتی ہیں

زمان ومکان: زمانہ اور جگہ
بیدار: زندہ (جاگنا)
خلوت: تنہائی
غروب: ڈوبنا

دوسری رباعی

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے
دکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں
سکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

27.2 متن کی تشریح

پہلی رباعی

صحرا میں زمان ومکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق
تہذیبیں کیوں غروب ہوجاتی ہیں

اس رباعی میں تہذیبوں کی تاریخ کی یاد دلا کر اس امر کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ دنیا میں چاہے انسان ہو یا اس کا کوئی بھی نظام یا تہذیب اسے اتار چڑھاؤ عروج اور زوال سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ آج جو قوم اور اس کی تہذیب بہت کمتر محسوس ہوتی

نوٹ

ہے کبھی اس تہذیب کا ڈنکا بجتا تھا۔ تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی ہے جس کے نتیجے میں ہندوستان میں جس ہندو اسلامی تہذیب، گنگا جمنی تہذیب کا عروج ہوا تھا اُسے آج زوال کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ واضح رہے کہ رباعی کا آخری مصرع کو ہی رباعی کی روح قرار دیا گیا ہے۔ فراق نے پہلے کے تین مصرعے میں یہ نہ بتایا ہے کہ وہ کونسی ایسی شئے ہے جو زمان ومکان کے صحرا میں یعنی تاریخ اور وقت کے صحرا یا بیابان میں کھو جاتی ہے۔ جو صدیوں تک چمک دمک کی مثال بن کر زندہ رہتی ہے اور ایک دن ختم ہو جاتی ہے یعنی روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ تنہائی میں ہر حساس انسان کی شاید یہی سوچ ہوتی ہے کہ آخر دنیا میں پائی جانے والی یہ شاندار تہذیبیں ایک دن آخر کیوں ڈوب جاتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ دنیا میں کسی شئے کو بھی ہمیشگی حاصل نہیں ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے اسے ایک نہ ایک دن مرنا ہوتا ہے۔ دکھ کے بعد سکھ اور سکھ کے بعد دکھ انسان اور اس کی تہذیب یا معاشرے میں ایک زندہ اصول ہے۔

27.3 زبان کے بارے میں

اس رباعی کو سمجھنے کے لیے تہذیبوں کی تاریخ کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ہندوستان میں ویدک تہذیب اور اس سے پہلے موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب آج کہاں ہے۔ تاریخ کے صفحوں میں ہے جسے ہم پڑھ کر اس تہذیب کے شاندار اقدار کا اندازہ کرتے ہیں۔ ایک حساس انسان کے ذہن میں یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ یہ شاندار تہذیبیں آخر ایک دن کیوں فنا ہو جاتی ہیں۔ اس رباعی میں ان باتوں کی طرف پڑھنے والے کے ذہن کو راغب کیا گیا ہے۔

زبان یعنی زمانہ مکانی یعنی جگہ۔ زمان ومکان سے ماورا یعنی اس کے اثر سے آزاد صرف فن ہے فن کار ہے یعنی خدا ہے باقی دنیا کے ہر شئے زمان ومکان کی قید میں ہے اور جو زمان ومکان کی قید میں ہے اسے اُتار چڑھاؤ، زندگی اور موت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس رباعی میں فراق نے ردیف اور قافیے کے طور پر افعال کا استعمال کیا ہے جس سے اس رباعی کے مضمون تہذیب اور اس کی کہانی میں جو اُتار چڑھاؤ ہے اس کا نقشہ واضح ہوتا ہے۔ زمان ومکان عطف واؤ سے جڑے ہوئے الفاظ میں جو ہم قافیہ اور ہم صوت ہیں۔ اسے ہم عطفی مرکبات میں شمار کر سکتے ہیں۔ رباعی کا آخری مصرع ایک سوال ہے اور ظاہر ہے اس سوال کا جواب بہت ہی بحث طلب ہے اس سوالیہ انداز سے رباعی میں معنیٰ آفرینی کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

متن پر سوالات 27.1

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

1. اس رباعی میں

نوٹ

i. تہذیبوں کی تاریخ یعنی عروج وزوال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ii. زمان ومکان کے فلسفے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

iii. نیوٹن اصولوں سے پیدا سوالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

2. رباعی کا آخری مصرع کیا ہے؟

1. ایک سوال ہے

2. ایک جواب ہے

3. پوری رباعی کا ایک نچوڑ ہوتا ہے۔

27.4 متن کی تشریح

دوسری رباعی

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے
دکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں
سکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

اس رباعی کا تعلق بے ثباتی دنیا یعنی زندگی چند روزہ ہے یا کسی قسم کے پندونصائح یعنی نصیحت سے نہیں ہے۔اس رباعی میں محبوب یا عورت کی خصوصیات کا شاعرانہ اظہار کیا گیا ہے۔سچ ہے کہ عورت کے بغیر یہ دنیا کسی ریگستان کی طرح ہے۔کوئی گھر ایک کھنڈر کی طرح ہے۔عورت اگر محبوب ہے تو یہ مرد یا عاشق کے لیے سراپا رحمت ہے۔اس لیے پہلے مصرعے میں کہا گیا ہے کہ جب عاشق کا ہاتھ محبوب اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے تو اسی لمحہ زندگی کا ہر غم، ہر درد ختم ہو جاتا ہے۔تیسرے اور چوتھے مصرعے میں شاعر نے محبوب یا عورت کو ہری کھیتی کہا ہے۔یعنی دنیا کے اس تپتے ہوئے ریگستان میں عورت کسی حسین سائے کی طرح ہے یا کھیتی کی طرح ہے۔عورت کا وجود اس دنیا کے لیے ایک سائے کے مانند ہے۔شادابی کے مانند ہے۔ہری کھیتی استعارہ ہے زندگی کی شادابی کا۔

27.5 زبان کے بارے میں

اردو شاعری میں محبوب کی تعریف کا مضمون ہر شاعر کے یہاں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔تو وہیں عاشق جب ناراض ہوتو محبوب کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں چوکتا۔اس رباعی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شاعری اور عورت کا ساتھ چولی دامن کا

ساتھ ہے تو وہیں عورت وہ ہستی ہے جسے دنیا میں ایک خاص طرح کشش ہے۔ عورت کو ہری کھیتی کہنا استعارہ ہے۔ استعارہ چیزوں کو نیا نام دینا ہے۔ یعنی یہاں عورت کا نیا نام ہری کھیتی ہے۔

متن پر سوالات 27.2

1. اس رباعی میں کس کی تعریف کی گئی ہے۔
   (i) سیاست کی
   (ii) محبت کی
   (iii) محبوب کی

2. استعارہ کسے کہتے ہیں۔
   (i) چیزوں کو نیا نام دینا استعارہ ہے
   (ii) متضاد الفاظ کو استعارہ کہا جاتا ہے
   (iii) اسم کی ایک قسم ہے

تلوک چند محرومؔ

27.6 شاعر کا تعارف

تلوک چند محرومؔ مغربی پنجاب (پاکستان) کے ضلع میاں والی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی اور زندگی بھر اردو کی درس وتدریس میں مشغول رہے۔ جوشؔ کی طرح محرومؔ کو بھی نظم کے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ محرومؔ کے کلام میں الفاظ کی برجستگی، اور خیالات کی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ ان خوبیوں نے ان کی 'رباعیات' کو بھی حسن بخشا ہے۔ ان کے کلام میں ادبی، اخلاقی اور حسن کی فطرت کے مضامین ملتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی اور فارسی کے پاکیزہ خیالات کو اردو کا جامعہ پہنچایا۔

زبان کی صفائی، طرز بیان کی سنجیدگی ان کے کلام کی خوبیاں ہیں۔ محرومؔ کی رباعیاں اخلاقیات کی تعلیم دیتی ہیں۔

نوٹ

آیئے پہلے محروم کی رباعیات پڑھ لیں۔

27.7 اصل سبق

پہلی رباعی

مذہب کی زبان پر ہے نکوئی کا پیام
حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی
مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

نکوئی: نیکی
پیام: پیغام
حسن عمل: اچھے کام
راست گوئی: سچ بولنا
صلح جوئی: میل ملاپ

دوسری رباعی

فطرت کی دی ہوئی مسرت کھوکر
اوروں کو نہ کر ملول غمگیں ہوکر
یہ عمر بہرحال گزر جائے گی
ہنس ہنس کے گزار یا رو رو کر

27.8 متن کی تشریح

پہلی رباعی

مذہب کی زبان پر ہے نکوئی کا پیام
حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی
مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

شاعر نے اس رباعی میں مذہبی رواداری، نیک عمل، سچائی اور بھائی چارے کی تعلیم دی ہے اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ لوگ مذہب کے نام پر کیوں لڑتے ہیں۔ مذہب تو میل ملاپ کی تعلیم دیتا ہے اور بھائی چارہ سکھاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہر مذہب یکجہتی، سچائی، ایکتا اور اچھے کام کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کوئی بھی مذہب فتنہ وفساد، لڑائی جھگڑا نہیں سکھاتا۔ شاعر اس بات پر حیران ہے کہ جب کوئی مذہب لڑائی جھگڑے کی تعلیم نہیں دیتا تو لوگ مذہب کے نام پر کیوں لڑتے ہیں؟

نوٹ

27.9 زبان کے بارے میں

محرومؔ کی رباعی اقبالؔ کے اس مصرعے کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

صلح جوئی، راست گوئی، حسنِ عمل تینوں فارسی ترکیبیں ہیں۔

ترکیب الفاظ: دو الگ الگ الفاظ کو ملا کر نیا الفاظ بنانے کو ترکیب کہتے ہیں جیسے حسن اور عمل دو الگ الگ الفاظ ہیں۔ دونوں کو ملا کر ترکیب بنائی گئی ہے۔

جیسے حسن+عمل حُسنِ عَمل۔ اسی طرح صلح جوئی اور راست گوئی ترکیبیں ہیں۔

متن پر سوالات 27.3

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگایئے۔

1. اس رباعی میں مذہب کس بات کا پیغام دیتا ہے؟
   - (i) صلح جوئی
   - (ii) خدا ترسی
   - (iii) عبادت
2. اس رباعی کے ذریعے شاعر کا کیا پیغام ہے؟
   - (i) مل جل کر رہنا
   - (ii) اپنے اپنے مذہب کی پیروی
   - (iii) دوسروں کے مذہب کی عزت
3. 'ترکیب الفاظ' کسے کہتے ہیں؟
   - (i) کسی بات کے بنانے کو
   - (ii) قسمت آزمانے کو
   - (iii) دو الگ الگ الفاظ ملا کر ایک لفظ بنانے کو
4. مندرجہ ذیل میں ترکیب الفاظ پہچانیے۔
   - (i) راست گوئی

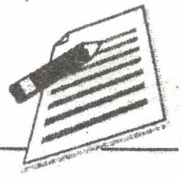

(ii) ستم اور ظلم

(iii) حسن اور عمل

27.10 متن کی تشریح

دوسری رباعی

فطرت کی دی ہوئی مسرت کھوکر
اوروں کو نہ کر ملول غمگیں ہوکر
یہ عمر بہرحال گزر جائے گی
ہنس ہنس کے گزار یا رو رو کر

شاعر کہتا ہے کہ قدرت نے سب کوخوشیاں دی ہیں۔ان خوشیوں کو کھوکر، اداس پریشان نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اُداس شخص دوسرے لوگوں کو بھی اُداس اور رنجیدہ کر دیتا ہے۔زندگی تو ہر حال میں گزارنی ہے۔اس کو روتے ہوئے کیوں گزارا جائے۔ زندگی ہنس کر گزاری جائے تو آپ دوسرے لوگوں کو بھی خوش رکھ سکیں گے۔

زندگی اسی کا نام ہے کہ اپنا غم بھلا کر دوسرے لوگوں کو خوش رکھا جائے۔زندگی میں آنے والی پریشانیاں، دکھ اور غم تو سب کو سہنے پڑتے ہیں، ان سے دکھی ہوکر اوروں کو کیوں دکھی کیا جائے؟ خوش رہو، سب کو خوش رکھو، یہی اصل زندگی ہے۔

27.11 زبان کے بارے میں

رونا، ہنسا متضاد الفاظ ہیں۔متضاد الفاظ کو شعر میں استعمال کرنے کو صنعت تضاد کہتے ہیں۔ملول، غمگین ہم معنی الفاظ ہیں۔ہم معنی الفاظ کو مترادف الفاظ کہتے ہیں۔

متن پر سوالات 27.4

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگایئے۔

1. شاعر کے نزدیک زندگی کیسے گزاری جائے؟

(i) لڑتے ہوئے

(ii) روتے ہوتے

(iii) خوش رہ کر

2. صنعت تضاد کسے کہتے ہیں؟

(i) کسی خاص بات کے بیان کرنے کو

(ii) متضاد الفاظ استعمال کرنے کو

(iii) مترادف الفاظ کے استعمال کو

.3 مترادف اور متضاد الگ الگ کر کے لکھیے۔

حزن و ملال، رات و دن، صبح و شام، مسرت و انبساط، رنج و خوشی، اداس و غمگین

آپ نے کیا سیکھا؟

.1 رباعی چار مصرعوں والی مختصر نظم کو کہتے ہیں۔

.2 رباعی کو 'دو بیتی' یا 'ترانہ' بھی کہتے ہیں۔

.3 رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔

.4 رباعی کا آخری مصرع بہت اہم ہوتا ہے جس میں رباعی کا نچوڑ ہوتا ہے۔

.5 رباعی میں حسن و عشق، اخلاق، فلسفہ اور تصوف وغیرہ ہر طرح کے مضامین کا بیان ہوتا ہے۔

.6 محرومؔ اور فراقؔ کی رباعیات میں آپ نے زندگی کی حقیقتوں اور انسانی جذبات کا برمحل استعمال پایا۔

27.12 مزید مطالعہ

دیگر شعراء کی رباعیاں بھی پڑھیے۔ جیسے حالیؔ، جوشؔ، امجدؔ وغیرہ۔

اختتامی سوالات 27.16

.1 رباعی کسے کہتے ہیں؟

.2 رباعی کے خاص موضوعات کون کون سے ہیں؟

.3 چند مخصوص رباعی گو شعراء کے نام لکھیے؟

.4 ترکیب الفاظ کی تین مثالیں دیجیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

27.1 .1 (i)

.2 (iii)

27.2 .1 (iii)

.2 (i)

27.3
1. (i)
2. (i)
3. (iii)
4. (i)

27.4
1. (iii)
2. (iii)
3. متضاد الفاظ: رات و دن، صبح و شام، رنج و خوشی
مترادف الفاظ: حزن و ملال، مسرت و انبساط، اُداس و غمگین

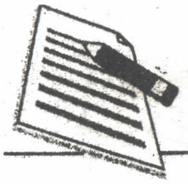

28

اختر انصاری

شاعر کا تعارف

عام طور پر قطعات میں چار مصرے یعنی دو اشعار ہوتے ہیں۔ یوں تو رباعی میں بھی چار مصرے ہوتے ہیں لیکن قطعہ اور رباعی میں فرق یہ ہے کہ رباعی کے لیے ایک بحر مخصوص ہے لیکن قطعہ کسی بحر میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرے کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے جب کہ قطعے میں یہ شرط نہیں صرف دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ عموماً قطعہ بند اشعار غزلوں میں ملتے ہیں۔

قطعات لکھنے والوں میں حالؔی، اکبرؔ، اقبالؔ زیادہ مشہور ہیں۔ موجودہ زمانے میں جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ اور اخترؔ انصاری نے بہت عمدہ قطعات لکھے ہیں جو اپنی بلاغت اور گہرے مشاہدے کی وجہ سے پڑھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ آج آپ اختر انصاری کے چار قطعات پڑھیں گے۔

مقاصد

ان قطعات کو پڑھنے کے بعد آپ:

- قطعہ اور رباعی کا فرق بیان کر سکیں گے؛
- قطعات کی تشریح کر سکیں گے؛
- شاعر کا مدعا سمجھ کر بیان کر سکیں گے؛
- مختلف صنعتوں سے واقف ہو کر انہیں بیان کر سکیں گے۔

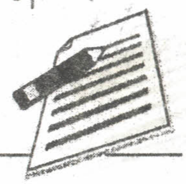

نوٹ

28.1 اصل سبق

آیئے ایک بار قطعات پڑھ لیتے ہیں۔

'فطرت'

یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی
وہ غم دیدہ دلوں کو غم کے بدلے عیش دیتی ہے
میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اس کی بزم عشرت میں
تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ دیتی ہے

غم دیدہ: غمگین
عیش: آرام
بزم: محفل
عشرت: خوشی

''دھوپ اور مینہ''

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران میں
دفعتاً سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی
روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑا

دفعتاً: اچانک
وحشت: گھبراہٹ، دیوانگی

آلام روزگار

تلخیاں، محرومیاں، ناکامیاں، ناداریاں
مستزاد اس غم پہ جس کا ناز پروردہ ہوں میں
یہ خس و خاشاک بھی یارب! مجھے منظور ہے
صدقے تیری دین کے، بہتا ہوا دریا ہوں میں

پروردہ: پالا ہوا
تلخی: کڑواہٹ
محرومی: کسی چیز کا نہ ملنا
ناداری: غریبی
دین: بخشش
مستزاد: زیادہ ہونا

دل کا باغ

اپنے دل کے باغ سے چُن چُن کے پھول
عمر بھر اک ہار میں گوندھا گیا
کس کو پہناؤں گا یہ سوچا ہی نہیں
آہ۔ اے اختر یہ میں نے کیا کیا

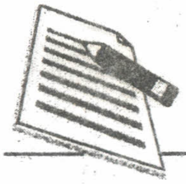

نوٹ

28.2 متن کی تشریح

فطرت

یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی
وہ غم دیدہ دلوں غم کے بدلے عیش دیتی ہے
میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اس کی بزم عشرت میں
تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ دیتی ہے

شاعر کہتا ہے کہ دور جنگل میں ایک ایسی ہستی رہتی ہے جو غمگین دلوں کی اُداسی دور کر دیتی ہے۔ جب لوگ پریشان حال اس کے پاس جاتے ہیں تو وہ محبت سے ان کے آنسو پونچھ کر سرشار کر دیتی ہے۔ جب انسان اُداس ہو جاتا ہے تو فطرت کے حسین نظاروں میں گم ہو کر سکون حاصل کرتا ہے۔ ہری بھری وادیاں، جنگل، پہاڑ، دریاؤں کی روانی اور بادلوں کی گھن گرج یہ تمام نظارے انسان کو خوش کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے سارے غم بھول جاتا ہے۔ انگریزی ادب میں ولیم ورڈس ورتھ کی نظمیں اسی قسم کی ہیں۔

28.3 زبان کے بارے میں

اس قطعہ میں فطرت کے لیے دیوی کا لفظ استعمال کر کے اس عقیدے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے مطابق سکون کی دیوی جنگل میں رہتی ہے۔ جب انسان جنگل میں راستہ بھٹک کر یا سکون کی تلاش میں جنگل کا رُخ کرتا ہے تو وہ اس کی مدد کرتی ہے، اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اسے سکون بخشتی ہے۔

متن پر سوالات 28.1

1. انسان کے غمگین دلوں کو کون شاد کرتا ہے؟
   الف) مال و دولت
   ب) فطرت کے حسین مناظر
   ج) ریڈیو اور ٹیلی ویژن
2. پیار کی دیوی کہاں رہتی ہے؟
   الف) بازاروں میں
   ب) جنگلوں میں
   ج) سنیما گھروں میں

نوٹ

28.4 متن کی تشریح

دھوپ اور مینہ

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران
دفعتاً سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی
روتے روتے کھکھلا کر ہنس پڑا

اس قطعہ میں شاعر نے غم کے بعد خوشی کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔شاعر نے اس کی مثال اس طرح دی ہے کہ جب ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگتی ہیں اور رم جھم رم جھم بارش ہوتی ہے تو اچانک سورج بادلوں میں سے نکل کر فضا کو روشن کر دیتا ہے۔اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شخص روتے روتے ہنس پڑا ہو۔یہی حال ہماری زندگی کے دکھ سکھ کا ہے۔جب انسان دکھ جھیلتے جھیلتے گھبرا جاتا ہے تب اچانک اس کے حالات بدل جاتے ہیں اور اسکی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

28.5 زبان کے بارے میں

اس قطعہ میں صنعت تکرار کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شاعر نے ایک ہی لفظ کو دو بار استعمال کیا ہے۔اس قطعہ میں ''ہلکی ہلکی'' اور ''روتے روتے'' آیا ہے۔

''سورج بے پردہ ہوا'' محاورتاً استعمال ہوا ہے۔اس کا مطلب ہے ''سورج نکل آیا۔''

متن پر سوالات 28.2

1. ''ہلکی ہلکی پھوار'' کو شاعر نے کس چیز سے تشبیہ دی ہے۔
   الف) رونے سے
   ب) ہنسنے سے
   ج) گانے سے

2. ''سورج بے پردہ ہوا'' کا کیا مطلب ہے؟
   الف) سورج ڈوبنے لگا
   ب) سورج نکل آیا
   ج) سورج کی روشنی

آلامِ روزگار

آلامِ روزگار

28.6 متن کی تشریح

تلخیاں، محرومیاں، ناکامیاں، ناداریاں
مستزاد اس غم پہ جس کا ناز پروردہ ہوں میں
یہ خس وخاشاک بھی یارب مجھے منظور ہے
صدقے تیری دین کے! بہتا ہوا دریا ہوں میں

اس قطعہ میں شاعر دنیا کی مشکلات اور پریشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ میرے مقدر میں تو مایوسیاں، ناکامیاں، غریبی اور مفلسی ہے اور ان سب کے علاوہ ایک اور غم جو سب سے زیادہ ہے وہ ہے غم یار جس نے مجھے اپنے عشق میں گرفتار کرر کھا ہے۔ اس کے باوجود میں اللہ کا شکرادا کرتا ہوں کیوں کہ میں ایک بہتا ہوئے دریا کی مانند ہوں جو ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔ چاہے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آئیں۔ دوسرے معنی میں شاعر یہ پیغام دے رہا ہے کہ جس طرح دریا سب کو سیراب کرتا ہے سب کی پیاس بجھا تا ہے، میں بھی وہی کام کرتا ہوں۔

28.7 متن کی تشریح

دل کا باغ

اپنے دل کے باغ سے چُن چُن کے پھول
عمر بھر ایک ہار میں گوندھا گیا
کس کو پہناؤں گا یہ سوچا نہیں
آہ اے اختر یہ میں نے کیا کیا

اس قطعہ میں شاعر نے جس محبوب کی آرزو کی ہے اس کے بارے میں ابھی سوچا بھی نہیں ہے۔ اس نے اپنے دل میں طرح طرح کے ارمان سجائے اور آرزوؤں کا محل تعمیر کیا۔ وہ عمر بھر صرف محبوب کی خدمت میں پیار کی سوغات پیش کرنے کی تیاری کرتا رہا۔ اب وہ پچھتا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہائے میں نے یہ کیا کیا؟ اس بات کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا کہ یہ آرزو اور

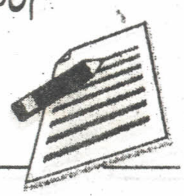

ارمان کس طرح پورے ہوں گے۔

28.8 زبان کے بارے میں

اس قطعہ میں شاعر نے دل کو ایک باغ سے تشبیہہ دی ہے اور دل کے ارمانوں کو باغ کے پھولوں سے۔ اس طرح ایک خوبصورت استعارہ پیش کیا ہے۔

متن پر سوالات 28.3

1. اس قطعے کے پہلے مصرعے میں پھولوں سے کیا مراد ہے؟
   الف) ارمان
   ب) زندگی
   ج) موت
2. مستزاد کے معنی کیا ہیں؟
   الف) کم ہونا
   ب) مناسب ہونا
   ج) زیادہ ہونا

آپ نے کیا سیکھا؟

- اختر انصاری ایک مشہور قطعہ گو شاعر ہیں۔
- قطعہ کا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔
- اکثر غزلوں میں قطعہ بند اشعار ملتے ہیں۔
- قطعات میں معنوی تسلسل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔
- جب کسی مصرعے میں ایک لفظ ایک ہی معنی میں دوبار استعمال کیا جائے تو اسے صنعت تکرار کہتے ہیں۔

28.9 مزید مطالعہ

اختر انصاری کے علاوہ اور بہت سے شعرا نے خوب صورت قطعات لکھے ہیں۔ انہیں ضرور پڑھیے۔

اختتامی سوالات 28.13

1. قطعہ کسے کہتے ہیں؟
2. اختر انصاری کے انداز بیان پر روشنی ڈالیے۔
3. اپنے پسندیدہ قطعے کی تشریح کیجیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

28.1	.1	(ب)	.2	(ب)
28.2	.1	(الف)	.2	(ب)
28.3	.1	(الف)	.2	(ب)

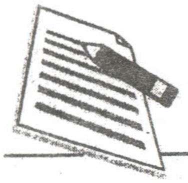

نوٹ

29A

خط و کتابت، دفتری نوٹ، درخواست اور دفتری خط

ہم میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جس نے کبھی کوئی خط نہ لکھا ہو۔ کسی خوشی کی خبر پر اپنے دوست، رشتے دار، بزرگ، ساتھی یا اپنے چھوٹے رشتے دار کو مبارک باد دے کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی موت، نقصان یا ناکامی پر تعزیت یا افسوس کا خط لکھتے ہیں۔ کسی بیمار کی حالت پوچھنے کے لیے خط لکھتے ہیں۔ اسے عیادت کا خط کہتے ہیں۔ عیادت کے خط میں جلد صحت یاب ہونے کی خواہش اور دعا ہوتی ہے۔ اپنی خیریت اپنے خاندان کے لوگوں یا دوستوں تک پہنچانے اور ان کی خیریت جاننے کے لیے بھی خط لکھے جاتے ہیں۔ ان سب قسم کے خطوں میں لکھنے والے کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح کے خط نجی خط ہوتے ہیں۔

29A.1 کاروباری خط

کچھ تاجر، صنعت کار یا افراد، دوسرے تاجروں یا صنعت کاروں سے کچھ سامان منگواتے ہیں۔ جو سامان وصول ہوتا ہے اس کی وصولی کی اطلاع دی جاتی ہے۔ سامان دیر سے پہنچنے یا نہ پہنچنے کی شکایت ہوتی ہے۔ ان خطوں میں جذبات نہیں ہوتے۔ صرف کاروباری معاملات ہوتے ہیں۔ یہ خط نجی نہیں ہوتے، کاروباری ہوتے ہیں۔

متن پر سوالات 29A.2

1. تعزیتی خط کس موقع پر لکھا جاتا ہے؟
2. کسی کی صحت کے بارے میں پوچھنے کو کیا کہتے ہیں؟

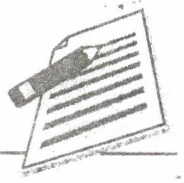

3. کس قسم کے خطوط کو نجی خط کہتے ہیں؟
4. ایک شخص کچھ سامان منگوانے کے لیے ایک فرم کو خط لکھتا ہے۔ یہ خط کی کونسی قسم ہے؟

29A.2 شکایتی خط

کبھی کبھی سرکاری محکمے یا افسر کے خلاف بڑے افسر کو شکایت لکھنی ہوتی ہے۔ چاہے وہ شکایت علاقے میں گندگی کی ہو یا بہت دیر تک بجلی غائب رہنے کی ہو، چاہے کسی سرکاری افسر کی بے عملی یا نااہلی کی شکایت ہو یا بدتمیزی کی۔ یہ شکایتی خط کہلاتے ہیں۔ جیسے

جناب ہیلتھ آفیسر صاحب
دلّی میونسپل کارپوریشن، دلّی

محترم! تسلیم
ہمارے محلے پل بنگش میں صفائی کی حالت بہت خراب ہے۔ صفائی کے کارکنوں سے اس سلسلے میں بار بار کہا گیا لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ اس طرف ان لوگوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ گلیوں میں کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں۔ پانی جگہ جگہ رکا پڑا ہے۔ جس سے ڈینگو پھیلنے کا خطرہ ہے۔ ڈینگو ایک خطرناک بیماری ہے جو مچھروں کے کاٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ آپ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر خود معائنہ فرمالیں تو بات بالکل صاف ہو جائے گی اور آپ کارکنوں سے صفائی کا مستقل انتظام کرادیں گے۔

خاکسار
محمد احمد خاں
مکان نمبر 3745- پل بنگش- دہلی-٦

جناب انجینئر فون
عیدگاہ ایکس چینج، نئی دہلی-۵

محترم! تسلیم
میرا فون نمبر 7535630 پچھلے ایک مہینے سے خراب ہے۔ بار بار فون کی خرابی کی شکایت کی گئی لیکن افسوس ہے کہ فون ٹھیک نہیں ہوا۔ میری درخواست ہے کہ

1. فون کو جلد از جلد ٹھیک کرا دیجیے۔
2. اس ایک مہینے کا فون کا کرایہ معاف کیا جائے۔

امید ہے کہ میری درخواستیں منظور فرمائیں گے۔

خاکسار
نعیم الرحمان
مکان نمبر 73، ماڈل بستی نئی، دہلی-۵

نوٹ

آپ نے کیا سیکھا

1. کسی علاقے کی گندگی کی شکایت ہیلتھ آفیسر سے کی جاتی ہے۔
2. ٹیلیفون کو ٹھیک کرانے کے فون کے لیے انجینئر سے کی جاتی ہے۔
3. جس محکمے کے بارے میں شکایت ہو اس کے سربراہ کو شکایت لکھنی چاہیے۔
4. گندگی کی وجہ سے بہت سی خطرناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

29A.5 اختتامی سوالات

ان سوالوں کے جواب اپنی کاپی پر لکھیے۔

1. کسی شکایتی درخواست کو کس طرح شروع کرتے ہیں۔
2. شکایت کرنے والے کا پتہ کہاں لکھنا چاہیے۔

29A.3 دفتری نوٹ

دفتری اور سرکاری خط و کتابت کے علاوہ دفتری کام کرنے کا بھی اپنا الگ طریقہ ہے۔ دفتر کے سربراہ کے تحت بہت سے شعبے ہوتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شعبے سے آنے والی فائل کا خود ہی بغور مطالعہ کرے اور اس پر غور و فکر کے بعد دستخط کرے۔ اس لیے انگریزوں کے زمانے سے ہی ایک طریقہ چلا آ رہا ہے۔ شعبے کا متعلقہ کلرک یا سینئر کلرک فائل پر مسئلے کے سلسلے میں ایک نوٹ لکھتا ہے۔ اس نوٹ کے تین حصے ہوتے ہیں۔ مسئلہ، اس کے بارے میں تفصیلات اور تیسرا تجویز کہ اس پر کیا فیصلہ مناسب ہے۔ یہ نوٹ ہیڈ کلرک، انچارج شعبہ وغیرہ کے دستخط ہو کر سربراہ کے پاس جاتا ہے اور وہ اس یقین کے ساتھ کہ اس کے ماتحتوں نے جو نوٹ لکھا ہے اور جو تجویز کی ہے وہ ٹھیک ہی ہوگی۔ اس پر دستخط کر دیتا ہے۔ اس کے دستخط ہو جانے کے بعد فیصلہ ہو گیا اور پھر اگر اس پر عمل کی ضرورت ہے تو انچارج شعبہ اس پر عمل درآمد کراتا ہے، یا پھر فیصلے کے مطابق اس فائل کو داخل دفتر کر دیتا ہے۔

یہاں نمونے کے لیے دفتری نوٹ دیے جا رہے ہیں۔

29A.4 دفتری نوٹ نمبر ا۔ بسلسلہ درخواست باشندگان باڑہ ہندوراؤ

باڑہ ہندوراؤ، دلّی کے باشندگان کی درخواست منسلک ہے۔ اس درخواست میں ان لوگوں نے مطالبہ کیا ہے کہ علاقے میں لڑکیوں کا ایک سینئر سیکنڈری اسکول شروع کیا جائے۔ ان کے بیان کے مطابق اس علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

نوٹ

علاقے کے اسکولوں کا جائزہ لیا گیا۔ ایجوکیشن آفیسر سے رپورٹ لی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس پورے علاقے میں جس کی آبادی چالیس ہزار کے قریب ہے، لڑکوں کے پانچ اسکول ہیں۔ ایک لڑکوں اور لڑکیوں کا مشترک اسکول ہے لیکن اس اسکول میں داخلے کے لیے بہت امیدوار ہوتے ہیں۔

علاقے میں لڑکیوں کے اسکول کی واقعی ضرورت ہے۔ لیکن نئے اسکول کے شروع ہونے سے مالیات پر دباؤ آئے گا۔ اس لیے فائنسس سکریٹری کے پاس یہ تجویز بغرض منظوری بھیجنا مناسب ہوگا، منظوری کے بعد ہی اسکول شروع کیا جاسکتا ہے۔

دستخط سینئر کلرک

ڈائرکٹر

تجویز منظور کی جاتی ہے۔ فائنسس سکریٹری کے لیے نوٹ تیار کر کے منظوری کے لیے بھیجا جائے۔

ڈائرکٹر

29A.5 دفتری نوٹ نمبر 2

سلیم احمد صاحب ٹی جی ٹی (ایڈڈ سینئر سیکنڈری اسکول) کی درخواست منسلک ہے۔ انہوں نے پوسٹ گریجویٹ ٹیچر کی جگہ کے لیے درخواست کی ہے۔

یہ انگلش میں ایم اے اور بی ایڈ ہیں۔ انگلش کے پوسٹ گریجویٹ لوگوں میں سب سے سینئر ہیں۔ دسویں کلاس کو انگلش پڑھاتے ہیں۔ دسویں کلاس کے بورڈ کے امتحان میں ان کے پڑھائے ہوئے طلبہ کا نتیجہ اس سال نوے فی صد تھا۔ پرنسپل صاحب نے ان کی ترقی کی سفارش کی ہے۔

ایک دوسرے استاد محمد نسیم صاحب جو ان سے جونیر ہیں لیکن آئندہ سال ریٹائر ہونے والے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں اس ایک سال کے لیے انہیں ترقی دی جائے تاکہ وہ پی جی ٹی کی حیثیت سے ریٹائر ہوں۔

محمد نسیم صاحب کی خواہش قانونی طور پر درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ سروس میں جونیر ہیں۔ سلیم احمد صاحب سینئر ہیں اس لیے ترقی کے مستحق ہیں۔ اس لیے انہیں ترقی دے کر پی جی ٹی بنایا جائے۔

دستخط سینئر کلرک

(دستخط)

ڈائرکٹر تعلیمات

ہم نے یہ دو دفتری نوٹ دیکھے۔ ان دفتری نوٹوں سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں۔

نوٹ

1. مسئلہ کیا ہے؟
2. مسئلے کے خلاف یا اس مسئلے کے حق میں کیا دلائل ہیں؟
3. فیصلے کی تجویز۔
4. نوٹ کلرک دستخط کرتا ہے اور پھر یہ فائل یا نوٹ کس کے پاس بھیجا گیا۔ وہ افسر جس کے پاس یہ نوٹ گیا، اگر اس نوٹ سے متفق ہے تو خود دستخط کر کے اپنا عہدہ کاٹ دیتا ہے اور اپنے آفیسر کو پیش کر کے اس عہدے کا نام لکھ دیتا ہے۔ وہ عہدیدار اگر نوٹ سے متفق ہے تو اپنا عہدہ کاٹ کر دستخط کرتا ہے اور اپنے آفیسر کا عہدہ لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح فائل قدم بہ قدم چل کر سب سے بڑے آفیسر تک جاتی ہے اور اس کے دستخط کے بعد منظور ہو جاتی ہے۔

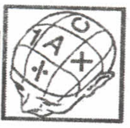

آپ نے سیکھا؟

1. دفتری نوٹ کی اپنی ایک خاص شکل ہوتی ہے۔
2. نوٹ میں تین باتیں یا مرحلے ہوتے ہیں۔
3. شعبے کا کلرک نوٹ لکھتا ہے اور اپنے افسر کو پہنچا دیتا ہے۔
4. افسر فائل پر دستخط کر کے اپنے آفیسر کے پاس بھیج دیتا ہے۔
5. فائل ایک افسر سے دوسرے کے پاس جاتی رہتی ہے اور دستخط کر کے آگے بڑھائی جاتی ہے۔
6. فائل پر منظوری کے دستخط شعبے کا افسر اعلیٰ کرتا ہے۔

29A.10 اختتامی سوالات

ان سوالوں کے جواب اپنی کاپی پر لکھیے

1. دفتری نوٹ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟
2. دفتری نوٹ عام طور پر کون لکھتا ہے؟
3. فائل ایک افسر سے دوسرے کے پاس کیوں جاتی ہے؟
4. دفتری نوٹ میں سب سے پہلے کیا لکھا جاتا ہے۔

29A.6 درخواست

اخباروں میں اشتہار دیئے جاتے ہیں کہ فلاں عہدے کے لیے اس قابلیت کے کارکنوں کی ضرورت ہے۔ اس میں ملازمت

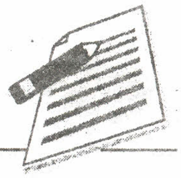

نوٹ

کی نوعیت شرائط اور تنخواہ کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ اشتہار سرکاری بھی ہوتے ہیں اور نجی بھی، اس جگہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے جو خط لکھا جاتا ہے اسے درخواست کہتے ہیں۔ درخواست کا نمونہ درج ذیل ہے۔

بخدمت جناب سکریٹری ایجوکیشن

حکومت دہلی۔

جناب عالی!

پرسوں کے روزنامہ اے۔ بی۔ سی۔ ٹائمز میں آپ کی طرف سے کلرکوں کی کچھ جگہوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ میں اپنی خدمات ان اسامیوں میں سے ایک کے لیے پیش کرتا ہوں۔

میری تعلیمی اور تجرباتی کیفیت درج ذیل ہے۔

1. بی کام۔ سیکنڈ ڈویژن
2. ٹائپ کی رفتار 37 لفظ فی منٹ
3. تجربہ: ایک غیر سرکاری فرم میں بحیثیت کلرک تین سال کا تجربہ
4. تاریخ پیدائش 17 اگست 1975 (یعنی عمر 24 سال چند ماہ)

اگر آپ مجھے اس اسامی پر کام کرنے کا موقع دیں گے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ پوری محنت اور ایمانداری سے کام کروں گا۔

خاکسار نعیم اللہ خاں

گھیر نجو خاں

رام پور

منسلکہ کاغذات

1. بی کام کی ڈگری کی نقل
2. ٹائپ کی رفتار کا سرٹیفکیٹ
3. تجربے کا سرٹیفکیٹ
4. سینئر سیکنڈری کا سرٹیفکیٹ (تاریخ پیدائش کا ثبوت)

ان نجی، کاروباری خطوں اور درخواستوں کے علاوہ خطوں کی ایک اور قسم بھی ہے جو شکل، انداز متن اور ضرورت کے لحاظ سے ان سب سے کچھ مختلف ہے۔ یہ خط کسی بات کو عام لوگوں تک پہنچانے یا حکومت کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی اخبار کے اڈیٹر کو۔

29A.7 اخباری خط کا نمونہ

مکرمی

آپ کے موقر روز نامے کے ذریعے حکومت کے محکمۂ تعلیم کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میرا بچہ گورنمنٹ اسکول میں چھٹی کلاس کا طالب علم ہے۔ اسکول میں 35 استادوں کی ضرورت ہے لیکن کل 23 استاد کام کر رہے ہیں۔ 12 جگہیں خالی ہیں۔ آدھا تعلیمی سال گزر چکا ہے اور چھٹی کلاس (سیکشن 7.1) میں سماجی علوم کے ایک پیریڈ میں بھی تدریسی کام نہیں ہوا۔ نہ تاریخ پڑھائی گئی، نہ جغرافیہ یا علم شہریت۔ کیا اس طرح طلبہ کی زندگی برباد نہیں کی جا رہی۔

مجھے امید ہے کہ آپ کے باوقار اخبار میں اس خط کی اشاعت سے محکمۂ تعلیم ضروری کارروائی ضرور کرے گا۔

عبدالرحمٰن

3757 محلہ نیاریان

دہلی-6

29A.8 دفتری خط

ان نجی، کاروباری اخباری، شکایتی خطوں اور درخواست کے علاوہ ایک الگ قسم اور ہے جو تقریباً ہر لحاظ سے تمام قسم کے خطوں سے مختلف ہے۔ یہ خط ایک سرکاری محکمے یا کسی فرد کی طرف سے کسی فرد یا دوسرے سرکاری محکمے کو لکھے جاتے ہیں۔ یا کسی محکمے کی طرف سے کسی شکایت یا درخواست کا جواب دینے کے لیئے لکھے جاتے ہیں۔ یہ سرکاری خط وکتابت ہے۔

یہاں سرکاری خط کا ایک نمونہ دیا جا رہا ہے۔ یہ نمونہ ہے، اصلی خط نہیں ہے۔

مراسلہ نمبر۔ ایف 65/2000/9 تاریخ۔ مہینہ 2000

ڈائرکٹر تعلیمات کی طرف سے چیف سکریٹری۔ حکومت دلّی کی خدمت میں

موضوع: (Sub) دلّی کے اسکولوں میں طلبہ کی سالانہ ترقی کے ترمیم شدہ قواعد

جناب عالی

دلّی اسکول ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کی سفارش پر دلّی کے اسکولوں کے طلبہ کی سالانہ ترقی کے قواعد جناب لفٹینٹ گورنر کی خدمت میں برائے منظوری بھیجے گئے تھے۔ انہوں نے ان کی منظوری عنایت فرمادی ہے۔ ان قواعد کی نقل برائے اطلاع اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔

آپ کا نیازمند

دستخط

(نام) ڈائرکٹر آف ایجوکیشن۔ دلّی

نوٹ

برائے اطلاع / ملاحظہ

1. جناب وزیر تعلیم۔حکومت دلّی
2. تمام ڈپٹی ڈائرکٹر صاحبان (ڈسٹرکٹ)
3. ڈائرکٹر (تعلیم) دلّی میونسپل کارپوریشن
4. ڈائرکٹر (تعلیم) نئی دلّی میونسپل کاؤنسل
5. ایجوکیشن آفیسر کنٹونمنٹ ایریا
6. پرنسپل صاحبان سرکاری اور امدادی اسکول

دستخط

(نام)

ایڈیشنل ڈائرکٹر

29A.9 نیم سرکاری خط

ہم نے اوپر سرکاری خط کا نمونہ اور اس کے مرحلے دیکھے۔ان خطوں کے علاوہ ایک اور قسم کا خط بھی ہوتا ہے جسے نیم سرکاری (DD) کہتے ہیں۔یہ خط عام طور پر برابر کے افسر ایک دوسرے کو لکھتے ہیں۔یا بڑا آفیسر چھوٹے کو لکھ سکتا ہے۔

نیم سرکاری خط کا نمونہ

نمبر۔ایف ۹/ن س/71/12000 فوری اور ضروری

مورخہ: تاریخ/مہینہ/۲۰۰۰

ڈیر علی اختر صاحب

میں نے مراسلہ نمبری ایف 9/2000/31 مورخہ تاریخ/مہینہ/سن میں آپ سے درخواست کی تھی کہ ہمارے محکمے کے ضمنی بجٹ کو منظور کرا دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس منظوری کے نہ ہونے کی صورت میں اگلے مہینے تنخواہیں نہ دی جا سکیں گی۔ اس کے لیے آپ کی ذاتی توجہ کی درخواست کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

نفیس رضا

ایجوکیشن سکریٹری

بخدمت جناب فائنس سکریٹری حکومت دہلی

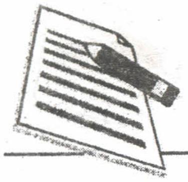

آپ نے سیکھا؟

1. دفتری خط و کتابت کا انداز اور خطوں سے مختلف ہے۔
2. دفتری خط کے ابتداء میں بھیجنے والے آفیسر اور جس آفیسر کو بھیجا جارہا ہے اس کا عہدہ
3. موضوع (Sub)
4. متن کے آخر میں بھیجنے والے آفیسر کے دستخط
5. جو کاغذات منسلک ہوں ان کی تفصیل
6. جن لوگوں کو نقلیں بھیجی جارہی ہیں، ان کے نیچے خط بھیجنے والے آفیسر کے دستخط یا اس سے ٹھیک چھوٹے آفیسر کے دستخط ہوتے ہیں۔
7. نقلوں پر الگ سے نمبر ہوتے ہیں اور تاریخ ہوتی ہے۔
8. ایک افسر چاہے چھوٹا ہو یا بڑا دوسرے کو جناب عالی لکھ کر مخاطب کرے گا۔
9. دفتری خط بڑے سے چھوٹے، یا چھوٹے سے بڑے افسر کو اسی نمونے پر خط لکھیں گے۔
10. نیم سرکاری خط ایک طرح سے نصف ذاتی، نصف سرکاری ہوتا ہے۔ لیکن نجی نہیں ہوگا۔

اختتامی سوالات 29A.16

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی پر لکھیے۔

(الف) ذیل میں کچھ سوالات دیئے ہیں۔ ان کے جواب ایک لفظ میں خالی جگہوں میں لکھیے۔

1. بھتیجے کی شادی پر جو خط لکھا جائے گا وہ کس قسم کا ہوگا۔ (   )
2. ایک فرم دوسری فرم سے سامان منگاتی ہے۔ کس قسم کا خط لکھیں گے۔ (   )
3. کسی سرکاری خط میں سب سے اوپر کیا لکھتے ہیں۔ (   )
4. ایک افسر دوسرے کو خط میں کیا کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ (   )

(ب) نیچے کچھ بیان دیئے گئے ہیں۔ ہر بیان کے سامنے جگہ پر اگر بیان صحیح ہے تو (✓) نشان، غلط ہے تو (x) نشان لگائیے۔

1. منسلکہ کاغذات کی فہرست سرکاری خط کے اوپر دی جاتی ہے۔ (   )
2. ہر افسر دوسرے کو جناب عالی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ (   )
3. نقول کے نیچے بھی کسی افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ (   )

نوٹ

4. نیم سرکاری خط ایک طرح سے نجی خط ہوتا ہے۔ ( )

5. اصل خط اور نقول پر الگ الگ نمبر ہوتے ہیں۔ ( )

(ج) مندرجہ ذیل بیانات میں خالی جگہ پُر کیجیے۔

1. .. نوٹ شعبے کا کلرک تیار کرتا ہے۔

2. اخبار کے لیے خط .. سے شروع کیا جاتا ہے۔

(د) مندرجہ ذیل دو سوالوں میں ہر بیان کے نیچے چار جواب دیئے گئے ہیں۔ ان چار جوابوں میں سے ایک ٹھیک ہے۔ ٹھیک جواب کے سامنے دی ہوئی جگہ پر (✓) نشان لگایئے۔

1. ایک نجی اور سرکاری خط میں یہ فرق ہے۔

(i) نجی خط میں اپنی بات ہوتی ہے۔ ( )

(ii) سب طرح کے خط ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ( )

(iii) سرکاری خط میں بھی ذاتی بات لکھی جا سکتی ہے۔ ( )

2. ایک نیم سرکاری خط کی خصوصیت ہے۔

(i) اس سے افسروں کی دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ ( )

(ii) ایک ماتحت اپنے افسر کو یہ خط لکھ سکتا ہے۔ ( )

(iii) یہ خط اہم ضرورت پر لکھے جاتے ہیں۔ ( )

(iv) اس کے ذریعے جواب طلب کیا جاتا ہے۔ ( )

(ہ) زیادہ سے زیادہ دس الفاظ میں جواب دیجیے۔

1. سرکاری اور نیم سرکاری خط میں کیا فرق ہے؟

2. ایک نجی خط کی خصوصیت کیا ہے؟

3. منسلکہ کاغذات کی تفصیل خط میں کس جگہ دی جاتی ہے؟

4. نیم سرکاری خط لکھنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

نوٹ

29B

فیچر

تعارف

ایک ہلکے پھلکے بیانیہ مضمون کو فیچر کہتے ہیں۔ کوئی شے، فرد، ادارہ یا سماجی رسم و رواج فیچر کا موضوع ہو سکتا ہے۔ اخباروں، رسالوں میں روز ہی خبریں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ان خبروں کا عام زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، عوام کا کیا ردعمل ہوتا ہے، ان خبروں اور واقعات سے عوام کی امیدوں، آرزوؤں، رنج و غم کا کیا تعلق ہے، ان واقعات کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں ان سے واقف ہو کر پڑھنے والوں کو کس طرح کا اطمینان ہوتا ہے، انہیں باتوں کو مخصوص اور ہلکے پھلکے انداز میں فیچر میں پیش کیا جاتا ہے۔ فیچر کا عنوان عام طور سے پُرکشش اور دل کو چھونے والا ہوتا ہے۔ فیچر اخبار و رسائل میں تو چھپتے ہی ہیں، ریڈیو پر بھی سنے جاتے ہیں اور ٹی وی پر بھی دیکھے جاتے ہیں۔ اخباروں میں فیچر کو ایک الگ نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ کبھی اس کو چوکھٹے (Box) میں رکھ دیتے ہیں، کبھی اس کی کتابت ہی الگ ڈھنگ سے کروائی جاتی ہے تاکہ نمایاں نظر آئے۔ کبھی کبھی فیچر کو اخباروں میں صفحہ اول پر ہی جگہ مل جاتی ہے۔

فیچر کے انداز بیان میں تنوع ہوتا ہے۔ یعنی اظہار بیان کے ایک ہی انداز اور لب و لہجہ کو مستقلاً اختیار نہیں کرتے بلکہ موضوع کے ایک پہلو کی بات ختم کرنے کے بعد دوسرے پہلو کے اظہار کا انداز بدل جاتا ہے۔ شاید آپ نے کوئی ریڈیو فیچر سُن کر محسوس کیا ہوگا کہ فیچر نشر کرتے وقت کئی آوازوں کو استعمال کرتے ہیں یا کم از کم دو آوازیں ضرور ہوتی ہیں۔ اس کا مقصد اظہار بیان میں تنوع پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اظہار بیان میں تنوع کا مقصد یہ ہے کہ قاری کی توجہ اور دلچسپی قائم رہے اور وہ یکسانیت اکتا نہ جائے۔ لیکن اظہار بیان کے تنوع کے بعد بھی موضوع کے بیان میں ایک اندرونی تسلسل بھی رہتا ہے جو بات ختم ہونے

نوٹ

تک قائم رہتا ہے۔

فیچر کے لیے اختصار بھی ضروری ہے۔طوالت فیچر کو بے مزہ کر دیتی ہے۔فیچر جتنا ہی مختصر ہوگا اتنا ہی دل پر اثر کرے گا۔فیچر کو اس طرح آسان اور عام فہم زبان میں لکھا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو لطف آجائے۔فیچر لکھتے وقت نہ تو لفاظی سے کام لیا جاتا ہے اور نہ بہتر سے بہتر زبان لکھنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے بلکہ ہلکی پھلکی زبان جو عام لوگوں کی سمجھ میں آجائے وہی استعمال کی جاتی ہے۔فیچر ایک دلکش فرحت بخش اور زندہ دل تحریر ہے۔

فیچر میں ایک ہی بات پر پوری توجہ صرف کی جاتی ہے یعنی ایک ہی خیال کو نکھار اور ابھارا جاتا ہے۔اس کا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔جس کا مقابلہ کسی دوسری صنف نثر سے یعنی مضمون نگاری یا افسانہ نگاری وغیرہ سے نہیں کیا جاسکتا۔اسی لیے فیچر لکھتے وقت مضمون نگاری کے سخت اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی۔مضمون لکھتے وقت رسمی ابتدا یا آغاز، درمیانی نفس مضمون اور روایتی اختتام کے پہلوؤں کو اہتمام کے ساتھ برتا جاتا ہے۔لیکن فیچر لکھتے وقت ان روایاتی اہتمام کی پابندی قطعی ضروری نہیں ہوتی۔

فیچر کے لیے موضوعات بھی الگ سے ہوتے ہیں۔عام طور پر ہر اس عنوان پر جس پر مضمون لکھتے ہیں، فیچر نہیں لکھ سکتے۔اس کے برخلاف کچھ موضوعات ایسے ہوتے ہیں جس پر فیچر تو لکھ سکتے ہیں لیکن مضمون نہیں لکھ سکتے۔دراصل مضمون معلوماتی ادب کا حصہ ہے جب کہ فیچر ہلکا پھلکا ادب کہلاتا ہے۔اس میں معلومات کے بوجھ سے قاری بوجھل نہیں ہوتا بلکہ وہ فیچر پڑھتے وقت تازگی محسوس کرتا ہے۔کوئی بھی مضمون عموماً حقائق کا مجموعہ ہوتا ہے۔کسی سنجیدہ مسئلہ پر بحث ہوتی ہے۔دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔فلسفہ بیان کیا جاتا ہے۔عالمانہ اور گہری وسنجیدہ باتیں ہوتی ہیں، رسمی انداز بیان ہوتا ہے۔فیچر میں اتنی گہری اور عالمانہ باتیں نہیں ہوتیں۔فیچر میں کسی بات کی تعریف بھی ہوسکتی ہے، اعتراض بھی ہوسکتا ہے لیکن اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ قاری فیچر پڑھ کر بیزار نہ ہو۔ایک تازگی برقرار رہے۔فیچر کی تحریر میں دلچسپی کے لیے ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔فیچر کا خاتمہ بھی دلچسپ طریقہ سے کیا جاتا ہے۔فیچر مضامین کے لیے دلچسپ سرخیوں کا انتخاب بھی ضروری ہے۔

فیچر لکھتے وقت اس کا دھیان بھی رکھا جاتا ہے کہ فیچر کس قسم کے قاری کے لیے لکھا جارہا ہے۔عید پر اگر عید نہ منانے والوں کے لیے فیچر لکھا جاتا ہے تو اس میں وہ نکات اور تفصیلات شامل کئے جائیں گے جو عید منانے والے قاری سے مختلف ہوں گے۔فیچر کے لیے موضوعات بے شمار ہوسکتے ہیں جیسے تحقیقات، فیشن، موسمیات، ٹیلی ویژن پروگرام، مختلف پیشے اور اس سے جڑے ہوئے لوگ۔موٹر کار، ڈاک ٹکٹ، باغبانی وغیرہ وغیرہ۔غرضیکہ آسمان اور زمین کے درمیان کی کسی بھی چیز کو فیچر کو موضوع بنایا جاسکتا ہے۔اس کے لیے تیز قوت مشاہدہ، وسیع تجربات اور معلومات کی ضرورت ہے۔

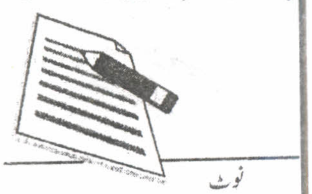

نوٹ

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ

— یہ بتا سکیں گے کہ فیچر کسے کہتے ہیں۔
— فیچر لکھنے کے مقاصد بیان کر سکیں گے۔
— فیچر کی اہمیت جان سکیں گے۔
— فیچر لکھنے کا طریقہ سیکھ سکیں گے۔

آپ نے یہ جان لیا اور سمجھ لیا کہ فیچر کسے کہتے ہیں۔ آیئے فیچر کا ایک نمونہ دیکھیں۔

اکیسویں صدی میں ہر طرف بوڑھے ہی بوڑھے نظر آئیں گے!

۲۱ ویں صدی شروع ہونے کا جشن پوری دنیا دھوم دھام سے منانے کو تیار ہے۔ پوری دنیا میں نئی صدی کی آمد پر مسرت کا ماحول ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک سچائی یہ بھی ہے کہ آنے والی یہ نئی صدی پوری دنیا کے لیے کئی نئے اور سنگین مسائل بھی لے کر آرہی ہے، جن سے نپٹنے کے لیے اگر ابھی سے کوششیں شروع نہ کی گئیں تو ۲۱ ویں صدی ۲۰ ویں صدی سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ خاص طور سے ترقی پذیر ممالک یعنی غریب ملکوں کے سامنے زیادہ چنوتیاں پیش آنے کا امکان ہے۔

نئی صدی میں دنیا کو کھانا، بجلی، پانی، بے روزگاری، فاقہ کشی جیسے سنگین مسائل کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا ساتھ ہی ایک اور نیا مسئلہ بھی دنیا کے سامنے کھڑا ہونے والا ہے اور وہ ہے ''بوڑھوں کا مسئلہ'' اقوام متحدہ اور عالمی یوم بزرگ پر جو رپورٹیں سامنے آئی ہیں وہ کافی چونکانے والی ہیں۔ ان رپورٹوں کے مطابق 2000ء کے آخر تک 60 برس سے زائد عمر کے لوگوں کی تعداد 60 فی صد سے زیادہ ہوجائے گی۔ اس وقت دنیا میں آبادی کی اضافی شرح ۱٫۷ فی صد ہے جب کہ ضعیفوں میں یہ شرح ۲٫۲ فی صد ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگلی صدی میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب دنیا میں ہر طرف بوڑھے ہی نظر آئیں گے اور آبادی کا عمر کے لحاظ سے تناسب پوری طرح غیر متوازن ہوجائے گا۔

ضعیفوں کی بڑھتی آبادی سے ہندوستان بھی اچھوتا نہیں ہے۔ ہندوستان میں 1901 میں ضعیفوں کی کل تعداد ایک کروڑ 20 لاکھ تھی جو 1961ء میں بڑھ کر 2 کروڑ 56 لاکھ اور 1991ء میں 3 کروڑ 53 لاکھ ہوگئی۔ اس صدی کے آخر میں ہندوستان میں یہ تعداد تقریباً 6 کروڑ ہوجانے کا امکان ہے۔ اس طرح 2025ء میں ہندوستان میں 10 کروڑ سے زائد بوڑھے ہوں گے۔ ضعیفوں کی تعداد میں ہونے والے اس اضافہ سے ایک سماجی مسئلہ کھڑا ہوجانے کا خدشہ ہے۔

ضعیفوں کی تعداد میں یہ اضافہ سماج اور سرکار دونوں کے لیے ہی ایک سنگین چنوتی ہوگی۔ آج کے سماج میں مشترکہ خاندان

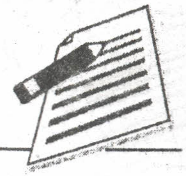

نوٹ

بکھر رہے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ تر بوڑھے تنہائی بھری زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ ہمارے ملک میں درمیانی اور نچلے طبقہ کے گھروں میں بوڑھے بوجھ بنتے جا رہے ہیں اور نئی نسل ان کے ساتھ جو رویہ اختیار کر رہی ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ آئے دن بوڑھے والدین سے ان کے بیٹوں اور ساس سسر سے بہوؤں کے شرمناک سلوک کی باتیں سامنے آتی ہیں۔ یہی سب سے زیادہ تشویش کی بات ہے کہ جب بزرگوں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہے گی تو ان کی ضرورتوں کو کون پورا کرے گا؟ وہ لوگ جو سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں میں ہیں ان کے لیے فکر اس لیے کم ہے کہ ان کے پاس پنشن اور فنڈ وغیرہ کا سہارا ہوتا ہے لیکن سب سے زیادہ فکر تو ان بوڑھے لوگوں کی ہے جن کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور نہ ہی آمدنی کا کوئی دوسرا راستہ۔ عام طور پر ایسے ہی ضعیف لوگوں کو ان کے گھروں میں نظر انداز کیا ہے اور کبھی کبھی تو وہ روٹیوں تک کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ان میں بھی ضعیف خواتین کی حالت زیادہ خراب ہوتی ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ضعیفوں میں مردوں کے مقابلے خواتین کی تعداد زیادہ ہے 1991، میں ہندوستان میں ضعیفوں کی کل آبادی میں 15 فی صد بیوائیں تھیں۔ ان میں بھی 85 فی صد سے زائد ان پڑھ تھیں۔ ہندوستان کو آنے والی صدی میں بوڑھے لوگوں کے مسئلہ سے نپٹنے کے لیے ابھی سے پالیسی مرتب کرنی ہوگی تا کہ اس سماجی بحران پر قابو پایا جا سکے۔

متن پر سوالات 29B.1

درست جواب پر صحیح کا (✓) نشان لگائیے۔

1. فیچر پڑھ کر لطف حاصل ہوتا ہے کیونکہ:

الف) اس کی زبان مشکل ہوتی ہے۔ ( )

ب) یہ مضمون سے الگ ہے۔ ( )

ج) یہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھا جاتا ہے۔ ( )

2. فیچر لکھتے وقت مضمون نگاری کے سخت اصولوں کی

الف) پابندی کرتے ہیں۔ ( )

ب) پابندی کبھی کرتے ہیں کبھی نہیں کرتے۔ ( )

ج) پابندی نہیں کرتے۔ ( )

3. فیچر کے اظہار بیان میں

الف) نیا پن ہوتا ہے۔ ( )

ب) تنوع ہوتا ہے۔ ( )

ج) تصنع ہوتا ہے۔ ( )

نوٹ

4. فیچر کو اخبار میں

الف) بالکل آخری صفحہ پر جگہ دی جاتی ہے۔ (   )

ب) درمیان میں جگہ دی جاتی ہے۔ (   )

ج) نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ (   )

آپ نے کیا سیکھا؟

— ہلکے پھلکے انداز میں آسان زبان میں کسی موضوع پر مختصر بیانیہ مضمون کو فیچر کہتے ہیں۔
— فیچر کی زبان مضمون نگاری کی زبان سے آسان ہوتی ہے۔
— فیچر لکھتے وقت مضمون نگاری کے سخت اصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔
— فیچر کی سب سے اہم خوبی اس کا اختصار ہے۔طویل فیچر دلچسپی قائم نہیں رکھ سکتے۔
— فیچر لکھتے وقت اظہار بیان میں تنوع پیدا کیا جاتا ہے۔
— فیچر لکھتے وقت ہر قسم کے قاری کی دلچسپی کا خیال رکھا جاتا ہے۔
— فیچر میں دلچسپی بڑھانے کے لیے کبھی کبھی ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کی جاتی ہے۔

اختتامی سوالات 29B.4

1. عید ملن پر دو صفحات پر مشتمل فیچر تیار کیجئے۔
2. فیچر کی کوئی تین خصوصیات بتایئے۔
3. فیچر لکھنا مضمون نگاری سے کس طرح الگ ہے۔
4. اخباروں سے فیچر تلاش کریے اور پڑھیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

29B.1 1. ج
2. ج
3. ب
4. ج

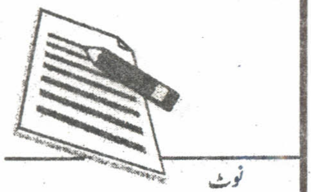

نوٹ

غم دیدہ: غمگین

30A

صحافت اور رپورٹ

صحافت کا تعارف

ایک مشہور اردو صحافی دیوان سنگھ مفتوں نے اپنی خودنوشت سوانح، ناقابل فراموش، میں اپنے صحافی بننے کی واردات لکھی ہے۔ انہوں نے گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں چوتھی کلاس پاس کی تھی اور لاہور میں ایک ڈاکٹر کی دوکان پر کمپاؤنڈر کی نوکری کر لی۔ سستا زمانہ تھا، پانچ روپے مہینہ تنخواہ ملتی تھی۔ دو روپے مہینے میں ناشتہ اور کھانا چلتا تھا۔ ایک روپے مہینے کے اخبار لیے جاتے تھے اور دو روپیہ مہینہ بچاتے تھے۔ جب کچھ پیسہ جمع ہو گیا تو وہ لکھنؤ گئے۔ اس زمانے کے مشہور اڈیٹر جالب دہلوی کے دفتر پہنچے جو رہائشی مکان سے ملا ہوا تھا۔ اڈیٹر صاحب نے کہا ''ہوں تو آپ صحافت سیکھیں گے'' اور کام میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کا وقت ہو گیا۔ اڈیٹر صاحب نے دیکھا کہ وہ لڑکا کھڑا ہوا ہے۔ گھر میں گئے اور اس کے لیے کھانا بھیج دیا۔ دوپہر کے آرام کے بعد آئے تو وہ لڑکا میز کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر کام میں لگ گئے اور شام ہوئی۔ گھر میں سے کھانا آ گیا اور دفتر میں سونے کی اجازت مل گئی۔

تین دن تک وہ لڑکا استاد کی میز کے سامنے کھڑا رہا۔ چوتھے دن استاد نے انگلش کی ایک چھوٹی سی خبر دی کہ اس کا ترجمہ کر لاؤ۔ لڑکا بہت خوش ہوا۔ اس خبر کا ترجمہ کیا۔ استاد کو دیا انہوں نے بغیر پڑھے اس کی پڑیا بنائی اور ردّی کی ٹوکری میں ڈال دی۔ دوسری خبر دی۔ اس کے ترجمے کا بھی وہی حشر ہوا۔ کوئی ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ تب ایک خبر کے ترجمے کی تصحیح کی۔ بین سطور میں لال روشنائی سے تصحیح کی اور وہ خبر چھپی۔ لڑکا بہت خوش ہوا۔ اب ترجمے کے لیے خبریں ملتیں۔ ترجمے کی تصحیح میں سرخ

نوٹ

۱۹۳۶ء کا زمانہ غزل کے لیے پھر ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے کچھ شاعروں نے نئی تکنیک اور نئے تجربوں کو اپنایا تو کچھ نے قدیم روایات کی پابندی پر زور دیا۔ اس تحریک کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی جاری تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات تیزی سے بدل رہے تھے چنانچہ اردو غزل بھی متاثر ہوئی۔ اشترا کی نظریات ادب میں راہ پا گئے۔ ترقی پسند شاعروں کے ایک بڑے گروہ نے ادب کو پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد ملک میں ایک ایسے معاشی نظام کا قیام تھا جس میں دولت کی تقسیم برابر ہو اور انسانیت کا استحصال نہ ہو۔ غزل گو شعراء نے بڑی حد تک ان مقاصد کی تکمیل کا کام غزل سے لیا مگر یکسانیت اور زبردست مقصدیت کے بوجھ کو غزل برداشت نہ کرسکی۔ اس دور کے شعرا میں فراقؔ، مجنوںؔ مجازؔ، مخدومؔ محی الدین، سلامؔ مچھلی شہری، اخترؔ الایمانؔ، مجروحؔ سلطان پوری، غلام ربانی تاباںؔ، علی سردار جعفریؔ، جاں نثار اخترؔ، ساغر نظامی اور فیض احمد فیضؔ وغیرہ اہم ہیں۔ یوں تو ان سب نے غزل کی روایت کو نئے تجربات سے آشنا کیا مگر ان میں فیضؔ اور فراقؔ کی آواز میں زیادہ توانائی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے غزل کو نیا مزاج اور نیا آہنگ دیا۔ فیضؔ نے ٹھہرے ہوئے نرم لہجے میں روایت اور بغاوت کو یکجا کیا۔ ان کی غزل میں فن کارانہ حسن اور شادابی ہے۔ انہوں نے غم و آلام کو بھی شگفتہ لہجہ دیا ہے ؎

صیاد نے پھر در زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
دونوں جہاں تری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
فیضؔ

ہندوستان کی آزادی اور ملک کی تقسیم سیاسی اعتبار سے تو زبردست حادثہ تھا ہی مگر ادبی لحاظ سے بھی یہ بڑا اہم واقعہ ثابت ہوا۔ اردو غزل گو شعرا نے اس دور کے حالات اور کیفیات کو بیان کیا لیکن انہوں نے اس دور کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تحت غزل میں بھی اہم تبدیلیوں کو راہ دی۔ آج دنیا اس قدر وسیع ہو چکی ہے کہ اس میں تجربے کی بڑی موٹی تہیں ہیں اور فکر وخیال کی لا انتہا سمتیں ہیں۔ چنانچہ اس وسعت اور پھیلاؤ نے اردو غزل کو بدل ڈالا۔ اب اس میں ہزار رنگ اور سینکڑوں دشائیں ہیں۔ پرانی تہذیب کی توڑ پھوڑ، نئی تہذیب کا غلبہ، مشینی قوتوں کا بڑھتا ہوا دباؤ ایسی چیزیں ہیں جن کا سامنا آج کے غزل گو شعرا کو کرنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ غزل کا ایک نیا روپ ابھر رہا ہے۔ ناصرؔ کاظمی، ابن انشاؔ، خلیل الرحمان اعظمی، زیبؔ غوری، عمیقؔ حنفی، بانیؔ، زبیرؔ رضوی، مظہرؔ امام، ظفرؔ اقبال، حسنؔ نعیم، ندا فاضلیؔ، شہریار، باقرؔ مہدی، محمد علوی، احمد ندیم قاسمیؔ اور ساقیؔ فاروقی، عرفان صدیقی وغیر غزل کو سنوارنے والوں میں اہمیت رکھتے ہیں۔

اردو غزل کے اس ارتقائی جائزے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ غزل ابتدا سے آج تک مختلف مرحلوں اور مختلف تجربوں سے

نوٹ

کسی اچھے صحافی یا اس سے متعلق اخبار یا رسالے سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بے لاگ لپٹ پوری دیانت سے اپنے قارئین تک خبریں یا مضامین پہنچا سکیں۔

اچھی صحافت کے لیے صاف ستھرا اور غیر جانب دار ہونا ضروری ہے۔ ایسے اخبار یا رسائل صحیح معنوں میں اپنے قارئین کے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔

دیانت دار صحافت، خاص طور پر سیاسی اور سماجی پالیسی کے اخباروں اور رسائل کے لیے آسان نہیں ہے۔ خبروں کو صحیح طور پر پیش کرنا کچھ افراد، گروہ یا حکومت کی ناگواری کو دعوت دے سکتا ہے۔ آزادی سے پہلے حکومت کی نظر اخباروں پر بہت سخت رہتی تھی۔ کچھ اخبار و پر ان کی صاف گوئی پر تنبیہ کی جاتی تھی، ضمانت طلب کر لی جاتی تھی اور پھر حکومت کے خلاف لکھنے پر ضمانت ضبط کر لی جاتی تھی۔ اخبار بند کر دیا جاتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی کو ان کی صحافت کی وجہ سے قید کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد کا اخبار الہلال بند کیا گیا تھا۔ آزادی ملنے کے بعد اب ہندوستان میں پریس یا اخباروں پر وہ پابندی نہیں ہے۔ اخبار اب کھل کر حکومت کے کاموں پر تنقید کر سکتے ہیں۔ لیکن اس آزادی کی بھی ایک حد ہے۔ ایسی خبر جس میں سچائی کم ہو، یا بڑھا چڑھا کر لکھی گئی ہو، جس سے کسی فرد کی توہین ہوتی ہو، وہ اخبار یا صحافی کے لیے مصیبت کھڑی کر سکتی ہے۔ پریس کونسل آف انڈیا ایک نیم سرکاری ادارہ ہے جو اخباروں پر نظر بھی رکھتا ہے اور نامناسب طریقے سے کوئی صحافی یا اخبار مصیبت میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد بھی کرتا ہے۔

اکبر الہ آبادی کا قول ہے۔ گر توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو۔ اخبار رائے عامہ پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے اس کی بہت اہمیت ہے۔ حکومت پریس کے محکمے کے ذریعے اخبارات میں جو کچھ چھپتا ہے اس پر نظر رکھتی ہے اور "کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا" کو جان کر اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرتی ہے۔

اخبارات کی رائے عامہ کی طاقت کے پیش نظر سیاسی جماعتیں، سیاسی افراد یا سماجی گروہ اخبار نکالتے ہیں تا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار اور متاثر کر سکیں۔

صحافت ایک باعزت، مفید اور طاقتور پیشہ ہے۔ صحت مند، دیانتدار صحافت ملک کے اور ملک کے لوگوں کے لیے ترقی کا بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن حکومت کی طرف سے، پریس کونسل کی طرف سے اور عوام کی طرف سے صحت مند صحافت کی ہمت افزائی ہونی چاہیے تا کہ یہ اچھا ہتھیار ذہن اور ہر قسم کی ترقی میں مددگار رہے۔

صحافت ایک باقاعدہ فن ہے۔ اس کے زمرے میں مندرجہ ذیل چیزیں آتی ہیں۔

1. اداریہ
2. رپورٹ تیار کرنا
3. خبریں تیار کرنا

نوٹ

4. اشتہارات کی تیاری
5. سرخی لگانا
6. تبصرہ نویسی
7. انٹرویو
8. فیچر لکھنا

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد آپ جان سکیں گے۔

— رپورٹ کسے کہتے ہیں؟
— رپورٹ کے مختلف پہلو کون سے ہیں؟
— رپورٹ کتنے قسم کی ہوسکتی ہے؟
— رپورٹ کی زبان کیسی ہوتی ہے؟

30A.1 الفاظ اور معنی

خودنوشت	کسی انسان کی زندگی کے واقعات اسی کے ہاتھ سے لکھے گئے ہوں۔ یہ لفظ ''خودنوشت سوانح عمری'' ہے جس کا مخفف 'خودنوشت' ہے۔
تصحیح کرنا	ٹھیک کرنا
مستند	بھروسے کے قابل۔معتبر
کوشاں	کوشش کرتے ہوئے
رسائل	رسالے کی جمع
عجلت	جلدی
آگہی	جانکاری
تعجیل	جلدی
کارہائے نمایاں	بڑے اور اہم کام

نوٹ

بے لاگ لپٹ　　غیر جانبداری

رائے عامہ　　عام لوگوں کی رائے

آپ نے سیکھا؟

1. مشہور صحافی دیوان سنگھ مفتوں نے اپنے شوق سے صحافت سیکھی۔
2. مفتوں کے استاد جناب جالب دہلوی تھے۔
3. صحیفہ اور صحافت ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔
4. وقفۂ اشاعت کے لحاظ سے اخبار اور رسائل کئی طرح کے ہوتے ہیں۔
5. موضوع کے لحاظ سے بھی اخبار اور رسائل کئی طرح کے ہوتے ہیں۔
6. صحافت ایک معزز اور بااثر پیشہ ہے۔

اختتامی سوالات 30A.5

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی میں لکھیے۔

1. جالب صاحب نے دیوان سنگھ سے کئی دن بعد کیوں کام شروع کرایا؟
2. استاد شروع کے ترجموں کو پڑیا بنا کر ردی کی ٹوکری میں کیوں ڈالتے رہے؟
3. وقفۂ اشاعت کے مطابق اخبار اور رسائل کی کون کون قسمیں ہیں؟
4. اخبارات یا رسائل کی پالیسی سے کیا مراد ہے؟
5. صحافی کو تاریخ کا مستند گواہ کیوں کہا گیا ہے؟
6. سالانہ رسائل عام طور پر کیوں شایع کیے جاتے ہیں؟

30A.2 رپورٹ تیار کرنا

کسی واقعے، حادثے، تقریب یا دیگر حقائق کے مؤثر، معروضی اور مکمل بیان کو رپورٹ کہتے ہیں اس میں تمہیدی طور پر حقائق کا پس منظر، مقام، تاریخ، تیاری، اہتمام، مقاصد عوام کی دلچسپی اور شمولیت بیان کرنے کے بعد اصل موضوع پیش کیا جاتا ہے جس میں شریک لوگ اور متعلقہ افراد کا ذکر ہوتا ہے۔ آخر میں تقریب یا واقعہ کے نتائج و اثرات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس طرح

معروضی: کسی چیز کو اس کی اپنی شکل میں پیش کرنا یا دیکھنا

نوٹ

رپورٹ میں تین پہلو شامل ہوتے ہیں، پس منظر، اصل واقعہ اور اثرات۔ رپورٹ مختصر بھی ہوسکتی ہے اور طویل بھی۔ اس کا انحصار واقعہ یا تقریب کی اہمیت اور ضرورت پر ہے۔

کسی تقریب، سیمنار، سمپوزیم کی رپورٹ لکھی جاسکتی ہے۔ اسکول کی تقریبات جیسے پندرہ اگست کی تقریبات، اسکول کی سالانہ تقریبات کی رپورٹ بھی لکھی جاتی ہے۔ اکثر آپ لوگوں نے اخباروں میں کبھی سیلاب کی رپورٹ کبھی کسی ریل حادثہ کی رپورٹ پڑھی ہوگی۔ ہفتہ بھر پارلیامنٹ کے اجلاس میں کیا ہوا اس کی اگر روداد بیان کی جائے تو یہ بھی رپورٹ ہے۔ اسی طرح کھیل کود کے بارے میں رپورٹ لکھی جاتی ہے۔ علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں بھی رپورٹ لکھی جاسکتی ہے۔

رپورٹ کی زبان اور اصطلاحات رپورٹ کے موضوع کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں۔

اصطلاحات: کسی لفظ یا الفاظ کو اس کے اسی معنی کے بجائے کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنا اور سمجھنا

رپورٹ کئی طرح کی ہوسکتی ہیں جیسے

- واقعاتی یا حادثاتی رپورٹ
- تحقیقاتی رپورٹ
- تجزیاتی رپورٹ
- تاثراتی رپورٹ
- افواہی رپورٹ

ان سب میں سب سے آسان اور عام واقعاتی رپورٹ ہے۔ اس میں دیکھ کر سُن کر اور کبھی کبھی سوالات کر کے مواد حاصل کیا جاتا ہے۔

آیئے ہم مختلف رپورٹوں کے نمونے دیکھیں۔

نمونہ رپورٹ نمبر-1

سویتا رانی اور عید ملن

۱۱ر جنوری، دہلی پبلک ویلفیئر کمیٹی کی طرف سے منعقد عید ملن کی تقریب میں سویتا رانی شرکت کے لیے تشریف لائیں۔ کمیٹی کے ممبران کے علاوہ اس تقریب میں شہر کے اہم افراد اور صحافی شریک تھے۔ عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تقریب کا آغاز بچوں نے ایک گیت سے کیا جو قومی یکجہتی سے متعلق تھا۔ سویتا جی بہت خوش تھیں اور مسکرا کر لوگوں سے مل رہی تھیں۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر کچھ لوگوں نے سویتا جی سے سیاسی سوالات کرنا شروع کر دیئے جسے انہوں نے پسند نہیں کیا اور لوگوں کو ٹالنا چاہا۔ لوگ وزیراعلیٰ کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جب سوالات اور شور بہت بڑھ گیا تو کمیٹی کے ذمہ داران تقریب ختم ہونے سے پہلے انہیں وہاں سے واپس لے گئے۔ تقریب میں آئے ہوئے لوگ بہت مایوس دکھائی دے رہے تھے اور عید ملن کی تقریب کو

نوٹ

سیاسی رنگ دینے پر اعتراض کر رہے تھے۔

نمونہ رپورٹ نمبر-2

کمزور طبقات کے بچوں کو اچھی تعلیم دینے کی سخت ضرورت

ہندستان کے وزیر اعظم نے کہا کہ ملک کے بہتر مستقبل کے لیے سماج کے کمزور طبقات کو اچھی تعلیم دینے کی سخت ضرورت ہے۔ انہوں نے اساتذہ کے ایک ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو بہتر تعلیم مہیا کرائی جانی چاہیے کیونکہ اس سے سماجی بُرائی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ غریب بچوں کو جتنی اچھی تعلیم دی جائے گی، ملک کا مستقبل اتنا ہی زیادہ تابناک ہوگا۔

وزیر اعظم نے مہاتما گاندھی کی ''ایچ وَن ٹیچ وَن'' کی اپیل کو دہراتے ہوئے کہا کہ یہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبا، میں اس فکر کو فروغ دیں کہ ہر طالب علم ایک اَن پڑھ شخص کو تعلیم دے۔ انہوں نے غیر سرکاری تنظیموں سے زور دے کر کہا کہ وہ ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے آگے آئیں کیونکہ حکومت تنہا اس کام کو نہیں کر سکتی۔
وزیر اعظم نے مزید کہا کہ جب لوگوں میں تعلیم عام ہو جائے گی تو سماج کی بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے میں آسانی ہوگی اور سماج کی دوسری برائیوں کو دور کرنے کے لیے بیداری پیدا ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ کیرالا میں اس بات کا ثبوت موجود ہے۔ وہاں پر 100 فیصد تعلیم ہے جس کی وجہ سے آبادی میں صرف 1.2 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آئین کے آرٹیکل 45 کے مطابق سبھی ریاستوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ 14 برس کی عمر کے بچوں کو مفت تعلیم مہیا کرائیں۔ اور آئین کی 60ویں ترمیم کے مطابق ہر صوبائی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے

نمونہ رپورٹ نمبر-3

جامعہ کا تربیتی پروگرام برائے اردو اساتذہ

۱۱رجنوری ۱۰ر بجے صبح۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں ۲۱ روزہ پروگرام کا افتتاح وائس چانسلر کی صدارت میں ہوا۔ ڈین فیکلٹی تعلیم نے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سلامت اللہ کا استقبال کرتے ہوئے ان کے تعلیمی کارناموں پر روشنی ڈالی اور ان تمام اساتذہ کا بھی استقبال کیا جو دہلی کے مختلف اسکولوں سے اس پروگرام میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ شعبہ کے صدر نے تربیتی پروگرام کی تفصیلات بتاتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد واضح کیے۔ مہمان خصوصی نے اس پروگرام میں مدعو کیے جانے پر شکریہ ادا کیا اور مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے اردو کی تدریس کے لیے جدید طریقہ اور تکنیک کو استعمال کرنے کی

نوٹ

ضرورت پر روشنی ڈالی اور اس قسم کے تربیتی پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ منعقد کرنے کی اہمیت کو واضح کیا۔ صدر جلسہ کے شکریہ کے کلمات سے جلسہ کا اختتام ہوا۔

30A.3 حادثاتی رپوٹ

رپورٹ نمبر-4

پنک لائنس بس کی زد میں آکر طالب علم کی موت

نئی دہلی۔۱۲رجنوری

مغربی دہلی کے وکاس پوری علاقہ میں آج ایک تیز رفتار بس کے پہیے کی زد میں آکر ایک اسکولی بچے کی موت ہوگئی۔ خادثہ کے بعد لوگوں نے بس میں آگ لگادی۔ طالب علم کا نام پنکج شرما ہے بس ڈرائیور کو بعد میں گرفتار کرلیا گیا۔ پولس کے مطابق آج دوپہر ایک بجے اتم نگر سے IX کلاس میں پڑھنے والا طالب علم پنکج سائیکل سے گھر آرہا تھا۔ پنکھا روڈ سی پوائنٹ کے قریب تیز رفتار سے آرہی پنک لائن بس نے اس کو پیچھے سے ٹکر ماردی جس کی وجہ سے پنکج کا سر بس کے پہیے کے نیچے آگیا اور موقع پر ہی اس کی موت ہوگئی۔ یہ بس روٹ نمبر 883 کی ہے۔ موقعۂ واردات پر کافی لوگ اکٹھا ہوگئے اور انہوں نے بس میں آگ لگادی۔ اطلاع ملتے ہی پولس موقع پر پہنچ گئی اور کسی طرح اس نے بھیڑ پر قابو پایا۔ بعد میں بس ڈرائیور ایشور سنگھ کو گرفتار کرلیا گیا۔ پنکج شرما پرتاپ گارڈن علاقہ میں رہتا تھا۔ اس کے باپ کا نام پی ڈی شرما ہے۔ معاملہ کی تفتیش جاری ہے۔

30A.4 رپورٹ نمبر-5

کھیل کود سے متعلق رپورٹ کا ایک نمونہ دیکھئے

ہند کے خلاف آسٹریلیائی محنت پر پانی پڑ گیا

ملبورن ۲۷ردسمبر۔ آسٹریلیا اور ہندوستان کے درمیان دوسرے کرکٹ ٹسٹ کے دوسرے دن کا کھیل آج بارش کی وجہ سے وقت سے پہلے ختم کردینا پڑا جب کہ میزبان ٹیم نے پہلی انگز میں 5 وکٹ کے نقصان پر 332 رن بنالیے تھے۔ ملبورن کرکٹ گراؤنڈ میں کھیلے جارہے ٹسٹ کو آج چائے کے وقفے سے ذرا پہلے اس وقت روک دینا پڑا جب زور

نوٹ

دار بارش شروع ہوگئی اور پورا میدان جل تھل ہوگیا۔ میچ کے عہدے داران بقیہ تین دنوں میں روزانہ طے شدہ وقت میں ایک گھنٹہ کا اضافہ کرنے پر رضا مند ہوگئے تاکہ برباد وقت کو پورا کیا جاسکے۔ کھیل کے پہلے دن کا بیشتر وقت بھی بارش کی نظر ہوگیا تھا۔ کل کے 3 وکٹ پر 138 رن سے آگے کھیلتے ہوئے آج آسٹریلیا نے اسکور میں 194 رن کا اضافہ کیا یاد رہے آسٹریلیا پہلا ٹسٹ 285 رن سے جیت چکا ہے۔ تیسرا اور آخری ٹسٹ سڈنی میں 2 جنوری سے کھیلا جائے گا۔

متن پر سوالات 30A.1

مندرجہ ذیل بیانات میں سے درست جواب پر صحیح (ü) کا نشان لگائیے۔

1. رپورٹ میں بنیادی طور پر تین پہلو شامل ہوتے ہیں۔
   الف) زبان، تصاویر اور کہانی۔
   ب) خوشخطی، افراد اور دلچسپی۔
   ج) اصل واقعہ، پس منظر اور اثرات۔

2. رپورٹ میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔
   الف) مقام، وقت اور تاریخ کو دی جاتی ہے۔
   ب) اصل موضوع کو دی جاتیہے۔
   ج) واقعہ کے نتائج و اثرات کو دی جاتی ہے۔

3. رپورٹ میں زبان
   الف) موضوع سے ہٹ کر استعمال ہوتی ہے۔
   ب) موضوع کے اعتبار سے استعمال ہوتی ہے۔
   ج) کبھی موضوع کے اعتبار سے استعمال ہوتی ہے۔
   کبھی موضوع کا خیال نہ کر کے بھی زبان استعمال ہوتی ہے۔

4. رپورٹ کی سب سے بڑی خوبی
   الف) طوالت ہے۔
   ب) معروضیت ہے۔

نوٹ

ج) اختصار۔

آپ نے کیا سیکھا؟

— رپورٹ میں مقام، تاریخ اور اصل حقائق کے بارے میں لکھتے ہیں۔
— رپورٹ میں حقائق کا پس منظر بھی بیان کرتے ہیں۔
— رپورٹ میں حقائق سے متعلق افراد کے تاثرات بھی لکھتے ہیں۔
— رپورٹ کی زبان ایسی آسان ہوتی ہے جو سب کی سمجھ میں آجائے۔

30A.10 اختتامی سوالات

1. اسکول کی کسی تقریب کی مختصر رپورٹ لکھئے۔
2. اپنے گھر کی کسی تقریب کو رپورٹ کی شکل میں بیان کیجئے جیسے شادی کی تقریب، عید کی تقریب۔
3. اپنے گھر کے آس پاس کی کسی تقریب کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کیجئے۔
4. آپ نے کبھی کوئی سائیکل یا رکشہ یا بس کی ٹکر دیکھی ہوگی، اس کی رپورٹ لکھئے۔

متن پر سوالات کے جوابات

30A.1 1. ج
2. ب
3. ب
4. ب

نوٹ

30B

اخباری انٹرویو

مقاصد

اس سبق کو پڑھ لینے کے بعد آپ

1. انٹرویو کسے کہتے ہیں، یہ جان سکیں گے۔
2. مقاصد کے اعتبار سے انٹرویو کی کتنی قسمیں ہیں، اس سے واقف ہو سکیں گے۔
3. انٹرویو لینے والوں میں کیا صلاحیتیں ہونی چاہئیں اور انٹرویو لینے کا کیا طریقہ ہے، اس کا اندازہ کر سکیں گے۔
4. انٹرویو لینے کے بعد اُسے کس ترتیب سے تحریر کیا جائے گا، یہ جان سکیں گے۔
5. سوالات کے جواب دے سکیں گے۔

تعارف

کسی مسئلے یا واقعے سے متعلق اہم شخصیتوں یا منتخب افراد کے خیالات جاننے کی غرض سے جو بات چیت اُن سے ہوتی ہے اُسے انٹرویو کہتے ہیں۔ شخصیت چاہے وہ مدیر ہو یا شاعر و ادیب، سائنسداں ہو یا صنعت کار یا سیاستداں انٹرویو کے ذریعے ہم اس کے ذہن کو پڑھ سکتے ہیں۔

نوٹ

انٹرویو کے ذریعے اہم شخصیتوں سے ایسی دلچسپ باتیں معلوم ہوجاتی ہیں جو عموماً دیگر طریقوں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ انٹرویو معمولی کسان، قلی اور موچی سے بھی لیا جاسکتا ہے تاکہ سماج کے پسماندہ طبقوں کے افراد کے مسائل کا اندازہ ہوسکے۔ اخباری انٹرویو کا آغاز امریکہ میں انیسویں صدی کے وسط میں مشہور صحافی جیمز گورڈن بینٹ (James Gordon Bennet) نے کیا۔

30B.1 مقاصد کے اعتبار سے انٹرویو کی تین قسمیں ہیں

1. انٹرویو برائے حقائق

کوئی واقعہ، واردات ہوجانے پر صحافی بعد میں موقع پر پہنچ کر چشم دید گواہوں سے رابطہ قائم کرتا ہے اور 'ک' سے شروع ہونے والے چند سوالات کی روشنی میں ان سے گفتگو کرتا ہے۔ اُسے نہ صرف گواہوں کے نام پتے درج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ان کے نام استعمال کرنے کی اجازت بھی طلب کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو ایک چشم دید گواہ لکھ کر کام چلا لیا جاتا ہے۔ اگر ان کے نام پہلے ہی پولس ریکارڈ میں آچکے ہیں تو پھر انہیں اجازت دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص کسی خاص وجہ سے خبروں میں آجاتا ہے تو متعلقہ معاملے میں اُس کے نقطۂ نظر سے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری افسر، کارپوریشن کے ذمہ دار عہدہ دار، مزدور لیڈر اور وزیر وغیرہ اخباری نمائندوں کو جواب دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ متنازعہ معاملات میں دونوں فریقوں سے بات کر کے کوئی نتیجہ نکالا جاتا ہے۔

2. انٹرویو برائے رائے

کوئی اطلاع مل جانے پر متعلقہ حکام اور افسروں کی رائے جاننے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ مثلاً کسی بڑی سیاسی تبدیلی، نئی ایجاد یا سائنسی تجربے پر ماہرین کی رائے کی بڑی اہمیت ہوگی۔ جیسے ابھی دو سال پہلے ہندوستان کی طرف سے پوکرن میں سلسلہ وار نیوکلیائی تجربوں کے بعد صحافیوں نے تکنیکی ماہرین اور سیاسی مبصروں کو انٹرویو کے لیے گھیر لیا تھا۔

3. شخصی انٹرویو

اہم شخصیتوں کے انٹرویو پہلے صرف روزناموں میں شایع ہوتے تھے لیکن اب ہفت روزوں اور رسالوں میں بھی اس طرح کے انٹرویو شایع ہونے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قارئین اپنی پسندیدہ شخصیتوں کے انٹرویو انہی اخبارات و رسائل میں پڑھنا چاہتے ہیں جنہیں وہ خود خریدتے ہیں۔

شخصی انٹرویو میں حقائق بھی ہوتے ہیں اور رائے بھی۔ عام طور سے ایسے انٹرویو متعلقہ شخصیت کی نمایاں تصویر کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی شخصی انٹرویو بعض ایسے لوگوں سے لیے جاتے ہیں جو اچانک شہرت حاصل کر لیتے ہیں اور اسی وجہ سے لوگ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً کسی نے ہمالیہ کی چوٹی سر کی، کسی کو کھیل کے میدان میں بڑا انعام مل گیا اور کوئی فوجی بغاوت کے بعد ملک کا حکمراں بن گیا تو ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیل فراہم کرنا صحافی کا فرض ہو جاتا ہے۔ اس انٹرویو میں متعلقہ شخص کی پہلی زندگی کے بارے میں بھی خاصی تفصیل ہوتی ہے۔ شخصی انٹرویو بعض عام افراد کے بھی لیے جا سکتے ہیں جیسے موت کے کنویں میں سائیکل چلانے والا شخص سائیکل پر دنیا کا چکر لگانے والا طالب علم، سانپوں اور بچھوؤں کے درمیان تین دن گزارنے والا انسان، پانی پر چلنے والا سادھو وغیرہ۔

اخباری نامہ نگار تازہ ترین خبروں کے لیے کسی افسر، وزیر یا سفیر سے بھی کسی واقعے کے بعد فوراً ملاقات کرتے ہیں۔ ملاقات عموماً مختصر ہوتی ہے جو ریلوے ویٹنگ روم میں، ہوائی اڈے یا وی آئی پی لاؤنجوں میں ہوتی ہے۔ مختصر سوالات کے ذریعے کسی اہم معاملہ پر ان کی رائے مانگی جاتی ہے۔

متن پر سوالات 30B.1

ذیل کے سوالات میں خالی جگہ کو متن میں آئے مناسب الفاظ سے بھریئے۔

1. انٹرویو کے ذریعے اہم شخصیتوں سے ..... معلوم ہو جاتی ہیں۔ (   )
(بیکار تفصیل، جھوٹی باتیں، خفیہ خبریں، دلچسپ باتیں)

2. اخباری انٹرویو کی ابتدا.... میں ہوئی۔ (   )
(انگلینڈ، سویڈین، امریکہ، جرمنی)

3. صحافی گواہوں سے .... کی روشنی میں گفتگو کرتا ہے۔ (   )
(سنی سنائی باتوں، واقعے کے ثبوتوں، 'ک' سے شروع ہونے والے سوالوں)

4. ہندوستان کے نیوکلیائی تجربوں کے بعد صحافیوں نے تکنیکی ماہرین کو.... گھیر لیا۔ (   )
(ستانے کے لیے، انٹرویو کے لیے، استقبال کرنے کے لیے)

30B.2 انٹرویو لینے کا طریقہ

نامہ نگاری کی طرح انٹرویو لینا بھی ایک صحافیانہ فن ہے کیونکہ جتنا بڑا آدمی ہوگا اُتنا ہی اُسے انٹرویو کے لیے آمادہ کرنا مشکل

نوٹ

ہوگا۔ بند زبانوں کو کھلوانے اور کم گولوگوں کو تیز گفتار بنانے کے لیے ذہانت کی ضرورت ہوگی۔ ہر نامہ نگار موقع کی مناسبت سے انٹرویو کے الگ الگ طریقے اپناتا ہے۔ یہ طریقے کیا ہوں گے اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انٹرویو کس سے لیا جارہا ہے اور انٹرویو لینے والے کی ذہنی سطح کیا ہے۔ مثلاً جو طریقہ صدرِ مملکت سے انٹرویو کے لیے اختیار کیا جائے گا وہ کسی مشہور موسیقار یا اداکار کے انٹرویو میں درست نہیں۔ ہوگا۔ سرکاری افسروں سے بات کرتے وقت جو لہجہ ہوگا، مرکزی وزیر سے گفتگو کے لہجے سے مختلف ہوگا۔ غرضیکہ طریقۂ گفتگو، انٹرویو کے لیے دیا جانے والا وقت، سوالات کی نوعیت ان سب کا تعین، خاص صورت حال کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔

کسی بھی شخص سے رسمی انٹرویو لینے سے پہلے اُس کے بارے میں جتنی معلومات مل سکتی ہیں وہ جمع کر لی جائیں۔ اہم شخصیتوں کی تفصیل Who is Who جیسی ڈائرکٹریوں میں مل جاتی ہے۔ دیگر لوگوں کے بارے میں ان کے ماتحتوں، پڑوسیوں اور دوستوں سے معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ان ذیلی معلومات کے لیے متعلقہ شخص کا وقت خراب نہ کیا جائے۔ ایک فائدہ اس طرح کی معلومات کی فراہمی سے یہ ہوتا ہے کہ اس کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ ملنسار ہے یا آدم بیزار، سخت ہے یا نرم ایسے سوالات نہ پوچھے جائیں جس کے جواب انٹرویو لینے والے کے پاس پہلے سے موجود نہ ہوں۔ انٹرویو لینے والا متعلقہ شخصیت کے جوابات لکھنے میں اتنا مصروف نہ ہو جائے کہ گفتگو کا لطف ختم ہو جائے۔ صحافی کم سے کم بولے اور متعلقہ شخص کو بولنے کا موقع زیادہ دیا جائے۔ اور بہتر ہے کہ ٹیپ ریکارڈر استعمال کیا جائے۔ انٹرویو میں بات چیت کا سلسلہ دوستانہ ماحول میں آگے بڑھنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ متعلقہ شخص کسی بات کا جواب دینے میں کوئی بوجھ محسوس کرے۔ اگر انٹرویو لینے والے کی توقع پر انٹرویو پورا نہ اُترے تب بھی انٹرویو لینے والا اپنی بے چینی کا اظہار نہ کرے۔ بلکہ شائستہ انداز میں اُسے اپنے موضوع پر قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ اگر انٹرویو لینے والا اپنے سامنے والے شخص کی بات کو محض سنتا رہے تو بھی لطف نہیں آتا۔ اُسے چاہیے کہ وہ جوابات کے درمیان دلچسپی قائم رکھنے کے لیے مختلف نوعیت کے سوال کرتا رہے تا کہ یکسانیت کی وجہ سے اُکتاہٹ نہ پیدا ہو اور انٹرویو دینے والے کو انٹرویو لینے والے کی عدم دلچسپی کا گمان نہ ہو۔ انٹرویو لینے والا نہ تو بہت باتونی ہو اور نہ ہی خاموش، اُسے اعتدال پسند ہونا چاہیے۔

متن پر سوالات 30B.2

نیچے لکھے بیانات میں درست بیان پر صحیح (✓) کا نشان لگائیں۔

.1 اہم شخصیتوں کے انٹرویو اب ہفت روزوں اور رسالوں میں بھی شایع ہونے لگے ہیں۔ (   )

.2 اچانک رونما ہونے واقعات سے قارئین کو واقف کرانا صحافی کا فرض نہیں ہے۔ (   )

نوٹ

3. بڑی سیاسی تبدیلی، ایجاد یا سائنسی تجربے پر ماہرین کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ (   )

4. اخباری نامہ نگار وزیروں اور سفیروں سے ان کے غیر ملک کے دورے کے کئی ماہ بعد ملاقات کرتے ہیں۔ (   )

3۔صحافی کو اپنا شناختی کارڈ ضرور ساتھ رکھنا چاہیے۔ وہ طے شدہ جگہ پر پہنچنے میں وقت کی پابندی کرے۔انٹرویو صحافی کے لیے بھی آزمائش ہے۔ جس طرح فوٹو گرافر کبھی خراب تصویر بھی کھینچ سکتا ہے اس طرح صحافی بھی پھس پھسا اور بے مزہ انٹرویو لے سکتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ اُس نے اپنے سوالات صحیح طریقے سے ترتیب نہیں دیئے۔ اُسے ذہنی طور پر تیار رہنے کے ساتھ قلم کاغذ، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ جیسے ضروری سامان بھی اپنے ساتھ رکھنے ہوں گے۔ انٹرویو کے خاتمے پر صحافی اچھے الفاظ میں انٹرویو دینے والے کا شکریہ ادا کرے۔

30B.3 انٹرویو نویسی

انٹرویو لینے والا ہی اپنے نوٹس کی مدد سے انٹرویو تحریر کرتا ہے، نہ کہ کوئی اور شخص۔ خبروں کی طرح انٹرویو میں بھی ابتدائیہ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ جو بات انٹرویو میں اہم ترین ہے اُسی کو پہلے پیراگراف میں لکھا جائے گا۔ انٹرویو سوال و جواب کی شکل میں بھی تحریر کیا جاتا ہے اور مسلسل عبارت میں بھی۔ ضروری نہیں کہ ہر وہ بات تحریر میں لائی جائے جو انٹرویو کے دوران کہی گئی ہو۔ ابتدائیہ کی نوعیت کا انحصار بھی انٹرویو دینے والے کی شخصیت اور اس کے رُتبے پر ہوتا ہے۔ جہاں بیان اہم ہو وہاں بیان کو پہلے تحریر کیا جائے گا اور جہاں شخصیت اہم ہو وہاں شخصیت کا ذکر پہلے کیا جائے گا۔ جس جگہ اور وقت پر انٹرویو لیا گیا ہو اس کا بھی حوالہ دینا اچھا رہتا ہے۔ انٹرویو دینے والے نے کون سی بات زور دے کر کہی اس کی بھی نشان دہی کر دی جائے۔ انٹرویو دینے والا بعض باتیں ''آف دی ریکارڈ'' کہتا ہے جسے شایع کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ انٹرویو لینے والے کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ اس حصے کو نہ چھاپے۔

متن پر سوالات 30B.3

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیں۔

کامیاب انٹرویو لینے والا

1. ہر انٹرویو دینے والے کے ساتھ یکساں لہجہ اختیار کرتا ہے۔ (   )

2. انٹرویو دینے والی شخصیت کی ذاتی تفصیلات پہلے سے نہیں جمع کرتا۔ (   )

3. انٹرویو کے دوران خود زیادہ بولتا ہے اور انٹرویو دینے والے کو بولنے کا موقع کم دیتا ہے۔ (   )

نوٹ

4. انٹرویو دینے والا جو باتیں ''آف دی ریکارڈ'' کہتا ہے اُسے انٹرویو لینے والا نہ چھاپ کر اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ (   )

آپ نے کیا سیکھا؟

1. انٹرویو کسی مسئلہ پر کسی بڑی شخصیت یا لوگوں کے گروہ کے خیالات جاننے کی غرض سے لیا جاتا ہے اور اس سے بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جو عام ذرائع سے نہیں معلوم ہوتیں۔
2. مقاصد کے اعتبار سے انٹرویو کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔
   (1) انٹرویو برائے حقائق (2) انٹرویو برائے رائے اور (3) شخصی انٹرویو
3. شخصی انٹرویو صرف اہم شخصیتوں سے ہی نہیں بلکہ معمولی حیثیت کے ان لوگوں سے بھی لیے جا سکتے ہیں جنہیں اچانک شہرت مل جائے مثلاً کسی مہم میں کامیاب ہونے والا شخص، تماشہ یا کرتب دکھانے والا۔
4. انٹرویو لینے والا اس کا خاص خیال رکھتا ہے کہ وہ انٹرویو دینے والے شخص کے مرتبے اور مقام کے مطابق انٹرویو کے دوران سوالات کرے، وقت اور جگہ کا تعین کرے اور غیر ضروری سوالات میں وقت نہ ضائع کرے۔
5. انٹرویو لینے والا شخص اپنے نوٹس کی مدد سے انٹرویو کو تحریر کرتا ہے۔ یہ کام کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ انٹرویو تحریر کرتے وقت جو بات سب سے اہم ہوتی ہے اُسے سب سے پہلے پیراگراف میں لکھا جاتا ہے۔

30B.7 اختتامی سوالات

1. کیا انٹرویو صرف اہم شخصیتوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ تین جملوں میں جواب دیجئے؟
2. مقصد کے اعتبار سے انٹرویو کی کتنی قسمیں ہیں؟
3. شخصی انٹرویو کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ اس پر ایک پیراگراف لکھئے۔
4. انٹرویو کا مسودہ تیار کرتے ہوئے کن باتوں کی طرف دھیان دینا چاہیے۔

30.B.8 متن کے سوالات کے صحیح جوابات

30B.1	i.	(3)
	ii.	(3)

نوٹ

اخباری انٹرویو

.iii (3)

.iv (2)

30B.2 .i (✓)

.ii (x)

.iii (x)

.iv (x)

30B.3 .i (x)

.ii (x)

.iii (x)

.iv (✓)

نوٹ

31A

اداریہ

اداریہ کا تعارف

آپ اداریہ کسی بھی اخبار یا رسالے کے مدیر کی کسی اہم موضوع پر رائے کا اظہار ہے جو اس کے اخبار یا رسالے میں نمایاں جگہ پر مختصر مضمون کی شکل میں شایع ہوتا ہے۔ اداریہ عام طور پر اخبار یا رسالے میں اخبار کے نام کے نیچے چھپتا ہے۔ اداریہ میں اظہار کی گئی رائے مدیر کے علاوہ اخبار کے مالکان کی بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل اداریہ مدیر کے نام سے ضرور شایع ہوتا ہے لیکن اس میں اخبار کے سارے اہم عہدے داروں کی رائے شامل ہوتی ہے اسی لیے اداریے میں کبھی میری رائے اور میرا خیال جیسے الفاظ نہ استعمال ہو کر ''ہماری رائے'' اور ''ہمارا خیال'' جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ بڑے اخباروں میں تو باقاعدہ اداریاتی بورڈ آپس میں بیٹھ کر بات چیت کے ذریعہ یہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ کون سے موضوعات پر کل کے اخبار میں اداریہ لکھنا ہے۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بورڈ کے صحافی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح آپس کے تبادلۂ خیال کے بعد ہی اداریہ کی پہلی شکل سامنے آجاتی ہے۔ پھر عموماً مدیرِ اعلیٰ کو نظر ثانی کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ ان کی منظوری کے بعد اشاعت کے لیے تیار سمجھا جاتا ہے۔

نظر ثانی: دوبارہ نظر ڈالنا

اداریے میں جن موضوعات پر رائے دی جاتی ہے، وہ بہت جچی تلی ہوتی ہے اور اس سے اخبار کے رویّے، رجحان اور نظریہ کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ اداریے میں رائے کے علاوہ اہم خبروں کا تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ کبھی کچھ مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کئی معاملات کی وضاحت کی جاتی ہے کبھی کبھی عام طور پر قاری کے سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کا مفہوم بھی سمجھایا جاتا ہے۔

قاری: پڑھنے والا

نوٹ

اداریہ کی اپنی ایک واضح شکل ہوتی ہے۔سب سے پہلے زیر بحث مسئلے یا موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے۔اس کے بعد مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے۔دلائل اور جوابی دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور آخر میں نتیجۂ رائے یا یا فیصلہ دیا جاتا ہے۔اس طرح اداریہ لکھنے کے تین مرحلے سامنے آئے۔موضوع کا انتخاب،غور وخوض اور اداریہ لکھنے کا عمل۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ بتائیں گے کہ

— اداریہ کسے کہتے ہیں

— اداریہ کو کون لکھتا ہے،اس میں مدیر کے علاوہ اور کس کی رائے شامل ہوتی ہے۔

— اداریہ لکھنے کے لیے کس قسم کی زبان استعمال کی جاتی ہے۔

— اداریے کے اقسام کون کون سے ہیں۔

— اداریہ لکھنے سے پہلے کن باتوں کو دھیان میں رکھنا ہوگا۔

31A.1 اداریہ لکھنے کے لیے دھیان دینے والی باتیں

آپ نے جان لیا کہ اداریہ کسے کہتے ہیں۔آپ جب اداریہ لکھیں تو کن کن باتوں کو دھیان میں رکھیں گے۔آیئے دیکھیں۔

— اداریہ لکھنا ایک فن ہے اس لیے اس فن کے تمام نکات اور باریکیوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

— اداریہ لکھتے وقت آسان اور ایسی عام فہم زبان کا استعمال کرنا چاہیے جو سب کی سمجھ میں آسکے۔

— اظہار بیان میں روانی اور اثر ہو۔

— اداریہ بہت طویل نہیں ہونا چاہیے بلکہ مختصر ہو ورنہ قاری اسے پڑھنا نہیں چاہے گا یا درمیان میں آدھا پڑھ کر چھوڑ دے گا۔

— اداریہ کے ذریعے آپ قاری تک کیا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں،یہ مقصد واضح ہونا چاہیے۔

— موضوعات میں وسعت ہو یعنی ہر روز نئے نئے اور ہر قسم کے قاری کی پسند اور ناپسند کو دھیان میں رکھ کر موضوعات کا انتخاب کیا جائے۔

— اداریہ میں اپنی رائے،دلیل اور حقائق کے ساتھ ظاہر کریں۔

— اداریہ ایسا ہو جو قارئین کو صحیح راہ دکھائے،گمراہ نہ کرے۔

— اداریہ میں رائے عامہ پر اثر ڈالنے کی قوت ہونی چاہیے۔

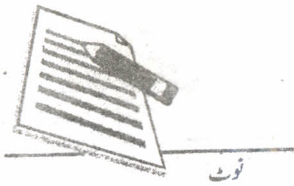

نوٹ

— حقائق کو واضح کرنے کے لیے ضرورت پڑے تو اعداد و شمار کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

— سچائی اور ایمان داری سے بات کہنی چاہیے۔

— کسی موضوع یا مسئلہ پر اظہار خیال کرتے وقت اداریہ کا لب و لہجہ بہت سخت نہیں ہونا چاہیے بلکہ درمیانی یا اعتدال کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

— اداریہ کی سرخی بہت پُرکشش ہونی چاہیے اور موضوع سے جڑی ہوئی ہونا چاہیے۔

— اداریہ غیر جذباتی ہو کر لکھنا چاہیے۔

— اداریہ لکھتے وقت غیر جانب داری کے اصول کو اپنانا چاہیے اور اپنا نظریہ قائم رکھتے ہوئے دوسروں کے نظریات کا اعتراف کرنا چاہیے۔

31A.2 اداریے کے اقسام

موضوع کے اعتبار سے عام طور پر اداریے کو چار قسموں میں بانٹ سکتے ہیں۔

خبری یا اطلاعاتی اداریے

خبری اداریہ میں پہلے حصہ میں خبر کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔ دوسرے حصہ میں اس پر بحث کی جاتی ہے اور آخری میں معاملہ کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس طرح کے اداریے میں عموماً کوئی رائے نہیں پیش کی جاتی۔

تاثراتی اداریے

اس طرح کے اداریے میں مدیر (ایڈیٹر) اپنی رائے کو دلائل اور ربط کے ساتھ قاری کے سامنے رکھتا ہے اور قاری کی رائے کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کرنے کی مدیر کو پوری آزادی حاصل ہے۔ اس قسم کے اداریہ میں کسی واقعہ یا حادثہ کے بُرے اثرات کو کم کرنے کے لیے یا کسی اچھی بات یا خیال کو عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو قبول کروانے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔

لطف اندوزی کے اداریے

سماج میں جب کبھی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس میں انسانی دلچسپی کا موضوع بہت نمایاں رہتا ہے اور عوام میں اس پر عام طور پر گفتگو ہونے لگتی ہے تو مدیر بھی ہلکے پھلکے انداز میں ایسے اداریے لکھتے ہیں جس سے قارئین کی تفریح ہو جائے۔ ایسے اداریے میں طنز و مزاح شامل ہوتا ہے اور قاری بغیر مسکرائے اسے نہیں پڑھ سکتا۔ کبھی کبھی کسی سماجی برائی پر دھیمے سے طنز بھی کر دیا جاتا ہے اور مذاق مذاق میں کام کی بات نکل آتی ہے۔

نوٹ

خصوصی مواقع کے اداریے

کسی قومی دن، قومی شخصیتوں کی سالگرہ یا برسی یا موت یا کسی بڑی شخصیت کے استقبال کے بارے میں جو اداریے لکھے جاتے ہیں، انہیں خصوصی مواقع کے اداریے کہتے ہیں۔

تاثراتی اداریہ کا نمونہ

اکیسویں صدی کے تقاضے اور مطالبات

بیسویں صدی تعلیمی فتوحات اور تسخیر کائنات کے دعوے کے ساتھ رخصت ہو چکی ہے اور اکیسویں صدی کا آفتاب اپنے نئے عہد کے مطالبات اور تقاضے کے ساتھ پورے آب و تاب سے طلوع ہو چکا ہے۔ چنانچہ دنیا کی زندہ اور جہاں ساز قومیں اس نئی صدی میں پیش آنے والے چیلنجوں کا مقابلہ اور دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کوششوں میں لگ گئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اکیسویں صدی کا چیلنج کیا ہے؟ اسے متعین کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آج دنیا میں کیا بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور کیوں؟ بنیادی تبدیلیاں تین طرح کی ہو رہی ہیں۔ اوّلاً عالم کاری (Globalisation)، دوم لامرکزیت (Decentralisation) اور سوم علمی دھماکہ (Knowledge Explosion) جن کی پشت پر دیگر عوامل کے ساتھ دو عظیم عالمی جنگوں کے نتائج کے علاوہ تین جدید ترین سائنسی دریافتوں نے حال کو دگرگوں اور مستقبل کی کایا پلٹ کر دینے کا تہیہ کر رکھا ہے اور وہ ہیں:

1. نیوکلیائی ٹکنالوجی (Nuclear Technology)
2. حیاتی ٹکنالوجی (Bio-Technology) اور
3. مائیکرو ٹکنالوجی (Micro-Technology)

چنانچہ انسان چاند ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے بعد بحر و بر کی گہرائیوں کو کھنگال چکا۔ جینی ٹک سائنس (Genetic Science) اور ڈی این اے (DNA) کی کیفیات کو معلوم کر کے ہر جاندار کی بناوٹ اور خصلت کا راز داں ہی نہیں بن گیا بلکہ کلوننگ کے ذریعے ''ڈولی'' وغیرہ کی تخلیقِ جدید کا بھی مظاہرہ کر چکا ہے۔ مائیکرو ٹکنالوجی کے ذریعے کمپیوٹر، سیٹلائٹ اور انٹرنیٹ نے زندگی جس طرح سمیٹ کر رکھ دی ہے، اس کے اثرات انتہائی تیزی سے گھر گھر پہنچنے لگے ہیں۔

چنانچہ یہی وقت ہے کہ ہم مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے ذریعے اواخر بیسویں صدی میں اکیسویں صدی کی منصوبہ سازی مکمل کر لیں، بالکل اسی طرح جس طرح سر سید نے اواخر انیسویں صدی میں بیسویں صدی کی منصوبہ بندی کر کے اپنی اور اپنے حلقۂ احباب کی ساری صلاحیتوں کو جھونک دیا جس کے نتیجے میں ملک و ملت ان کے شیریں ثمرات سے آج تک مستفیض ہو رہی ہے۔

نوٹ

رواں صدی میں 1990ء سے جہاں جدید کالونزم (New Colonism) کے خطرات کا تناسب بڑھا ہے وہیں غریب مگر محنتی لوگوں کے لیے سیاسی تو نہیں مگر معاشی خوش حالی میں حصے داری کے امکانات میں بہر حال غیر معمولی اضافہ ہوا ہے کیوں کہ یہ عہد خلاف مرکزیت (Era of de-centralisation) کہلاتا ہے۔ اس صدی میں ترقی یافتہ ممالک نے اپنی مجموعی آمدنی میں نوے فی صد کا اضافہ کیا۔ ہندوستان نے کل 5.8 فی صد آمدنی حاصل کی جو پچھلی صدی سے تقریباً دوگنی ہے۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ یا انفارمیشن ٹکنالوجی نے بالخصوص ایک خاموش مگر زندگی کے ہر میدان میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے۔ کمپیوٹر عصر حاضر کا جام جم ہے جو بادشاہ کے محل سے نکل کر گلی گلی پہنچ چکا ہے۔ اس ٹکنالوجی نے روحِ عصر میں سرعت، لطافت، وسعت، منفعت اور جدت کا ایک خزانہ بھر دیا ہے اور انفارمیشن سُپر ہائے وے نے پوری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس عالم کاری (عالمی گاؤں یا گلوبل ولیج) کے نتیجے میں اوپن مارکیٹ اور ای مارکیٹ (ای۔ کامرس) کے مسابقتی میدان میں عالمی دوڑ شروع ہو گئی ہے جس کی رواروی میں بہت سی حکومتیں اور قومیں کچل کے رہ گئی ہیں اور پوری دنیا تین خیموں میں بٹ گئی ہے۔ (i) ترقی یافتہ (Developed) (ii) ترقی پذیر (Developing) اور غیر ترقی یافتہ یا پسماندہ (Backward)

اس علمی و سائنسی دھماکے نے ہمارے ملک میں بھی جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک خوشگوار آندھی چلادی ہے۔ ایس ڈی پی آئی (Software Technology Park of India) کی تشکیل کر کے ہندوستان نے دس سال کے اندر اندر عالمی انفارمیشن ٹکنالوجی طاقت بننے کی منصوبہ سازی مکمل کر لی ہے۔ سافٹ ویر کاروبار کی ترقی اور اس کے برآمدات کے لیے جدید ترین بنیادی ڈھانچہ انٹل سیٹلائٹوں کے ذریعے بین الاقوامی رابطے کو منظم و مستحکم کرنے کے لیے چھ میں سے پانچ زمینی اسٹیشنوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے چنانچہ عالمی معیار کے مطابق یہاں سے سافٹ ویر کی برآمدات شروع ہو چکی ہیں، جس کا سب سے بڑا بازار خود امریکہ ہے۔ اس ضمن میں 784 برآمدتی یونٹوں کو منظوری مل چکی ہے جن کی سالانہ آمدنی میں سو فی صد سے زائد کا مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ 98-1997 میں سافٹ ویر برآمدات کی کل مالیت 6400 کروڑ روپے ہو چکی ہے جب کہ یہ 92-1991 میں صرف 430 کروڑ روپے تھی۔ 99-1998 میں برآمدات کا نشانہ 1000٠ کروڑ روپے مالیت کا تھا جو 11000 کروڑ روپے کو پار کر چکا ہے۔ ہندوستان کم قیمت میں اعلا درجے کے سافٹ ویر کی تیاری کے لیے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ چنانچہ اگلے سال ایس ٹی پی آئی کی جملہ یونٹوں کے ذریعے برآمدات کو دس گنا بڑھا دینے کا منصوبہ مکمل ہو چکا ہے۔

غرض کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے موجودہ معلوماتی انقلاب (Info-Revolution) نے دنیا کا علمی و تعلیمی نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (Distance Education) کی روز افزوں ترقی نے گھر بیٹھے اعلیٰ سے اعلیٰ تکنیکی اور عمومی علم کا حصول اور دنیا کی بہترین سے بہترین یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی یافت بالکل آسان کر دی ہے۔ اب ٹیلی لرننگ سنٹر (TLC)

نوٹ

اور آن لائن اینڈ آف لائن ٹیچنگ (Synchronous mode of teaching) کے ذریعے ہر طرح کے علوم وفنون سے تعلیم وتربیت ممکن ہوگئی ہے۔ لہٰذا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ اب روزمرہ کی بنیادی ضروریات میں شامل ہوگئے ہیں۔

خصوصی مواقع کے اداریہ کا نمونہ

فراقؔ صدی

فراقؔ اردو کے بلند پایہ شاعر ہی نہیں، ایک روشن خیال دانش ور بھی تھے۔ بہ طور شاعر انہوں نے جہاں ایک طرف اردو شاعری کو کچھ نئی جہتوں سے آشنا کیا، وہیں دوسری طرف ان کی خیال انگیز نثری تحریروں نے اردو کے تہذیبی کردار اور متحدہ قومی تشخص کی تشکیل میں اردو کا جو حصہ رہا ہے، اسے خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا۔ انہوں نے اس پر بھی زور دیا کہ اردو پر عربی فارسی زبانوں کے جو اثرات ہیں، انہیں کم کیا جائے اور سنسکرت زبان وادب سے اردو کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی جائے۔ انہوں نے خود بھی یہ کوشش کی۔ ان کی جو رباعیاں ''روپ'' کے نام سے کتابی صورت میں شایع ہوئیں، وہ ان کی اسی شعوری کوشش کا ثمرہ ہیں۔

فراق صاحب کی بہت سی باتوں سے اختلاف بھی کیا گیا۔ عربی اور فارسی دونوں اگر چہ غیر ملکی زبانیں ہیں لیکن جب یہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئیں تو انہوں نے یہاں کی بہت سی زبانوں کو متاثر کیا، ان میں اردو بھی شامل ہے جو اس وقت اپنی تشکیل کے بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی اور شاید اسی وجہ سے ان کے اثرات کا نفوذ یہاں زیادہ ہوگیا۔ ان اثرات کی بدولت دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اردو میں ایک بین الاقوامی جہت پیدا ہوئی جسے اس کی ایک اضافی خوبی کہا جاسکتا ہے، لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں اردو ہندوستان کی سرزمین سے اُگی ہوئی زبان ہے، جس کی جڑیں اس مٹی میں بہت گہرائی تک اتری ہوئی ہیں، جسے ہم ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نام دیتے ہیں، اس کی موثر ترین ترجمانی اردو ہی نے کی ہے۔

فراق صاحب کی ایک غزل کا مقطع ہے:

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراقؔ
کارواں آتے گئے، ہندوستاں بنتا گیا

ہندستانیت کی روح کو سمجھنے کے لیے یہ تاریخی شعور بہت ضروری ہے، جس کا اظہار فراق صاحب کے اس مقطع میں ہوا ہے۔

نوٹ

ہندوستانی تہذیب اور یہاں کا تمدن ہزار ہا سال کے سفر کے بعد اگر آج بھی تازہ دم اور توانا ہے تو اسی لیے کہ طاقت اور توانائی کے نو بہ نو سرچشموں سے یہ سیراب ہوتا رہا ہے۔

متن پر سوالات 31A.1

1. مندرجہ ذیل بیانات کو ایک ایک لفظ سے پورا کیجیے۔

الف) اداریہ.. کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

ب) اداریہ اخبار میں.. جگہ پر شائع ہوتا ہے۔

ج) اداریہ کی سرخی.. سے جڑی ہونی چاہیے۔

2. درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

اداریہ میں ہماری رائے اور ہمارا خیال جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اس لیے کہ

الف) اداریے میں صرف مدیر کی رائے شامل ہوتی ہے۔ ( )

ب) اداریے میں مدیر کے علاوہ سارے اہم عہدے داروں کی رائے شامل ہوتی ہے۔ ( )

ج) اداریے میں سارے اخبار پڑھنے والوں کی رائے شامل ہوتی ہے۔ ( )

3. درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیے۔

تاثراتی اداریے میں ایڈیٹر

الف) قاری کے ذاتی خیالات پیش کرتا ہے۔ ( )

ب) قاری پر تنقید کرتا ہے۔ ( )

ج) اپنی رائے کو دلائل کے ساتھ قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ ( )

4. اداریہ لکھنے کے عام طور پر تین مراحل ہیں۔

الف) خبر کا پڑھنا، چھانٹنا اور لکھنا۔ ( )

ب) موضوع کا انتخاب غور و خوض اور عمل۔ ( )

ج) بات چیت کرنا، لکھنا اور سنانا۔ ( )

نوٹ

آپ نے کیا سیکھا؟

- اداریہ میں اخبار یا رسالہ کا مدیر کسی اہم موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔
- اداریہ میں مدیر کے علاوہ اخبار کے دوسرے اہم عہدے داروں کی رائے بھی شامل ہوتی ہے۔
- اداریے میں جو رائے دی جاتی ہے وہ بہت جچی تلی ہوتی ہے۔
- اداریہ بہت طویل نہیں لکھا جاتا۔
- اداریہ لکھنے کے تین مرحلے ہیں۔ موضوع کا انتخاب، غور وخوض اور اداریہ لکھنے کا عمل۔
- اداریہ کا کام رائے عام تشکیل کرنا ہے۔
- اداریہ کا لب ولہجہ سخت نہ ہو کر اعتدال پسندی کا ہوتا ہے۔
- اداریہ کی زبان عام فہم ہوتی ہے۔
- اداریہ میں اپنی رائے دلیل اور حقائق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔
- اداریہ کی سرخی پُرکشش ہوتی ہے اور موضوع سے جڑی ہوتی ہے۔

31A.3 اختتامی سوالات

- متن میں بتائے گئے مختلف قسم کے اداریوں کو اخبار سے پڑھیں اور ان کے نمونوں کو سمجھیں۔
- کسی اخبار یا رسالے میں اداریے کی کیا اہمیت ہے، دو صفحات میں لکھیں۔
- اداریہ لکھنے کے لیے کن باتوں کو دھیان میں رکھیں گے۔ واضح کریں۔

متن پر سوالات کے جوابات

31A.1 1. الف.... مدیر

ب.... نمایاں

ج.... موضوع

2. ب

3. ج

4. ب

نوٹ

31B

خبریں تیار کرنا

مقاصد

اس سبق کو پڑھ لینے کے بعد

1. انسانی زندگی میں خبروں کی اہمیت سے واقف ہو سکیں گے۔
2. اہمیت اور اثر کے اعتبار سے خبر کی قسموں کو جان سکیں گے۔
3. خبریں کس طرح اور کن ذرائع سے جمع کی جاتی ہیں اس کا ایک حد تک اندازہ کر سکیں گے۔
4. مضمون نویسی اور خبر نویسی میں فرق کر سکیں گے۔
5. سوالات کے جوابات دے سکیں گے۔

31B.1 خبریں تیار کرنا

آپ کے سامنے ایک اردو روزنامے سے لیے گئے تراشے ہیں جن سے مختلف انداز کی چھوٹی بڑی خبروں کا نمونہ آپ کو مل جائے گا۔

نمونہ نمبر۱۔ میں ایسی خبر دی گئی ہے۔ جس کا تعلق بچوں کی صحیح تعلیم اور مناسب پرورش سے ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ بچے ہمارے ملک کا مستقبل ہیں، اگر بچوں کی صحیح ڈھنگ سے تعلیم و تربیت نہیں ہوگی تو ہمارا ملک دوسرے ممالک سے تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر حکومت کے ساتھ ساتھ والدین کو بھی دھیان دینا چاہیے۔
نمونہ نمبر۲۔ کی خبر حضرت خواجہ امیر خسروؒ کے عرس سے متعلق ہے جو کہ ہر سال بستی حضرت نظام الدین میں منعقد ہوتا ہے۔
تیسری خبر کا تعلق تعلیمی دنیا سے ہے۔ ہندوستان میں حکومت کی جانب سے ایسی بہت سی اسکیمیں چلائی جارہی ہیں جن کے

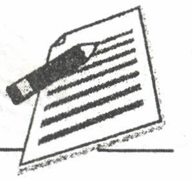

نوٹ

ذریعہ سماج کے تمام طبقوں کو ساتھ لے کر مکمل خواندگی کی طرف دھیان دیا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سرخی میں جو جملہ ہے وہی خبر کا پہلا جملہ ہے یعنی اہم ترین بات اس ایک جملے میں کہہ دی گئی اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ اس کی تفصیل ہے۔

بچے قوم کی امانت اور ملک کا مستقبل ہیں
صحیح تعلیم اور مناسب پرورش کی سخت ضرورت

گیان پور (سنت روی داس نگر) 3 رفروری

بچے قوم کی امانت اور ملک کا مستقبل ہیں۔ ان کے مستقبل کی حفاظت کی ذمہ داری والدین کی ہوتی ہے۔ اس لیے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ صحیح طریقے سے ان کی پرورش پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

کمیونٹی سینٹر جمونی پور میں ہونے والے ایک مذاکرے میں ان خیالات کا اظہار ضلع مجسٹریٹ نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ بچوں کو تعلیم دینا اور ان کی صحت کی حفاظت کرنا ایک سماجی ذمہ داری ہے اس لیے پسماندہ اور کمزور طبقہ اور ناخواندہ والدین میں بیداری پیدا کرنا فروغ اطفال پروجیکٹ کا اولین فریضہ ہے۔ انہوں نے پروجیکٹ کے افسران، ملازمین اور آنگن باڑی رضا کار خواتین سے کہا کہ وہ فروغ اطفال خدمت کو سرکاری حیثیت میں نہ مان کر سماجی خدمت تصور کریں۔ انہوں نے گاؤں میں بچوں کے لیے پیار، تعلیم اور ان کو صحت کے سلسلے میں بیدار کرنے کے لیے ماحول تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ ضلع مجسٹریٹ نے کہا کہ فروغ اطفال اسکیم کے ملازمین ایسے مفادات سے بالاتر ہو کر گاؤں کو اپنا کنبہ تسلیم کریں اور گاؤں کی مثالی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بھائی چارہ، باہمی تعاون اور یکجہتی کی شمع روشن رکھیں۔ انہوں نے غیر تعلیم یافتہ والدین اور 6 برس سے 14 برس تک کے غیر تعلیم یافتہ بچوں کو مکمل خواندہ کے لیے غیر رسمی تعلیم دینے کی ہدایت آنگن باڑی رضا کار خواتین کو دی۔ انہوں نے کہا کہ ناخواندہ بنانے بچوں کو وہ بہتر طریقے سے تعلیم دے سکتی ہیں۔ ضلع مجسٹریٹ نے کہا کہ عورتوں کو خواندہ بنانے سے ملک کے بچوں کا مستقبل سنور سکتا ہے کیونکہ ماں کی گود ہی ان کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ خواندہ ماں اپنے بچوں کی بہتر طریقے سے پرورش کر سکتی ہے۔

عرس حضرت خواجہ امیر خسروؒ

۲۴ تا ۲۶ فروری

نئی دہلی۔ ۲۰ جنوری حضرت نظام الدین اولیاء کے جانشین اور متعدد فنون کے ماہر مشہور صوفی حضرت امیر خسرو کا ۶۹۵ واں عرس ان کی درگاہ واقع بستی حضرت نظام الدین میں ۲۴ تا ۲۶ فروری منعقد ہوگا۔

نوٹ

اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام خواجہ ہال میں حضرت امیر خسرو کے فکر و فن اور خدمات پر ایک سیمینار زیر صدارت سابق گورنر ہریانہ مورخہ ۲۴ر نومبر کی شام ۵ بجے منعقد ہوگا اور ۲۵ر فروری کو اسی ہال میں محفل موسیقی منعقد ہوگی۔

عرس محل میں بزم خسرو کے زیر اہتمام ۲۵ر نومبر کو شام ۷ بجے سے قرآن خوانی، تقاریر اور قوالیاں ہوں گی۔ ۲۵ر کو مشاعرہ اور تقسیم انعامات اور ۲۶ر کو روحانی اجتماع منعقد ہوگا۔

مکمل خواندگی مہم میں سماج کے تمام طبقوں کا تعاون لیا جائے گا: ضلع مجسٹریٹ

بلیا، 3ر فروری (اپنے نمائندے سے)

مکمل خواندگی مہم سماج کے تمام طبقوں کا تعاون لے کر حکومت کی ہدایت کے مطابق مرحلے اور طریقے سے چلائی جائے گی۔

ان خیالات کا اظہار ضلع خواندگی کمیٹی کے صدر ضلع مجسٹریٹ نے وکاس بھون میں ہونے والے جلسہ میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ خواندگی مہم میں لگے تمام لوگوں کا احترام کیا جائے گا اور وقت وقت پر ایسے پروگرام کئے جائیں گے جس سے یہ مہم برابر جاری رہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ آئندہ جلسہ میں دور دراز کے دیہی علاقوں کے ایسے افراد کو بلایا جائے جن کے مشورے مہم کو فروغ دینے میں کارگر ثابت ہوں۔

ضلع مجسٹریٹ کی ہدایت پر کمیٹی کے سکریٹری نے اب تک کیے گئے کاموں کی تفصیل بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ ہر ناخواندہ شخص کو خواندہ بنانے کے لیے 71.69 روپیہ کی شرح سے یہ اسکیم مرکزی حکومت نے منظور کی ہے۔ گووند بلبھ پنت سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ الہ آباد کے تحت ضلع بلیا کی خواندگی مہم کی رپورٹ پیش کی گئی۔ انسٹی ٹیوٹ کے نمائندے نے بتایا کہ ضلع میں خواندگی کے حق میں اچھا ماحول ہے۔ مہم کے ہدف کو وقت سے حاصل کرنے کے لیے مختلف سطح پر تشکیل کردہ کمیٹیوں کو سرگرم بنانا ہوگا۔ نمائندے نے یہ بھی بتایا کہ ضلع خواندگی کمیٹی کو برابر اس کا تجزیہ بھی کرتے رہنا چاہیے۔ دیہی علاقوں سے آئے ہوئے خواندگی ملازمین نے مہم سے متعلق مشورے دیے۔

ضلع مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق کئی ماہرین تعلیم کو بھی اس سلسلے میں مشورے دینے کے لیے بلایا گیا تھا۔ ماہرین تعلیم نے خواندگی مہم کا ماحول بنانے کے لیے ثقافتی پروگرام کرنے پر زور دیا اور کہا کہ اس کام میں الیکٹرانک میڈیا کا تعاون لینا چاہیے۔ سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں اور کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی سطح سے کوشش کریں۔ انہوں نے کہا کہ ضلع خواندگی کمیٹی کی جانب سے ایک ماہانہ رسالہ شایع کیا جانا چاہیے۔ پریس کلب بلیا کے صدر اور سابق پرنسپل نے دیہی سطح پر تشکیل کی گئی کمیٹیوں کو فعال بنانے پر زور دیا اور کہا کہ اس میں پرائمری اسکولوں کا تعاون لینا چاہیے۔ جلسہ میں نگر

نوٹ

پالیکا کے صدر نے مشورہ دیا کہ گاؤں پنچایت اور بلدیاتی اداروں کو بھی خواندگی مہم چلانے کے لیے رقم فراہم کرنی چاہیے۔ علاقہ پنچایت پندہ کے پرمکھ نے مشورہ دیا کہ جو رضا کار اچھا کام کریں ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

متن پر سوالات 31B.1

° خالی جگہ کو متن میں آئے ہوئے مناسب لفظ سے بھرے۔

1. خبر کی جمع.............. ہے (خبار، خبیر، اخبار، خبور)
2. دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں اور ان کی دلچسپیاں ہیں (جدا جدا، مختلف، متضاد، الگ الگ)
3. خبریں ہمیں اطلاع بھی دیتی ہیں اور................. بھی کرتی ہیں (بیدار، چوکنا، خبردار، ہوشیار)
4. اغوا، غبن اور .... کامیاب خبر بناتی ہیں (تہذیبی باتیں، سیدھی سادی باتیں، غیر اخلاقی باتیں)

31B.2 خبر کی قسمیں

پڑھنے والوں کی دلچسپی اور توجہ کے اعتبار سے خبروں کو دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک دھماکہ خیز خبریں اور دوسری عام خبریں۔ دھماکہ خیز خبریں بہت اہم ہوتی ہیں مثلاً حکومت کا کوئی ایسا نیا فیصلہ جس سے پورے ملک کے حالات پر اثر پڑسکتا ہو۔ مجرموں کے کسی گروہ پر پولس کا چھاپہ، ٹیکس میں بھاری اضافہ یا کمی۔

نرم خبر نسبتاً کم اہم ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مقامی اسکول یا کالج میں جلسے کی روداد چھوٹے، موٹے حادثے اور چوری کے واقعات کی خبریں، کسی میٹنگ کی تفصیل یا کسی شخص کے حالاتِ زندگی۔ یہ سب وہ باتیں ہیں کہ اگر پڑھنے والا ان سے باخبر نہ رہے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

خبریں متوقع یا طے شدہ بھی ہوتی ہیں اور غیر متوقع یعنی غیر طے شدہ بھی۔ متوقع خبریں وہ ہیں جو مسلسل اور بڑی تعداد میں ملتی رہتی ہیں مثلاً امتحانات، کھیل کود کے نتیجے اور جلسوں کی رپورٹیں۔ غیر متوقع خبریں ان حادثوں کی تفصیل ہوتی ہیں جو اچانک رونما ہو جائیں یا کوئی ایسی تبدیلی جس کی کوئی امید نہ تھی۔ مثلاً کسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کسی ہردل عزیز لیڈر پر حملہ ہوگیا، حکومت گرگئی، وبا پھیل گئی، قحط پڑگیا یا طوفان آگیا۔ طے شدہ خبریں عدالتوں، تھانوں، تحصیل کے دفتر، ضلع کے ہیڈ کوارٹر وغیرہ سے مل جاتی ہیں۔ اسکے مقابلے میں غیر طے شدہ خبروں کو جمع کرنا زیادہ مشکل کام ہے جس کے لیے تجربہ کار اور پھرتیلے نامہ نگاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نامہ نگار کو کرسپانڈنٹ بھی کہتے ہیں۔ طے شدہ خبریں معمولی دلچسپی کی ہوتی ہیں جب کہ غیر طے شدہ خبریں سنسنی اور ہلچل پھیلا دیتی ہیں۔

آیئے رپورٹر اور نامہ نگار کے باریک فرق کو سمجھ لیں۔ جس شہر سے کوئی اخبار نکلتا ہے وہیں رہ کر جو لوگ اس کے لیے خبریں جمع کرتے ہیں انہیں رپورٹر کہا جاتا ہے اور جو شخص اس اخبار کے لیے خبریں کسی دوسرے شہر میں رہ کر بھیجتا ہوا اُسے نامہ نگار کہا جاتا ہے۔

متن پر سوالات 31B.2

مندرجہ ذیل بیانات میں سے جو درست ہو اس پر صحیح (✓) کا نشان لگائیں:

1. حکومت کے غیر اہم فیصلے سخت خبر بناتے ہیں۔
2. مجرموں کے کسی خطرناک گروہ پر پولس کا چھاپہ عام خبر ہے۔
3. کھیل کود اور امتحانات کے نتائج کی خبروں کو غیر طے شدہ خبروں کے خانے میں رکھا جائے گا۔
4. ملک میں طوفان سے ہزاروں لوگوں کی موت کی خبر غیر طے شدہ خبر سمجھی جائے گی۔

31B.3 خبریں جمع کرنے کے طریقے اور ذرائع

خبریں حاصل کرنے میں اس بات کی خاص اہمیت ہے کہ جس واقعے کی خبر دی جارہی ہے وہ پڑھنے والوں کے آس پاس کی ہے یا دور کی۔ اُس سے کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں، پڑھنے والے اس میں کس حد تک دلچسپی لیں گے۔ مثال کے طور پر ترکی میں زلزلے کی خبر کو لوگ ہندوستان میں سمندری طوفان کی خبر کے مقابلے کم دلچسپی سے پڑھیں گے۔

پھر یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کسی خبر کا نمایاں خاص پہلو کیا ہے۔ مثلاً کسی شہر میں آئے دن لوگ بھیانک بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں لیکن وزیر اعظم یا کوئی بڑا عالم، اداکار کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کی بیماری کو خبروں کا موضوع اخباروں میں بنایا جائے گا۔

زیادہ تر خبریں ایجنسیوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی سب سے بڑی نیوز ایجنسیاں پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) اور یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان سماچار اور دیگر ایجنسیوں کا نام آتا ہے۔ دنیا کی سب سے پرانی اور قابل بھروسہ ایجنسی روئٹر (Reuter) سمجھی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ چھوٹی بڑی خبر رساں ایجنسیاں کام کرتی رہتی ہیں جن سے اخباری نمائندوں کو خبریں حاصل ہوتی ہیں۔ سرکاری دفاتر، پارلیامنٹ گورنر ہاؤس، وزیروں کے دفتر، سیاسی پارٹیوں کے دفتر، راشٹر پتی بھون، صوبائی اسمبلیاں وہ اہم جگہیں ہیں جہاں سے خاص طرح کی خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔ ریلوے، روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن اور ایرلائنوں کے ہیڈ کوارٹر بھی خبروں کا اچھا ذریعہ ہیں۔ سیاستدانوں کی

تقریروں اور جلسوں میں جا کر بھی رپورٹروں کو خبریں ملتی ہیں۔

خبریں ذاتی ملاقات یا ٹیلی فون پر بھی مل سکتی ہیں۔ ذاتی سطح پر جس شخص سے خبر حاصل کی جا رہی ہے اس سے تعلقات کس طرح کے ہیں، اس کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ بین الاقوامی سطح کی کانفرنسوں وغیرہ سے متعلق خبریں جمع کرنے کے لیے رپورٹر کی ذاتی موجودگی موقع پر ضروری ہوتی ہے۔

خبریں جمع کرنے میں ''ک'' سے شروع ہونے والے چھ سوالوں کو خاص طور سے دھیان میں رکھنا چاہیے کیا ہوا، کہاں ہوا، کب ہوا، جو واقع ہوا اس میں کون لوگ شامل تھے۔ کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ اس میں مشکل ترین سوال ہے کیوں ہوا یعنی واقعے کا سبب کیا تھا اور اس کی چھان بین کے لیے رپورٹر کو کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ کامیابی کے ساتھ خبریں جمع کرنے کے لیے ہر طبقے سے رابطہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

متن پر سوالات 31B.3

A غیر طے شدہ خبروں کو جمع کرنے کے لیے ... ضرورت ہوتی ہے۔

1. اَن پڑھ لوگوں کی ( )
2. سست رپورٹروں کی ( )
3. تجربہ کار اور پھرتیلے نامہ نگاروں کی ( )
4. دفتر میں کام کرنے والوں کی ( )

B سب سے پرانی اور قابلِ بھروسہ خبر رساں ایجنسی

1. پرچار بھارتی ہے ( )
2. کمپالا نیوز سروس ہے ( )
3. یو این آئی ہے ( )
4. رویٹر ہے ( )

31B.4 خبر لکھنے کا طریقہ

خبر لکھتے ہوئے مضمون والا طریقہ نہیں اختیار کیا جاتا بلکہ نتیجے والی بات یعنی انتہا کا ذکر پہلے ہوتا ہے اور جیسے جیسے لائنیں یا پیرا گراف بڑھتے جاتے ہیں کم اہمیت والی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً ریل گاڑی میں ڈکیتی 71 کے واقعے کی خبر لکھتے ہوئے یہ تفصیل پہلے نہیں دی جائے گی کہ ڈبے میں کتنے مسافر تھے وہ کس طرح بیٹھے تھے جاگ رہے تھے سو رہے تھے بلکہ یہ لکھا

نوٹ

جائے گا کہ فلاں گاڑی میں ڈکیتی پڑی ڈاکو مسافروں سے پیسے چھین کر بھاگ گئے۔یعنی ضروری بات جسے ابتدائیہ کہا جائے گا جو مختصر الفاظ میں ہوتا ہے پھر اس اختصار کی تفصیل، مزید معلومات، گواہوں یا موقع پر حاضر لوگوں کا بیان اور پھر بقیہ تفصیلات مثال کے طور کسی جلسے کی خبر دی جارہی تو جو تقریریں اس میں ہوتی ہیں ان سب کا خلاصہ آسان اور مختصر الفاظ میں سرخی کی شکل میں دیا جائے گا۔پھر جہاں سے خبر شروع ہوتی ہے اس کے پہلے جملے کے طور پر بھی وہی سرخی دہرائی جائے گی اور پھر اس کی وضاحت آئے گی۔صدرِ جلسہ نے اپنی تقریر میں کیا کہا اس کی اہم باتیں آخر میں آئیں گی۔

متن پر سوالات 31B.4

مندرجہ ذیل بیانات پر صحیح یا غلط کا نشان لگائیں

1. خبر لکھتے ہوئے مضمون والا طریقہ نہیں اختیار کیا جائے گا ( )
2. نتیجے والی بات یعنی انتہا بعد میں لکھی جاتی ہے ( )
3. نہایت ضروری بات کو ابتدائیہ کے طور لکھا جائے گا ( )
4. گواہوں کے بیانات کو سب سے پہلے لکھا جائے گا ( )

آپ نے کیا سیکھا؟

1. خبروں سے انسان کی زندگی کا بہت گہرا تعلق ہے۔
2. ایسی بات جو بالکل نئی اور تازہ ہو جسے جان کر ہم چونک جائیں یا مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش کریں، وہ خبر ہے۔
3. خبروں کا تعلق زندگی کے کسی بھی حصے سے اور دنیا کے کسی بھی حصے سے ہو سکتا ہے۔
4. زندگی کے غیر معمولی واقعات سے خبر بنتی ہے۔
5. خبریں جمع کرنے میں رپورٹر اور نامہ نگار اہم کردار ادا کرتے ہیں۔
6. خبریں جمع کرنے کے مخصوص طریقے اور ذرائع ہوتے ہیں۔مقامی اور غیر مقامی خبروں کے فرق پر دھیان دینا ہوتا ہے۔
7. خبروں کو لکھنے میں آخری بات سب سے پہلے کہی جاتی ہے اور 'ک' سے شروع ہونے والے چھ سوالوں پر توجہ دی جاتی ہے۔

اختتامی سوالات 31B.7

1. خبر کی تعریف بتایئے اور اس کی خصوصیات لکھیے۔
2. دھماکہ خیز اور عام خبر کا کیا مطلب ہے؟

3. طے شدہ اور غیر طے شدہ خبروں سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ مثال دے کر سمجھائیں۔
4. خبریں جمع کرنے کے کیا طریقے اور ذرائع ہوتے ہیں؟
5. خبر لکھنے کا طریقہ بیان کیجئے۔
6. اپنے محلے میں ہوئی چوری سے متعلق دو پیراگراف کی مختصر خبر بنائیے۔

31B.8 متن پر سوالات کے صحیح جوابات

31B.1	i.	(3)
	ii.	(4)
	iii.	(3)
	iv.	(3)
31B.2	i.	(x)
	ii.	(x)
	iii.	(x)
	iv.	(✓)
31B.3		
A.	i.	(3)
	ii.	(x)
	iii.	(x)
	iv.	(x)
B.		
	i.	(4)
	ii.	(x)
	iii.	(x)
	iv.	(x)
31B.4	i.	(✓)
	ii.	(x)
	iii.	(✓)
	iv.	(x)

نوٹ

32A

سُرخی

سُرخی کا تعارف

سرخی کسی بھی خبر، مضمون، بیان، تحریر یا موضوع کی مختصر ترین شکل کو کہتے ہیں جو تحریر شروع کرنے سے پہلے اوپر لکھی جاتی ہے۔ اُسے عنوان بھی کہہ سکتے ہیں لیکن صحافتی زبان میں اسے سرخی کا ہی نام دیا گیا ہے۔ سرخیاں اخبارات ورسالے کی اہم ضرورت ہیں جس کے بغیر ہم کسی اخبار یا رسالے کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ سرخیاں، خبر یا مضمون کے اوپر بہت موٹے یا جلی حروف میں نمایاں طور پر لکھی جاتی ہیں۔ سرخیاں ایک لمبی لائن میں دی جاتی ہیں۔ دو لائنوں میں بھی دی جاتی ہیں۔ اوپر کی لائن زیادہ موٹے حروف میں ہوتی ہے اور نیچے کی لائن اس سے کم موٹے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ کسی بھی مواد، مضمون یا خبر کے بارے میں فوری طور پر معلومات حاصل کرنے کے لیے سرخی بے حد ضروری ہے۔ سرخی عموماً بے حد مختصر ہوتی ہے اور کم الفاظ میں خبر کا خلاصہ پیش کر دیتی ہے۔ کبھی کبھی متن کے کسی اچھے جملے کو سرخی کے لیے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ سرخی کے ذریعہ ہی قاری خبر میں دلچسپی لے سکتا ہے یا دلچسپی ختم ہو سکتی ہے۔ اس لیے اخبار کے مضامین اور خبروں کے لیے سرخیاں تیار کرنا ایک اہم فن سمجھا جاتا ہے۔

آپ کو معلوم ہو گیا کہ سرخیاں کسے کہتے ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ سرخیوں کو تیار کرتے وقت کن باتوں کو دھیان میں رکھا جاتا ہے۔

— سرخیاں مختصر ہوں۔

نوٹ

— سرخیوں سے جو بات کہنی ہے وہ واضح اور مکمل ہو۔
— سرخیاں پُرکشش اور دل کو چھونے والی ہوں۔
— سرخیاں سہل الفاظ میں ہوں۔
— سرخیاں، مواد یا موضوع کو صحیح طور پر پیش کرتی ہوں۔ یعنی اندر خبر یا مضمون میں کیا کہا گیا ہے، پہلی نظر میں سرخی سے اشارہ مل جائے۔
— سرخیاں ایسی ہوں جو عمومی طور پر ہر قاری پر اثر ڈالے نہ کہ کسی مخصوص طبقہ کے قاری کے لیے تیار کی گئی ہو۔
— سرخیوں میں عام فہم زبان کے فقرے استعمال کیے جائیں تو بہتر ہے۔
— سرخیاں ایسی ہوں جو چونکا دیں۔ حیرت میں ڈال دیں۔ قاری کا دل جیت لیں اور قاری سرخی پڑھ کر خبر پڑھنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔
— سرخیاں لکھتے وقت انسانی نفسیات اور پسند و ناپسند پر دھیان دینا بھی بے حد ضروری ہے۔
— سرخی کے الفاظ کو مناسب طریقے سے لائنوں میں جمانا بھی ایک فن ہے۔ اس پر خصوصی توجہ دینا چاہیے۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھ کر آپ جان سکیں گے۔
— سرخیاں کسے کہتے ہیں۔
— اخبار یا رسالے کے لیے سرخیوں کی کیا اہمیت ہے۔
— سرخیاں کس طرح لکھی جاتی ہیں۔
— اخبار و رسائل میں کیسی سرخیاں پسند کی جاتی ہیں۔

32A.1 کچھ سرخیوں کے نمونے دیکھیے

اردو اکادمی، دہلی کا جلسہ تقسیم انعامات

نئی دہلی۔ ۳۱ رجنوری

اردو اکادمی، دہلی ہر سال اردو اسکولوں کے درمیان تعلیمی مقابلہ منعقد کرتی ہے۔ اس سال یہ مقابلے ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۹۹ء میں منعقد کیے گئے تھے۔ ان مقابلوں میں تقریری مقابلے، غزل نظم سرائی مقابلے، بیت بازی مقابلے، قوالی اور ڈراموں کے مقابلے اور تحریری مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ مقابلوں میں اول، دوم اور سوم، حیثیت حاصل کرنے والوں کو نقد انعامات،

نوٹ

مومینٹوز اور اسناد دی جاتی ہیں۔

تقسیم انعامات کا جلسہ مورخہ ۲رفروری اور ۳رفروری ۲۰۰۰ء کو صبح ساڑھے دس بجے پیارے لال بھون، نزد آئی ٹی او میں منعقد ہوگا جس میں ۲۵۱ بچوں کو انعامات دیئے جائیں گے۔ نقد انعامات کی کل رقم تقریباً سوا لاکھ روپے ہے۔

۲رفروری کو منعقد کیے جانے والے جلسے میں وزیر برائے ٹرانسپورٹ دہلی انعامات تقسیم کریں گے۔

۳رفروری کو منعقد کئے جانے والے جلسے میں سابق گورنر بہار انعامات تقسیم کریں گے۔

87 سالہ پردادی نے نیا ریکارڈ قائم کیا

طیارہ میں سفر کر کے سب سے زیادہ معمر خاتون ہونے کا اعزاز حاصل کیا

پورٹ ایلز بیتھ، 24 دسمبر (ڈی پی اے)

جنوبی افریقہ کی 87 سالہ پردادی فضا میں پرواز کر رہے طیاروں پر چلنے والی دنیا کی سب سے بوڑھی خاتون بن گئی ہیں۔ یہ اطلاع خبر رساں ایجنسی نے دی ہے۔ پورٹ ایلز بیتھ کی پیڈی رچی نے کل 2 سیٹوں والے بوئنگ اسٹرمین کے بازو پر چل کر سب کو حیران کر دیا اور اپنے لیے ریکارڈ بک میں جگہ بنالی۔ انہوں نے یہ جرأت مندکارنامہ دکھانے کا اس وقت ارادہ کیا جب پائلٹ ڈیوڈسن نے سابق ہیئر ڈریسر اور ایر کرافٹ انجینئر کی بیوہ کو ایسا کرنے کا چیلنج دیا۔ طیارہ کے پرواز کرنے سے قبل ایک ڈاکٹر نے رچی کو اعصاب پر کنٹرول رکھنے والی ایک گولی پیش کی۔ رچی نے ایجنسی سے کہا "میں نے ان سے گولی لے کر اُسے جھاڑیوں میں اچھال دیا اور اگر مجھے گولی کی ضرورت ہوتی تو میں ایسا کارنامہ انجام دینے کے لیے قدم ہی کیوں اٹھاتی۔"

بس حادثہ کا شکار، 21 زخمی، تین کی حالت نازک

شملہ-24 دسمبر (سی ان ا)

کل شام چمبا ضلع کے مہرونالہ میں ایک پرائیویٹ بس کے گر جانے سے کم از کم 21 افراد زخمی ہوگئے جن میں تین کی حالت نازک ہے۔ زخمیوں کو سلونی کے پرائمری ہیلتھ سنٹر لے جایا گیا جب کہ سنگین طور پر زخمیوں کو چمبا کے ضلع اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ بس پر 35 مسافر سوار تھے اور یہ چمبا جارہی تھی۔

متن پر سوالات 32A.1

درست جواب پر صحیح کا (✓) نشان لگائیں۔

1. سرخیاں اخبار یا رسالوں کے لیے

الف) ضروری نہیں ہیں ( )

نوٹ

ب) مصیبت اور زحمت ہیں ( )

ج) اہم ضرورت ہیں ( )

2. سرخیاں مواد یا موضوع کو

الف) تفصیل سے پیش کرتی ہیں ( )

ب) صحیح طور پر پیش کرتی ہیں ( )

ج) تنقیدی طور پر پیش کرتی ہیں ( )

3. سرخیاں تیار کرنا

الف) ایک ہنگامہ ہے ( )

ب) ایک فن ہے ( )

ج) ایک لطف اندوزی کا کام ہے ( )

4. سرخیاں ایسی ہوں جو

الف) حیرت میں ڈال دیں، چونکا دیں، دل کو چھولیں ( )

ب) سوچنے کے لیے مجبور کر دیں ( )

ج) غم میں مبتلا کر دیں ( )

آپ نے کیا سیکھا؟

— سرخیاں کسے کہتے ہیں۔

— سرخیاں اخبارات و رسائل کے لیے کیوں اہم ہیں۔

— سرخیاں تیار کرتے وقت کن باتوں کا دھیان رکھا جاتا ہے۔

— سرخیاں پُر کشش اور مختصر ہونی چاہئیں۔

— سرخیاں ایسی ہوں جو موضوع کی طرف اشارہ کرتی ہوں۔

— سرخیاں چونکا دینے والی اور حیرت میں ڈالنے والی کیوں ہوں۔

نوٹ

اختتامی سوالات 32A.5

1. اخبارات ورسائل میں سرخیوں کی کیا اہمیت ہے؟
2. سرخیاں موٹے یا جلی حروف میں کیوں لکھی جاتی ہیں؟
3. سرخیاں طویل نہ ہو کر مختصر کیوں بنائی جاتی ہیں؟
4. سرخیاں آسان زبان میں کیوں لکھی جاتی ہیں؟

متن کے سوالات کے جوابات

32A.1

1. ج
2. ب
3. ب
4. الف

نوٹ

32B

اشتہار تیار کرنا

اشتہار کا تعارف

اس نمونے کے طور پر اوپر دیئے گئے چار اشتہاروں میں سے پہلے اور دوسرے اشتہاروں میں تصویر اور الفاظ دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ تصویر میں لہراتے ہوئے بال سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ جس چیز کا اشتہار دیا جارہا ہے اس کا تعلق بالوں سے ہے۔ اب دس الفاظ میں یہ بتادیا گیا کہ قرینہ ہیر ٹانک کن چیزوں سے بنا ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے۔ اشتہار کے نیچے لائن کھینچ کر چیز بنانے والوں کا نام و پتہ نسبتاً کم سائز کے حروف میں دیا گیا ہے۔

نوٹ

دوسرے اشتہار میں گلاب ٹوتھ پیسٹ بنانے والوں کا نام اور پتہ نہیں لکھا گیا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ گلاب ٹوتھ پیسٹ ہر دوکان پر یا دوا فروش کے پاس مل جاتا ہے۔ اس میں بھی الفاظ کی تعداد تقریباً 15 ہے اور اس کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں پیلو کا عرق شامل ہے جو جراثیم کو مارتا ہے۔

تیسرے اور چوتھے اشتہار میں صرف الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں شیروانی کے لیے چار شہر مشہور ہیں۔ دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ اور حیدرآباد۔ علی گڑھ کی شیروانیاں زیادہ مشہور ہیں۔

چوتھا اشتہار کمپیوٹر سے متعلق ہے۔ کمپیوٹر کیوں خریدا جائے اس کی وجہ بتادی گئی ہے کہ یہ اب ہر گھر کی ضرورت ہے۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھ لینے کے بعد آپ جان سکیں گے کہ

1. اشتہار کا موجودہ دور کی صحافت سے گہرا تعلق ہے۔
2. اخبار کو چلانے کے لیے مستقل آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے اور آمدنی میں اضافہ ضروری ہوتا ہے۔
3. اخبار کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ اشتہار ہیں۔
4. اشتہار نویسی کے لیے خاص تصور اور تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔
5. سوالات کے جواب دے سکیں گے۔

32B.1 صحافت بحیثیت تجارت

موجودہ دور میں صحافت کو ایک تجارت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ پہلے صورت حال مختلف تھی۔ اخبار اور رسالے کبھی شوق پورا کرنے کے لیے نکالے جاتے تھے تو کبھی کسی تحریک کی حمایت کے مقصد سے اور کبھی سماج میں عزت و وقار حاصل کرنے کی غرض سے اور اس میں کسی نقصان کی فکر کم ہی کی جاتی تھی۔ اب ان مقاصد کے ساتھ ساتھ تقریباً ہر اخبار اور رسالہ پیسہ کمانے کا ذریعہ بھی بن گیا ہے اور چونکہ اس پر آنے والی لاگت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اس لیے اس کے انتظامی ڈھانچے کو بھی پہلے سے بہتر بنالیا گیا ہے۔ دوسری تجارتوں کی طرح اس میں بھی تجارتی انتظامیہ میں مہارت رکھنے والوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ کوئی بھی تجارت شروع کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے اس سرمائے کے مناسب استعمال کا اور اس سے پابندی سے ہونے والی آمدنی کا، اسی آمدنی کو حاصل کرنے اور اس میں اضافہ کرنے کے لیے تجربہ کار اور ماہر منتظمین کی ضرورت پڑتی ہے۔

نوٹ

اخبار اور رسالہ پڑھنے والے فرد کی حیثیت سے آپ کو دلچسپی صرف اتنی ہوتی ہے کہ ہر صبح ہر ہفتے یا ہر مہینے اخبار یا رسالہ آپ کے گھر آجایا کرے۔ اخبار کیسے نکلتا ہے، کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے، کتنی لاگت آتی ہے۔ اس طرح کے سوالات سے آپ کو کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔

اخبار یا رسالے کو کامیابی اور نفع بخش طریقے سے چلانے کے لیے جن ضروری باتوں کا دھیان رکھا جاتا ہے، وہ یہ ہیں کہ اس کی اپنی ملکیت ہو یعنی کہ کرائے کی عمارت میں نہ ہو، اس کی عمارت شہر کے مرکز میں ہو جہاں سے ریلوے اسٹیشن، بس اڈہ، ہوائی اڈہ، جنرل پوسٹ آفس وغیرہ قریب ہوں اور جہاں پر آنے جانے والوں کی نظر آسانی سے پڑ سکے، عمارت کے سامنے مناسب جگہ پر اس کا بڑا سا اور خوبصورت سائن بورڈ ہو جو دیکھنے والوں کو متوجہ کر سکے۔ شہر کے مرکز یا وسط میں اخبار و رسالے کے دفتر بنانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ حادثات و واقعات کی خبریں ان تک جلد پہنچ سکیں گی۔ خریدار، ایجنٹ اور مراسلات چھپوانے کے خواہشمند لوگ آسانی سے ان سے رابطہ قائم کر سکیں گے۔

متن پر سوالات 32B.1

ذیل کے سوالات میں خالی جگہ کو متن میں آئے مناسب الفاظ سے بھریئے۔

1. پہلے زمانے میں اخبارات اور رسالے........... نکالے جاتے تھے۔
   (انتقام لینے کے لیے، خوف زدہ کرنے کے لیے، شوق پورا کرنے کے لیے)
2. اب تقریباً ہر اخبار ایک........... کے طور پر شایع ہوتا ہے۔
   (منافع بخش تجارت، مہم جوئی، تحریک، انسانی خدمت)
3. اخبار پڑھنے والے کی دلچسپی صرف اتنی ہوئی ہے کہ...........
   وہ لائبریری میں جا کر اخبار پڑھ لے، ہر صبح اخبار اس کے گھر آجائے، پڑوسی سے پوچھ لے کہ آج اخبار میں کیا تھا۔
4. اخبار کی عمارت........... میں ہو۔
   (شہر سے دور ہو، شہر کے مرکز میں ہو، تنگ اور گھنے علاقے میں ہو)

تجارتی شعبہ:

ان تمام باریکیوں اور نزاکتوں کو دیکھتے ہوئے اخبار و رسالے کی انتظامیہ کو تین حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک حصہ یا شعبہ ادارت کا یعنی Editorial Section دوسرا تجارت کا جسے Business Section کہتے ہیں اور ایک طباعت یعنی چھپائی کا۔ تیسرے شعبے کو میکینکل سیکشن بھی کہا جاتا ہے۔ اس تقسیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ اخبار پر جو سرمایہ لگایا گیا ہے

نوٹ

وہ نہ صرف بحال رہے بلکہ وہ برابر آمدنی بھی دیتا رہے اور اس میں اضافے کی بھی گنجائش نکلتی رہی ہیں۔ اب آپ غور کیجئے کہ اگر کوئی اخبار دس ہزار روزانہ چھپتا ہے تو اس کی تمام کاپیاں بک جائیں گی یہ ضروری نہیں، اوسطاً آٹھ ہزار کاپیاں بکتی ہیں تو اس سے حاصل ہونے والی رقم سے اصل لاگت بھی نہیں نکلتی۔ آج اردو کا اوسطاً آٹھ صفحات کا اخبار دو روپے میں ملتا ہے اور انگریزی کا اوسطاً چھتیس صفحات کا اخبار بھی دو روپے میں ملتا ہے۔ ہفتہ وار ضمیمہ میگزین اور دوشنبہ و جمعہ کو خصوصی موضوعات پر ضمیمے کے صفحات الگ سے ہوتے ہیں۔ آپ نے شاید کبھی سوچا ہو کہ اردو اور انگریزی کے اخباروں کی قیمت میں زمین آسمان کا فرق کیوں ہے۔

متن پر سوالات 32B.2

نیچے لکھے بیانات میں سے درست بیان پر صحیح (✓) کا نشان لگائیں۔

1. ادارت کے شعبے کو میکینکل ڈپارٹمنٹ کہتے ہیں۔ ( )
2. اشتہار والے اور بغیر اشتہار والے اخباروں کی آمدنی برابر نہیں رہتی۔ ( )
3. اخبار کی عمارت پر مناسب جگہ پر نمایاں سائن بورڈ ہونا چاہیے۔ ( )
4. اخبار کا دفتر ریلوے اسٹیشن اور پوسٹ آفس سے دور بنایا جاتا ہے۔ ( )
5. جس اخبار میں زیادہ اشتہار چھپتے ہیں صنعت کار اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ( )
6. تجارت کے میدان میں مقابلے سے اخبارات کو نقصان پہنچا ہے۔ ( )

32B.2 اشتہار کی اہمیت اور افادیت

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ایک کے پاس آمدنی کے ذرائع محدود ہیں اور دوسرے کے پاس آمدنی کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ اخبار اور رسالے کی آمدنی کا ذریعہ اس کی فروخت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس زمانے میں جی رہے ہیں وہ صنعتی اور تجارتی زمانہ ہے۔ ایک ہی چیز کو سو آدمی بازار میں بیچ رہے ہیں اور ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی چیز فوراً بک جائے اور اچھے دام سے بک جائے۔ اس طرح ان سو آدمیوں کے درمیان مقابلے یا کمپٹیشن کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ ہر کوئی اپنی صلاحیت کے مطابق خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ وہ اپنی بنائی ہوئی چیز کی زبانی تعریف بھی کرے گا اور تحریری طور پر بھی کرے گا تاکہ اس کی بات زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ دوکانوں سے باہر بنے ہوئے شوکیس میں۔ مختلف چیزوں کی نمائش، چابی کے چھلوں، یعنی Key Ring پر، اسکوٹر کی اسٹپنی پر اور کار کے پیچھے دلکش حروف میں کسی کمپنی کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ان باتوں کو ہم اشیاء بنانے والوں کی طرف سے شہرت پانے یا مشہور ہونے کی کوشش کہہ سکتے ہیں۔ اس کوشش کو صحافت

نوٹ

اشتہار تیار کرنا

کی زبان میں اشتہار یا ایڈورٹائزنگ اینڈ پبلسٹی کہا جاتا ہے۔ تاجر اپنی اشیا کا اشتہار مختلف اخباروں میں دیتے ہیں۔ اس لیے کسی اخبار کی آمدنی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس میں کتنے اشتہار چھپتے ہیں۔ کسی اخبار میں زیادہ اشتہاروں کا چھپنا بذات خود اس کی شہرت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر اور لوگ اس میں اشتہار دینے کی خواہش کریں گے۔ جب اشتہاروں کی تعداد بڑھے گی تو اس سے اخبار کو دوہرا فائدہ ہوگا۔ ایک طرف اشتہار سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ ہوتا تو دوسری طرف اخبار کی زیادہ کاپیاں فروخت ہوں گی۔

صنعت کاروں کی بنائی ہوئی اشیا کو بازار میں شہرت دلانے اور اخبار کی آمدنی میں اضافہ کرنے میں اشتہار کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے خود اشتہار نویسی بھی ایک باقاعدہ فن بن گیا ہے۔ اب وہی اخبار مشتہر یا ایڈورٹائزر کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جو اس کے اشتہار کو پُر اثر پُرکشش انداز میں لکھتا ہوا اس کو نمایاں اور مناسب جگہ پر چھاپتا ہو۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہے تو وہ ایڈورٹائزر سے اپنی طرف سے مقرر کردہ معاوضہ لے سکتا ہے ورنہ معاوضے کے لیے اُسے ایڈورٹائزر ورٹائزر کے رحم وکرم پر رہنا پڑے گا۔ کم تعداد میں چھپنے والے اخباروں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے تجارتی اعلان کو اشتہار کہا جاتا ہے۔ اشتہار بازی اور سودا فروشی یعنی سیلز مین شپ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اشتہار کو اچھے انداز میں لکھنا باقاعدہ ایک فن ہے اس لیے ہندوستان میں بعض اہم اشتہاری ایجنسیاں مختلف صنعتی اور تجارتی بلکہ غیر تجارتی اور سرکاری اداروں سے بھی اشتہارات جمع کرا کے اخبارات میں شایع کرانے کا ذمہ لیتی ہیں۔ اس سے اشتہار دینے والے کا وقت بچ جاتا ہے اور اچھے اخبارات میں اس کی بنائی ہوئی چیز کا اشتہار عوام تک پہنچ جاتا ہے۔ کس اخبار میں اشتہار دے، شاید اس کا صحیح فیصلہ وہ خود نہ کر پاتا کیونکہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی والے اس میں پیشہ ورانہ مہارت رکھتے ہیں۔

کسی بھی اشتہار میں مسودہ مواد کی جاذب نظر ترتیب کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ اشتہار لکھنے والا اپنے تصور کی قوت سے ایک ایسا نقشہ کھینچتا ہے جس سے پڑھنے والے کو وہ پوری طرح متوجہ کرلے۔ کسی بھی اچھے اشتہار کی ابتدا ایک خیال سے ہوتی ہے۔ اشتہار بنانے والا، جسے کاپی رائٹر کہا جاتا ہے، کسی نہ کسی تصور کے ساتھ ایک خاکہ بناتا ہے، پھر یہ طے کرتا ہے کہ کون سی تصویر کس انداز میں وہاں بٹھائی جائے۔ اس پر سرخی کیا لگائی جائے۔ وہ کتنی جلی یا موٹی ہو یا مختصر ہو۔ اشتہار کے طے شدہ سائز کے مطابق الفاظ کی تعداد، ان کی موٹائی اور اس کے رنگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ یہ پورا خاکہ پہلے اشتہار نویس کے ذہن میں بنتا ہے پھر اُسے کاغذ پر اُتارا جاتا ہے۔

اشتہار کے خاکے کو صحافتی اصطلاح میں لے آؤٹ (Lay Out) کہا جاتا ہے اور اس کے مسودے کو کاپی۔ کاپی میں تصویروں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہت سے اشتہاروں میں صرف الفاظ ہوتے ہیں اور بعض میں صرف تصویر یا کارٹون سے کام لیا جاتا ہے اور الفاظ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایک نعرہ (Slogan) مثلاً سگریٹ مت پیو چاہے وہ عبداللہ

نوٹ

سگریٹ کیوں نہ ہو لکھ دیا جاتا ہے۔ اشتہاری سگریٹ کمپنیوں میں تصوراتی خاکے تیار کرنے والوں کو Visualiser کہا جاتا ہے۔ لے آوٹ کے لیے کوئی خاص اصول نہیں ہیں۔ اشیار کی مناسبت سے زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتی جاتی ہے۔ کسی بھی اشتہار کا لے آوٹ تیار کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کی توجہ حاصل کرے یعنی کہ گاہک کی توجہ فوراً اپنی طرف مبذول کرے۔ اس کے لیے ترغیبات یا Incentives کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ مثلاً بچت کا لالچ، تحفوں کی پیش کش اور گفٹ اسکیم، خریداری کے بعد مفت مرمت یا واپسی کی گارنٹی، قسطوں میں فروخت کا منصوبہ وغیرہ۔ اخبار خود اپنی تشہیر کے لیے بھی بعض طریقے اختیار کرتے ہیں مثلاً کچھ مدت کے لیے قیمت میں آدھی کمی، یا ایڈورٹائزروں کو متوجہ کرنے کے لیے اشتہارات کے نرخ میں رعایت۔

مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات ونشریات کے زیر انتظام چلنے والی ڈائرکٹوریٹ آف آڈیو ویژول پبلسٹی (DAVP) ہندوستان کی سب سے بڑی اشتہار رساں ایجنسی ہے کیونکہ اسی کی وساطت سے ملک بھر کے بڑے، درمیانی اور چھوٹے اخبارات کو سرکاری اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔

متن پر سوالات 32B.3

درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیں

ایک اچھا اشتہار نویس:

1. ایڈورٹائزر کی ضروریات کے بجائے اپنی پسند کو ترجیح دیتا ہے۔ ( )
2. کاپی میں زیادہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ( )
3. الفاظ کے سائز اور رنگ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ( )
4. اشیار کی مناسبت سے تصوراتی خاکہ تیار کرتا ہے اور خوبصورت، دلکش الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ( )

آپ نے کیا سیکھا؟

1. صحافت نے جب سے تجارت کی حیثیت اختیار کی ہے اس کا انتظامی ڈھانچہ بہتر ہو گیا ہے۔
2. صحافتی انتظامیہ کے تین شعبے ہیں، ادارتی، تجارتی اور مشینی۔
3. تجارت کے میدان میں مقابلہ بڑھ جانے کی وجہ سے اشتہارات کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔
4. اشتہار نویسی با قاعدہ ایک فن بن گیا ہے۔ خود اس میں بھی مقابلہ یا کمپٹیشن پیدا ہو گیا ہے۔
5. کامیاب اشتہار نویسی کے لیے تاجر یا اشتہار بنانے والے کی ضرورت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جس سے کہ خریدار کو

نوٹ

کوئی چیز خریدنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

32B.6 اختتامی سوالات

1. بروک بانڈ چائے کے لیے ایک اشتہار 30 الفاظ میں لکھیے جس سے اس کی خوبی پوری طرح واضح ہو جائے۔
2. بجاج کلاسیک اسکوٹر کا اشتہار کسی رعایت کے اعلان کے ساتھ لکھیے۔

متن پر سوالات کے جوابات

32B.1	(i)	شوق پیدا کرنے کے لیے
	(ii)	منافع بخش تجارت
	(iii)	وہ لائبریری میں جا کر اخبار پڑھ لے
	(iv)	شہر کے مرکز میں ہو
32B.2	(i)	(x)
	(ii)	(✓)
	(iii)	(✓)
	(iv)	(x)
	(v)	(✓)
	(vi)	(x)
32B.3	(i)	(x)
	(ii)	(x)
	(iii)	(x)
	(iv)	(✓)

نوٹ

33A

کمپیوٹر کے ذریعہ ہونے والے کام

کمپیوٹر ورک کا تعارف

پچھلی کلاس میں آپ نے کمپیوٹر کی تاریخ، اہمیت اور افادیت، کمپیوٹر کے پروگراموں، اجزار وآلات اور اردو سافٹ ویر کے بارے میں معلومات حاصل کی تھی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کمپیوٹر ایک الکٹرانک مشین ہے جس میں میموری (یادداشت) محفوظ ہوتی ہے۔ کمپیوٹر کی میموری میں آپ بہت سارے اعداد اور ہدایات کی فہرست محفوظ رکھ سکتے ہین۔ آپ ہزاروں قسم کی معلومات اس کی میموری مین جمع کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر مختلف ہدایات کے تحت کام کرتا ہے۔ ان ہدایات کو پروگرام کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر برقی ثنائی اصول پر مبنی ہے۔ اسے جفتی نظام کہا جاتا ہے جو کہ کمپیوٹر کی مشینی زبان کہلاتی ہے اسے کئی طریقے سے ادل بدل کر کے کئی ایسی زبانیں تیار کی جاتی ہیں جو ہماری زبان اور کمپیوٹر کی زبان میں مترجم کا کام کرتی ہے۔ کمپیوٹر کی مختلف زبانوں میں پاسکل بیسک فورٹین (Fortan) ویزول بیسک، + +C، سی سی ایڈاو وغیرہ کافی معروف ہیں۔ ان کی بنیاد پر پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شعبہ یا کام بچا ہو جس کے لیے پروگرام نہ بنایا گیا ہو۔ ان پروگراموں کے ذریعہ بیک وقت مختلف کاموں کو انجام دیا جاتا ہے۔ ان کاموں کو انجام دینے والے کمپیوٹر بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔

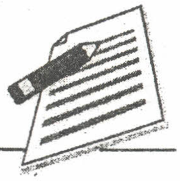

نوٹ

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

- بنیادی دستورالعمل (Basic operating system) کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں گے؛
- کچھ مخصوص کاموں کے پروگراموں کے بارے میں جان سکیں گے؛
- MS office اردو پروگرام ان پیج وغیرہ پروگراموں سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر سکیں گے؛
- فاصلاتی کمپیوٹنگ کے بارے میں جان سکیں گے؛
- انٹرنیٹ کے ذریعہ انجام دیے جانے والے کاموں سے واقفیت حاصل کر سکیں گے؛

33A.1 بنیادی دستورالعمل

اس کے تحت سارے پروگرام چلتے ہیں۔ اگر نظام میں کوئی خرابی آ گئی ہے تو یہ اس کا تدارک بھی بتائے گا۔ اس کے بعد جو پروگرام اسکرین پر ظاہر ہوتا ہے اسے ماحولی پروگرام (Enbironmental Program) کہا جاتا ہے۔ ماحولی پروگرام کئی ہیں بالفرض اس میں ماحولی پروگرام Window 98 بھرا ہوا ہے تب اس پروگرام کے تحت سارے پروگرام چلیں گے ان کی علامات بھی اسکرین پر ظاہر ہو ں اور اب یہ انتظار کرے گا کہ آپ کون سا پروگرام کھولتے ہیں۔

اس طرح یہ سارے کام ایک خودکار نظام کے تحت عمل میں آتے ہیں جس کو بنیادی دستورالعمل (Basic operating system) کہا جاتا ہے جو کسی بھی ساخت کے ہر کمپیوٹر کے لیے ضروری ہے۔ یہ چار کام انجام دیتا ہے۔

1. اندراجی واخراجی (Input/output) نظام کو درست اور قائم رکھنا۔
2. اندرونی اور خارجی یادداشت کے نظاموں کو درست رکھنا۔
3. فائلوں کے انتظام کو درست رکھنا۔
4. جاب ورک کے نظام کو درست رکھنا۔

کمپیوٹر کو بہت ساری کمپنیاں بناتی ہیں لیکن انھیں کسی نہ کسی معیار کے مطابق بنایا جاتا ہے جیسے Appse، IBM, ASCII وغیرہ۔ اسی طرح پروگرام بھی انھیں معیار کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ اس میں Dos نامی بنیادی دستورالعمل بھرا ہوا ہے جس کو مائکروسافٹ کمپنی نے IBM معیار کے مطابق بنایا ہے Dos-1، Dos-2، Dos-3، Dos-4، Dos-5، Dos-6، بتدریج افزائش شدہ پروگرام ہیں جن کی بنیاد ایک ہی ہے لیکن ان میں مزید سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔

اسی طرح دیگر کمپنیوں کے دستورالعمل ہیں: UNIX (بیل لیبوریٹریز کا بنا ہوا) VENIX (وینچر کوم انک)، VAX (ڈیجیٹل

نوٹ

اسکوپ منٹ)، PCIX (آئی بی ایم کمپنی)، CPIM (ڈیجی ٹل ریسرچ)، DEC (ڈیجی اسکوپ نیٹ) وغیرہ وغیرہ۔

متن پر مبنی سوالات 33A.1

1. بنیادی دستور العمل کسے کہتے ہیں؟
2. کمپیوٹر میں بنیادی دستور العمل کیا کام انجام دیتا ہے؟
3. تین مختلف کمپنیوں کے بنائے گئے دستور العمل معہ کمپنی کے نام لکھیے۔
4. DOS کے اب تک کتنے افزائش شدہ پروگرام آچکے ہیں ان کو کس کے معیار کے مطابق بنایا گیا ہے۔

33A.2 ٹائپنگ کے مختلف پروگرام

Dos کا مطلب ہے کمپیوٹر کچھ ہدایات کے زیر اثر کام کرنے لائق ہو گیا ہے۔ اگر اس سے کوئی کام لینا ہے تب اس کو اس کام سے متعلق ہدایت فراہم کرنی ہوگی۔ Dos کے لیے Windows کا استعمال کیا جاتا ہے اور کار مفوضہ یعنی جاب ورک کے لیے Word نامی پروگرام کمپیوٹر میں ڈالنا ہوگا۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ کمپیوٹر کی میموری میں درج ذیل چیزیں ہونی چاہیے:

1. Dos پروگرام یعنی ایک بنیادی دستور العمل
2. Windows یعنی ایک ماحولیاتی پروگرام
3. Word یعنی ایک خاص کام کرنے والا پروگرام جو Windows کے ماحول میں کام انجام دے سکتا ہے اس کے تحت خط، دستاویز، کتابیں، رپورٹیں معہ جدول کے ٹائپ کیا جا سکتا ہے۔
4. Animation پروگرام جس سے آپ کارٹون وغیرہ بنا کر اس خط یا دستاویز میں شامل کر سکتے ہیں اور اگر کمپیوٹر قاصد کا کام بھی لیا جاتا ہے تب اپنے خط یا دستاویز Telnet یا فاصلاتی نظام کمپیوٹر کے پروگراموں جیسے Internet Explorer یا E-mail سے کام لینا پڑے گا۔

ہر طرح کے کام انجام دینے کے لیے علاحدہ علاحدہ پروگرام بنائے جاتے ہیں جیسے تجارتی اداروں کے حساب کتاب کے لیے Tally پروگرام، فوٹو یا ویڈیو کی تصحیح کے لیے Photo Finish پروگرام، بینکوں سے متعلق Instant Teloes، تفریح طبع کے لیے عددی میوزک، ویڈیو کلپنگ یا سنیما کی CD دیکھنے سے متعلق پروگرام

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 33A.2

1. کمپیوٹر پر خط یا دیگر کوئی دستاویز ٹائپ کرنے کے لیے کون کون سے پروگرام ہونا ضروری ہے؟
2. کسی ماحولیاتی پروگرام کا نام بتائیے۔
3. کچھ مخصوص کاموں کے پروگراموں کے نام بتائیے۔

MS OFFICE

یہ ایک ایسا پروگرام ہے جس میں دفتر کے متعلق ہر کام کا پروگرام شامل کیا گیا ہے جو مختلف کام انجام دے سکتے ہیں MS Office میں شامل پروگرام درج ذیل ہیں:

(1)MS Word (2)MS Excel (3) MS Powrer Point (4)MS Schedule (5) Ms Access

آیئے ہر ایک بارے میں کچھ واقفیت حاصل کریں۔

MS Word: یہ ایک انگریزی میں ٹائپنگ کا پروگرام ہے۔ اس میں آپ اپنے خطوط، یادداشتیں، رپورٹ یا کتابیں اور دستاویز وغیرہ ٹائپ کر سکتے ہیں۔ اس میں یہ بھی گنجائش ہے کہ اس کے تحت متن سے متعلق تصاویر، نقشے، جدول اور سنیما کی طرح ویڈیو کلپنگ بھی محفوظ کی جاسکتی ہے اور E-mail کے ذریعہ دنیا میں کہیں بھیجی جاسکتی ہے۔

MS Access: اس کے تحت لوگوں کے پتے اور کوائف، تاجرانہ ریکارڈ، قیمتوں کی فہرست، دعوت نامے، مارک شیٹ، شناختی کارڈ وغیرہ جیسے کام بہت ہی کم وقت میں تیار کیے جاسکتے ہیں۔ ان کا ریکارڈ رکھا جاسکتا ہے اور متعلقہ لوگوں کو انھیں ارسال کیا جاسکتا ہے۔ ہر سال اس پروگرام کو اپ ڈیٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے پروگرام کو ڈیٹا بیس سافٹ ویر کہا جاسکتا ہے۔

MS Excel: یہ وہ پروگرام ہے جس میں بہی کھاتے، خریداری و فروخت کا حساب کتاب بیلنس شیٹ، چارٹ، جدول وغیرہ بنایا جاسکتا ہے۔

MS Power Point: وہ پروگرام ہے جس میں فائلوں کے سرورق، دعوت نامے، بیلنس شیٹ کے کور ڈیزائن، نمائشی سلائنڈ، فلمیں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔

MS Schedule: اس میں کارخانے کی بکری یا مال بنوانے کا نظام اوقات رکھا جاسکتا ہے۔ ریلوے یا ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کی ایڈوانس بکنگ ان ہی جیسے پروگراموں میں مہینوں پہلے رکھ دی جاتی ہیں۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 33A.3

1. MS آفس کیا ہے؟ اس میں شامل کچھ ضمنی پروگراموں کے نام لکھیے۔
2. MS Word کے بارے میں مختصراً بتائیے۔
3. MS Access کے تحت کیا کام انجام دیے جاتے ہیں؟
4. بہی کھاتے، بیلنس شیٹ وغیرہ کس پروگرام کے تحت تیار کیے جاتے ہیں؟
5. MS Power Point اور MS Schedule کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

33A.3 کمپیوٹر کے ذریعے بات چیت

یہ فاصلاتی کمپیوٹنگ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آپ اپنے گھر پر بیٹھ کر دوسرے کمپیوٹر یا اپنے ہی کمپیوٹر کی فائل دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں تبدیلی کر سکتے ہیں (اگر اس کی گنجائش اس کمپیوٹر میں ہے تو) اپنے حساب کی وہ قیمتی آلات استعمال کر سکتے ہیں جو ہم نہیں خرید سکتے جیسے کہ طابع، موڈیم وغیرہ وغیرہ۔ یہ ٹیلی مواصلات سیارہ (Tele Communication sattelite) وسیلے سے ممکن ہو پا رہا ہے۔ زمین کے چاروں طرف ایک مصنوعی ترسیلی سیارہ مستقل چکر لگا رہا ہے۔ ہم لوگ ہر خطے میں ایک بڑے ڈش این ٹینا کے ذریعہ اپنے پیغامات بھیجتے اور وصول کرتے ہیں۔ ہم اس نظام تک ٹیلی فون یا چھوٹے ڈش این ٹینا کے ذریعہ پہنچتے ہیں جو ہمارے کمپیوٹر سے ایک آلہ موڈیم کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ یہ موڈیم ہمارے ٹائپ کیے ہوئے متن، آواز اور منظر وغیرہ کو عددی ترنگوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور باہر سے آئے ہوئے عددی ترنگوں میں آئے ہوئے پیغامات کو متن یا آواز یا منظر میں تبدیل کر دیتا ہے جو ہمارے کمپیوٹر میں آجاتا ہے۔

ہم جو بھی پیغامات بھیجتے ہیں وہ ایک کمپیوٹر میں جا کر جمع ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ جہاں جمع ہوں گے وہ کوئی جگہ تو ہوگی جس کا کوئی پتا ہوگا گو کہ اگر کوئی شخص اس پتے کو جانتا ہوگا تب وہ ان پیغامات کو اس پتے پر دیکھ سکتا ہے۔

اب فرحان کی بات ہی لیجیے۔ ان کا ایک انٹرنیٹ کا پتا ہے

Farhan@yaho.com

اسی طرح ساجد کا اپنا پتا ہے:

Sajid Farhan@india.com

دونوں ایک دوسرے کے پتے پر پیغامات بھیجتے ہیں۔ اگر اتفاق سے ان دونوں کے ذریعہ بیک وقت عمل ہو رہا ہو تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے بات چیت کر رہے ہوں۔

نوٹ

فرض کیجیے فرحان کوئی پیغام ساجد کے نام لکھنا چاہتا ہے تب وہ "Internet Explorer" کے خالی خانے میں اپنا پتا ٹائپ کریں گے اور Send پر کلک کر کے اپنا پتا تلاش کرنے کی ہدایت دے گا۔ تھوڑی ہی دیر میں yahoo کا صفحہ نکل آئے گا اب اس میں دو خانے خالی ہوں گے۔ ایک میں انھیں اپنا پتا ٹائپ کرنا پڑے گا اور دوسرے خانے میں اپنا خفیہ رمز جو صرف وہی جانتے ہیں، ٹائپ کرنا ہوگا۔ اس خفیہ رمز کے بغیر یا اس میں غلطی ہونے پر فرحان کی جگہ نہیں کھلے گی۔ اگر ان کا پتا اور ان کا خفیہ رمز صحیح طور پر ٹائپ ہو گئے ہوں گے تو فرحان کی جگہ کا صفحہ کھل کر سامنے آجائے گا جس میں اپنا پیغام ساجد کے نام لکھ کر اس پر ساجد کا پتا Sajid Farhan@India.com لکھ کر اسے بھیجنے (فرحان کے صفحہ پر Send) پر کلک کریں گے، اب ساجد کا پتا صحیح ٹائپ ہوا ہوگا تو ذرا سی دیر میں فرحان کے صفحہ پر پیغام وارد ہو جائے گا کہ پیغام پہونچا دیا گیا اور اگر غلط ہوا تو Address not Found پیغام آجائے گا۔ آپ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ (NIOS) کا صفحہ بھی اسی انٹرنیٹ سے پتے پر کھول سکتے ہیں اور وہاں سے مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

متن پر مبنی سوالات 33A.4

1. انٹرنیٹ پر ڈاک بھیجنے کے لیے کس آلے کی ضرورت پڑتی ہے؟
2. انٹرنیٹ کے ایک پتے کی مثال دیجیے۔
3. انٹرنیٹ پر ذاتی خط و کتابت کے علاوہ کیا کام ہو سکتے ہیں؟

33A.4 کمپیوٹر کا طریقۂ استعمال

سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ کمپیوٹر CVT اور بجلی سے جڑا ہوا ہے کہ اور اس کے بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ مانیٹر میں بجلی جل بجھ رہی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو پہلے آن کریں، پھر مانیٹر کا سوئچ دبائیں جب دونوں چالو ہو جائیں نیچے لگا ہوا CPU کا بٹن دبا دیں۔ ان سب میں ہرے رنگ کا بلب جلنے کا مطلب ہے کہ یہ کام کر رہے ہیں۔ CPU کا بٹن دباتے ہی کمپیوٹر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے کمپیوٹر سے متعلق اطلاعات اسکرین پر نظر آتی ہے جو کچھ وقفے میں غائب ہو جاتی ہیں اگر کمپیوٹر میں کچھ نقص ہوگا تب اس کا پیغام اسکرین پر آجائے گا اور ساتھ ہی اس کو صحیح کرنے کا طریقہ بھی۔ دیگر صورت میں Windows کے تمام اطلاعاتی منظر آتے جاتے ہیں۔ آخر میں Window کا منظر ٹھہر جاتا ہے۔ جس پر مختلف علامات دکھائی دے رہے ہیں جن کے نیچے ان کا نام بھی لکھا ہے۔

Mouse ہلانے جلانے پر اسکرین پر پیکان موس کی حرکت کے ساتھ ہلتا نظر آئے گا۔ اس کی علامات پر دایاں بٹن دبایئے۔ بٹن دباتے ہی ایک مینو وارد ہو جائے گا جس میں ہر لائن کے اوپر مختلف احکامات لکھے ہوں گے۔ آپ پیکان کو Open پر

نوٹ

لائیے اس کی پٹی کالی ہوجائے گا اور حروف سفید پڑ جائیں گے۔اس کا مطلب ہے کہ یہ حکم منتخب (Select) ہوگیا۔اب آپ ماوس کا بایاں بٹن دبایئے۔اس کے دباتے ہی آپ دیکھیں گے کہ اسکرین پر مختلف منظر آجار ہے ہین اور آخر میں یہ منظر ٹھہر چکا ہے

یہ MS Word کا دریچہ ہے اس میں ٹائپ کیا جاسکتا ہے

کچھ ابتدائی باتیں دھیان رکھنا ضروری ہے:

سب سے اوپر ایک معکوس پٹی ہوتی ہے اس میں زمین کالی ہے اور حروف سفید ہیں۔اس کے ایک کونے پر MS Word لکھا ہے اور ساتھ ہی New File بھی۔اسی کے دوسری طرف تین مرجع اس کو لوح عنوان (Title Bar) کہتے ہیں۔ جب ہم اس فائل میں کام کر لیتے ہیں تو اس فائل کو کسی نام کے تحت محفوظ کر لیتے ہین اس وقت وہ نام جس کے تحت یہ فائل محفوظ کی گئی ہے MS Word کے برابر میں آجاتا ہے۔

ان تینوں مربعوں پر پیکان لاکر بایاں بٹن دبانے سے فائل بند ہوجائے گی۔مگر بند ہونے سے پہلے یہ سوال وارد ہوگا کہ اس فائل کو محفوظ کر رہے ہین یا نہیں YES/ NO اور YES پر کلک کریں گے تو پھر یہ سوال ہوگا کہ کس نام کے تحت۔وارد ہوئے استفسار یہ میں آپ کوئی بھی نام ٹائپ کر سکتے ہیں اور پھر کی بورڈ پر ENTER نام کی کلید دبادیں تو یہ فائل اسی نام کے تحت محفوظ ہوجائے گی جو آپ نے ٹائپ کیا ہوگا۔اگر No پر کلک کر دیا تو MS Word کا Window بند ہوجائے گا۔ Restore Down پر کلک کرنے پر پورے اسکرین پر پھیلا ہوا Window سکڑ کر چھوٹا ہوجائے گا۔Minimize پر کلک کرنے سے Window بالکل سکڑ کر اسکرین کے سب سے نچلے حصے میں ایک چھوٹی پٹی کی طرح آجائے گا اب آپ کوئی بھی دوسرا پروگرام کھول کر اس میں کام کیا جاسکتا ہے۔Word کے Window کو واپس لانے کے لیے نچلی پٹی پر پیکان لاکر کلک کریں گے تو Window پھیل پر اسکرین پر وارد ہوجائے گا۔

نیچے کی پٹی مینو بار کہلاتی ہے۔اس پر درج ذیل الفاظ لکھے ہیں جن پر پیکان لاکر کلک کرنے سے ایک فہرست امور (Menu) نکلتی ہے جس میں کئی امور لکھے ہوتے ہیں جس امر پر پیکان لاکر کلک کریں اس کام کرنے کا عمل شروع ہوجائے گا۔ہوسکتا کسی کام کے لیے مزید استفسار ہے نکل پڑیں جن پر عمل کرنے سے کام مکمل ہوسکے۔الفاظ یہ ہیں

File, Edit, View, Insert, Formet, Teats, Table, Window, Menu

مثال کے لیے اگر ہم File پر لاکر کلک کرتے ہیں تب اس میں درج ذیل فہرست نمودار ہوگی۔اس میں علامت New پر کلک کرنے سے ایک نئے دستاویز کا صفحہ نکل آتا ہے۔یہی کام تختہ کلید پر Ctrl کلیدوں کو ایک ساتھ دبانے سے بھی نہیں کام عمل میں آتا ہے۔

نوٹ

دوسری علامت Open پر کلک کرنے سے موجودہ فائلوں کے علاوہ پچھلی فائلوں کے نام کی فہرست نکل آتی ہے جس میں جس بھی فائل کو منتخب کریں گے اور پھر OPEN پر کلک کریں گے وہی فائل اسکرین پر موجودہ فائل کی جگہ پھیل جائے گی۔

تیسری علامت Close پر کلک کرنے سے موجودہ دستاویز بند ہوجائے گی۔ اسی طرح سے نیچے کے احکامات انجام دیے جاسکتے ہیں۔

دو باتوں کا خیال رکھیے (1) جو الفاظ صاف وشفاف فہرستوں پر نظر آتے یں۔ آپ صرف وہی کام انجام دے سکتے ہیں جو الفاظ مبہم یا دھندلے نظر آتے ہیں وہ اس وقت انجام نہیں دیے جاسکتے (2) علامت کے سامنے کلیدوں کے نام حروف تہجی کے لکھے ہیں وہ احکامات ان کلیدوں اور حروف تہجی کی کلیدوں کو ایک ساتھ دبا کر انجام دیے جاسکتے ہیں۔

تختہ کلید پر کسی بھی حرف کے کلید کو دبایئے۔ آپ دیکھیں گے جگہ وہ اس عمودی خط کے پیچھے آ گیا ہے جسے کرسر کہتے ہیں۔ اسی طرح جب بھی آپ کسی حرف کے کلید دبائیں گے وہ فری اس کرسر کی جگہ وارد ہوجائے گا اور کرسر آگے بڑھ جائے گا اور اگر Spece کی جگہ والی کلید دبائی جائے تب کرسر ایک حرف کی جگہ خالی چھوڑ جائے گا اور اگر Tab دبائیں گے تب دو تین حروف کی جگہ چھوڑ کر کرسر آگے جا کر کھڑا ہوجائے گا۔

مطلب یہ کہ اس کرسر سے یہ پتا چلے گا کہ اگلا حروف کہاں آئے گا اور Spece اور Tab کی کلید میں بتدریج فقروں میں جگہ چھوڑنے یا پیراگرافوں کی جگہ چھوڑنے کے کام آتی ہے۔ غلط حروف ٹائپ ہونے پر آپ اس کلید کے Back Spece کو دبایئے۔ کرسر پیچھے چلتا چلا جائے گا اور حروف مٹنے چلے جائیں گے۔ غلط ہجے لکھنے پر لفظوں کے نیچے سرخ لائن آجاتی ہے۔ Mouse کو ہلا کر کرسر کو غلط حروف کے بیچ میں لا کر کلک کرنے پر درست کیا جاسکتا ہے۔

مان لیجیے New Delte غلط ٹائپ ہوگیا ہے۔ کرسر کو بیچ میں لا کر کلک کرنے پر ایک پٹی وارد ہوتی ہے جس میں سب سے اوپر New Delte اور نیچے چیزیں لکھی ہوتی ہیں۔

اب پیکان کو New delte پر لا کر کلک کردیں۔ فوراً ہی New dele وہاں سے غائب ہوجائے گا اور اس کی جگہ New Delte آجائے گا۔

اسی طرح اس میں ہجے کی غلطیاں بھی درست ہوسکتی ہیں

لفافے پر پتہ لکھنا

پہلے پیغامات کو محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لفظ TOOLS پر کلک کریں اس میں جو فہرست نکلے اس میں Envelop and tabel پر کلک کریں۔ اسکرین ایک خانہ دار استفسار یہ نکل آتا ہے۔

نوٹ

اب آپ جہاں Delivery Address لکھا ہے وہاں خط پانے والے کا پتا لکھا جاسکتا ہے اور جہاں Return Address لکھا ہے وہاں بھیجنے والے کا پتا لکھا جاسکتا ہے اور پھر لفافے کو (Feed) کے حساب سے طابع میں رکھ کر پرنٹ پر پیکان لاکر کلک کر دیا جاتا ہے۔ اس سے تھوڑی دیر میں دونوں پتے ٹائپ ہو کر باہر آجائے گا۔

وغیرہ۔

متن پر مبنی سوالات 33A.5

1. کمپیوٹر کس طرح کام شروع کرتا ہے؟
2. درج عنوان (Title Bar) کسے کہا جاتا ہے؟
3. Space اور Tab کی کلیدوں کا کیا کام ہے؟
4. لفافے پر پتہ کس طرح تحریر کیا جاتا ہے؟

33 A.5 اردو پروگرام میں طریقہ عمل

Windows98 کے اسکرین پر INPAGE نامی پروگرام پر کلک کر کے کھول لیں۔ یہ MS Word کی طرح ہے مگر اس میں بائیں طرف علامات کی لڑی بنی ہوتی ہے۔

اگر ٹائپ کرنا ہو تو سب سے پہلے پیکان کو منتخب کیجیے پھر جو پہلا Tool ہے اس پر کلک کر کے پیکان کو لوح پر لے آئیے۔

موس کو ہلا کر اس کے پیکان کو ایک سرے پر لے آئیے اور موس کا بایاں بٹن دباتے ہوئے اس سے پہلے عمودی طور پر اور پھر افقی طور پر ×Ō گھسیٹیے یہ دیکھیے کہ ایک چوکھٹا سا بن گیا ہے جس میں آٹھ کالے مربع بنے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ چوکھٹا اس وقت بھی منتخب حالت میں ہے۔ آپ اس وقت دو کالم کر سکتے ہیں۔

(1) کالے پر پیکان لاکر بایاں بٹن دبا کر گھسیٹنے سے یہ مربع اس سمت پر بڑا یا چھوٹا ہو جائے گا جس سمت میں آپ اسے لے جائیں گے اس کو حسب ضرورت چھوٹا یا بڑا کیا جاسکتا ہے۔

(2) اس کے بیچ میں پیکان کر بایاں بٹن دبا کر آپ اس کو کہیں بھی گھسیٹ کر لوح میں رکھ سکتے ہیں۔ اس درمیان یہ چھوٹا بڑا نہیں ہوگا اب پیکان کو ایک سرے پر لاکر چھوٹا سا کلک کر دیجیے۔

یہ دیکھیے کہ آپ کا کرسر اس مربع کے ایک کونے میں سے سب سے اوپر جھلملا رہا ہے۔ یہاں سے آپ کا ٹائپ شروع ہوگا۔ انگریزی کے تختہ کلید کو اردو کے تختہ کلید میں بدلا جائے گا۔ ویسے تو کئی طرح کے تختہ کلید لوگوں نے بنائے ہیں لیکن اس میں سے

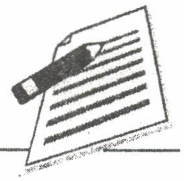

نوٹ

صوتی (Phonetic) نامی تختہ کلید سب سے بہتر رہے گا کیونکہ یہ انگریزی کلید کی آوازوں اور اردو کی آوازوں میں مطابقت رکھتا ہے مثلاً A دبائیں گے تو الف B دبائیں گے تو ب، S دبائیں گے تو س وغیرہ وغیرہ ٹائپ ہوتا ہے۔ اس تختہ کلید کی مکمل شکل یہ ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے خانوں میں کہیں کہیں دو حروف لکھے ہیں۔ مثلاً ک چ ٹ ت ص س وغیرہ

یہ وہ حروف ہیں جو Shift کی کلید دبا کر اگر دبائے جائیں ت اوپر کا حرف ٹائپ ہوگا مثلاً شفٹ دبا کر آپ اگر K دبائیں گے تو خ ٹائپ ہوگا، S دبائیں گے تو ص ٹائپ ہوگا جبکہ بغیر Shift کے K دبائیں گے تو ک اور S دبائیں تو س ٹائپ ہوگا۔

یعنی جو ترکیب ہم انگریزی میں بڑے حروف ٹائپ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اس کو بھاری صورتی حروف کے لیے استعمال کریں۔

دوسری یہ ہے کہ آپ جب کسی لفظ کو ٹائپ کریں گے تو اس کے حروف دبانے کے بعد جگہ (Space) کی کلید ضرور دبائیں تا کہ وہ حروف جڑنے بند ہو جائیں ورنہ وہ جڑتے ہی رہیں گے۔ مثال کے لیے ک م ال Space ہ Space ے Space ص ا ح ب Space دبائیں (کمال ہے صاحب) لکھا جائے گا ورنہ کمالیصاحب ہو جائے گا۔
تیسری بات جو دھیان میں رکھنے والی ہے وہ ہے حرف کا خط اور اس کا سائز یہ دیکھیے کہ یہاں Nori Nastalique لکھا ہے اور اس کے سامنے والے خانے میں 12 نمبر لکھا ہے نوری نستعلیق سب سے بہتر اردو کا خط مانا گیا ہے اور اس کا سائز فی الحال 12 پوائنٹ ہے۔ آپ اس پیکان پر کلک کرکے ایک فہرست نکال سکتے ہیں اور اس فہرست پر پیکان 18,16,14-----72 جو بھی آپ کی مرضی ہو کلک کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے آپ کے حروف کا سائز بڑا ہو جائے گا۔
اردو ٹائپ کرتے کرتے اگر انگریزی لکھنی ہو تو Ctrl+Space دبانے سے انگریزی ٹائپ ہونا شروع ہو جاتی ہے اور دوبارہ اسے دبانے سے اردو شروع ہو جاتی ہے۔

متن پر مبنی سوالات 33A.6

1. درج ذیل بیان میں اگر صحیح ہو تو ہاں لکھیے ورنہ نہیں

a انگریزی کے تختہ کلید کو اردو کے تختہ کلید میں بدلا جاتا ہے (ہاں/نہیں)

b Phonetic نامی کلید کو بہتر نہیں مانا جاتا (ہاں/نہیں)

c اردو پروگراموں میں سب سے زیادہ مستعمل اور بہتر پروگرام 'ان پیج' کا ہے (ہاں/نہیں)

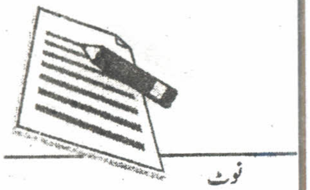

نوٹ

آپ نے کیا سیکھا؟

- کمپیوٹر کے سارے کام خودکاری نظام کے تحت ہوتے ہیں جس کو بنیادی دستور العمل (Basic operating System) کہا جاتا ہے۔
- مختلف کمپنیوں کے بنیادی دستور العمل سے آپ کو واقفیت حاصل ہوگی۔
- بنیادی دستور العمل اندراجی اور اخراجی نظام اندرونی وخارجی یادداشت کے نظاموں، فائلوں اور جاب ورک کے نظاموں کو درست اور قائم رکھتا ہے۔
- MS Office ایک ایسا پروگرام ہے جس میں دفتر کے متعلق ہر کام کا پروگرام شامل ہے۔ اس پروگرام میں کئی ضمنی پروگرام بھی شامل ہوئے ہیں۔
- کمپیوٹر کے ذریعہ پیغام رسانی، بات چیت، ٹیلی مواصلاتی سیارے کے وسیلے سے ممکن ہوسکی ہے۔
- MS Office کے تحت آپ نے ٹائپنگ اور اس سے متعلق کام کی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔
- اردو پروگرام سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے آپ نے ''ان پیج'' اردو سے اردو ٹائپنگ سیکھیں۔

اختتامی سوالات 33A.9

1. اردو پروگرام کے بارے میں تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. MS Office پروگرام کسے کہتے ہیں اس میں کون کون سے ضمنی پروگرام شامل ہیں۔
3. انٹرنیٹ کے ذریعہ آپ پیغام کس طرح بھیجتے اور وصول کرتے ہیں۔
4. اردو ٹائپنگ کیسے کرتے ہیں؟ بیان کیجیے۔
5. اردو ٹائپنگ انگریزی ٹائپنگ سے کس طرح مختلف ہوتی ہے؟
6. کمپیوٹر کی افادیت اور اہمیت پر تبصرہ کیجیے۔
7. انٹرنیٹ کے فوائد کے بارے میں بتایئے اور نقصانات سے آگاہ کیجیے۔

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

33A.1

1. کمپیوٹر کے سارے کام ایک خودکار نظام کے تحت عمل میں آتے ہیں جس کو بنیادی دستور العمل کہا جاتا ہے۔
2. اندراجی واخراجی، اندرونی وخارجی یادداشتوں، فائلوں اور جاب ورک کے نظام کو درست رکھنا۔

3. UNIX (بیل لیبوریٹیز کا بنا ہوا)، VAX (ڈیجی ٹل اسکوپ نیٹ) PCIX (آئی۔بی۔ایم۔کمپنی)

4. DOS کو IBM کے معیار کے مطابق بنایا گیا ہے اس کے افزائش شدہ پروگرام Dos_1, Dos_2, Dos_3, Dos_4, Dos_5, Dos_6 ہیں

33A.2

1. کمپیوٹر کی میموری میں درج ذیل چیزیں ہونی چاہیے۔
   (1) Dos پروگرام یعنی ایک بنیادی دستور العمل
   (2) Windows یعنی ایک ماحولیاتی پروگرام
   (3) Word یعنی ایک خاص کام کرنے والا پروگرام جو Window کے ماحول میں کام انجام دے سکتا ہے

2. Windows

3. Instant Telle Photo Finish, Tally ڈی جی ٹل میوزک وغیرہ

33A.3

1. یہ ایک ایسا پروگرام ہے جس میں دفتر کے متعلق ہر کام کا پروگرام شامل کیا گیا ہے MS Power Point, MS Excel, MS Word وغیرہ

2. MS Word اس میں خطوط یادداشتیں رپورٹیں، کتاب وغیرہ ٹائپ کی جاسکتی ہے۔ یہ انگریزی میں ٹائپنگ کا ایک پروگرام ہے

3. MS Access کے تحت لوگوں کے پتے اور کوائف، تاجرانہ ریکارڈ، دعوت نامے، شناختی کارڈ وغیرہ ٹائپ کیے جاتے ہیں۔

4. MS Excel میں

5. دیکھیے سیکشن 4

33A.4

1. ٹیلی فون یا چھوٹا ڈش اینٹینا جو ہمارے کمپیوٹر سے ایک آلہ موڈیم کے ساتھ جڑا ہوا رہتا ہے

2. Farhan@yahoo.com

3. معلومات حاصل کرنا فراہم کرنا، انٹرنیٹ کے ذریعہ رقم ارسال کرنا وغیرہ وغیرہ

نوٹ

33A.5

1. CPU کا بٹن دباتے ہی کمپیوٹر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔
2. فائل کی اوپر والی پٹی کو Title Bar کہتے ہیں
3. Tab اور Space جگہ چھوڑنے کے کام آتی ہے۔
4. Mail Merge کے ذریعہ

33A.6

1. a ہاں b نہیں c ہاں

نوٹ

33B

الکٹرانک میڈیا میں اردو کی اہمیت

تعارف

الکٹرانک میڈیا ماس میڈیا کا ایک حصّہ ہے ماس؛ یعنی عوام، بہت سے لوگ، مجمع— میڈیا؛ یعنی عوام تک بات پہنچانے کا ذریعہ۔ یہ دونوں چیزیں مل کر آج کے زمانے میں زندگی کا حصّہ بن گئی ہیں۔

ماس میڈیا میں ہر وہ ذریعہ شامل ہے جس سے عوام تک بات پہنچائی جا سکے۔ مگر، اس کی دو قسمیں زیادہ رائج ہیں:

1. پرنٹ میڈیا: یعنی اخبار وغیرہ۔
2. الکٹرانک میڈیا: یعنی ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن وغیرہ

ماس میڈیا میں زبان کی بہت اہمیت ہوتی ہے

33B.1 اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ کیا سیکھیں گے

- ماس میڈیا کے بارے میں جان سکیں گے
- الکٹرانک میڈیا کے بارے میں جان سکیں گے
- الکٹرانک میڈیا کی زبان کے بارے میں جان سکیں گے

نوٹ

- الکٹرانک میڈیا میں اردو زبان کی اہمیت سے واقف ہو سکیں گے

33B.2 ماس میڈیا میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت

موجودہ زمانے میں ماس میڈیا نے جس صورت میں سب سے زیادہ عوامی زندگی پہ اثر ڈالا ہے وہ الکٹرانک میڈیا ہے۔ الکٹرانک میڈیا میں ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، ای میل وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔

ریڈیو

ریڈیو الکٹرانک میڈیا کا بہت اہم حصہ ہے۔ ریڈیو ہمارے ملک میں 1927ء میں بمبئی میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن سے شروع ہوا۔ یہ اسٹیشن ڈیڑھ کلوواٹ کا تھا اور اسے براڈ کاسٹنگ کمپنی نے قائم کیا تھا۔ 1930ء میں یہ براڈ کاسٹنگ کمپنی بند ہو گئی اور انڈین براڈ کاسٹنگ سروس شروع ہوئی۔

1936ء میں اس کا نام آل انڈیا ریڈیو ہو گیا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس میں تیزی سے ترقی ہوئی۔ اب ملک کے ایک بڑے حصے تک اس کی آواز پہنچتی ہے۔

فلم

فلم بھی الکٹرانک میڈیا کی مقبول ترین صنف ہے۔ فلم آج بھی عوام کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری جسے بالی وڈ بھی کہا جاتا ہے دنیا کی بڑی فلم انڈسٹریوں میں سے ایک ہے۔
فلم کی اپنی ایک تاریخ بھی ہے اور اپنا ایک اثر بھی ہے۔ فلم اور ٹیلی ویژن دونوں بظاہر یکساں میڈیم نظر آتے ہیں مگر دونوں کے اثرات اور ٹیکنک میں بہت فرق ہے۔

ٹیلی ویژن

الکٹرانک میڈیا میں سب سے زیادہ مقبول ٹی وی ہے جس نے فلم اور ریڈیو کی مقبولیت کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

اب ٹیلی ویژن فلم انڈسٹری سے بھی بڑی انڈسٹری ہے لاکھوں لوگ اس سے روزی بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن کے عمر چار دہائیوں سے زیادہ ہے۔ ان برسوں میں ٹیلی ویژن نے کئی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کافی ترقی کی ہے۔ اس کی عوامیت اور مقبولیت میں گذشتہ دہائیوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن کے فروغ کی اس رفتار میں اس پر پیش کیا جانے والا مواد، پیش کرنے کی تکنیک اور طریقے کا بہت بڑا حصہ ہے۔

نوٹ

الکٹرانک میڈیا میں اردو کی اہمیت

ٹیلی ویژن پر ان واضح تبدیلیوں نے ٹی وی انڈسٹری کی دنیا میں ہندوستانی ٹی وی کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ دہلی میں تجربہ کے طور پر یونیسکو کی مدد سے 15 ستمبر 1959ء میں پہلا ٹی وی سینٹر بنایا گیا۔ اس وقت یہ صرف دہلی شہر کے کچھ علاقوں تک ہی میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اس وقت ہفتہ میں صرف چند گھنٹوں کے لیے ہی پروگرام ہوتے تھے اور انھیں کمیونٹی سینٹرز میں رکھے ٹی وی سیٹوں پر دیکھا جاتا تھا۔ آج سیٹلائٹ نے ٹی وی چینلز کو اتنا عام اور دور دور پہنچا دیا ہے اور چوبیس گھنٹے چلنے والے درجنوں چینلز موجود ہیں کہ یہ باتیں کہانی سی لگتی ہیں۔

1959ء سے 1986ء تک ٹیلی ویژن کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی اس بیچ اسکول ٹی وی محدود طریقے پر شروع کیا گیا۔ 1972ء میں بمبئی میں ٹی وی کا دوسرا مرکز بنا۔ یہ ہندوستان کا پہلا پروفیشنل ٹی وی سینٹر تھا۔ اس کا سارا ساز وسامان مغربی جرمنی نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ پھر مہاراشٹر کے دوسرے شہر پونے میں ریلے سینٹر قائم ہوا جس کی مدد سے بمبئی سینٹر کے پروگرام گاؤں گاؤں پھیل گئے اور دیہات کی ایک بڑی آبادی تک ٹی وی کی پہنچ ہوگئی۔

امریکی سیٹلائٹ کے ذریعے ہندوستان کی مزید چھ ریاستوں کو اس سے منسلک کر دیا گیا اور اس طرح ٹی وی کے پھیلاؤ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

انسیٹ (1) سیٹلائٹ کے ذریعے 15 اگست 1982ء کو نیشنل ٹیلی کاسٹ شروع کی گئیں۔ دہلی سے نیشنل پروگرام کی شروعات کے ساتھ ساتھ اسی دن رنگین ٹی وی نشریات کا آغاز بھی ہوا۔ نومبر 1982ء میں دہلی سے نویں ایشیائی کھیلوں کے براہ راست آغاز سے ہندوستان میں کسی بڑے آؤٹ ڈور کو براہ راست ٹیلی کاسٹ کرنے کی شروعات ہوئی۔ یہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی براہ راست دیکھا جاسکتا تھا۔

ستمبر 1984ء میں دہلی سے دوسرے چینل کی شروعات ہوئی۔ کچھ دنوں بعد دوسرے بڑے شہروں سے بھی دوسرے چینلز شروع کیے گئے۔

سیٹلائٹ کے ذریعے ٹیلی کاسٹ کی آسانی کے بعد پرائیویٹ چینلز شروع ہوئے جن کے ذریعے اس کی مقبولیت حد سے بڑھ کر ضرورت میں شامل ہوگئی۔

اب اس ذریعے کو آپسی مقابلے کا سامنا ہے جس میں ملک اور بیرون ملک کی مقابلہ آرائی شامل ہے اس چیلنج کا سامنے کرنے کے لیے ہندوستان ٹیلی ویژن کو تکنیک اور مواد کے اعتبار سے مزید ترقی یافتہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ٹیلی ویژن نے ہماری سماجی اور نجی زندگی کو اس درجہ متاثر کیا ہے کہ ہمارے روزمرہ کے معمولات میں شامل ہوگیا ہے۔

اب ٹیلی ویژن صرف شوق کی چیز نہیں ایک لازمی ضرورت بن چکا ہے۔ یہ معلومات کا اہم ذریعہ بھی ہے اور تفریح کا سامان

نوٹ

بھی ہے۔اس کے ذریعے گھر بیٹھے پوری دنیا دکھائی دیتی ہے۔کوئی بھی خبر سیکنڈوں میں پوری دنیا میں پھیلائی جاسکتی ہے۔

ٹیلی ویژن کے ذریعے انسانی فلاح کے بہت سے کام کیے جارہے ہیں جہاں جہاں اس کا صحیح صحیح استعمال ہوتا ہے وہاں وہاں یہ ایجاد انسان کے لیے بہت کام کی ہے مگر اس کے کچھ نقصان اور غلط اثرات بھی ہیں۔

ٹیلی ویژن نے اچھائیوں کی تشہیر کے ساتھ بہت سی ذہنی، اخلاقی اور سماجی برائیوں کو بھی جنم دیا ہے جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ورنہ ایک کام آنے والی چیز انسانی ناکامیوں کی داستان بن جائے گی۔

33B.3 الکٹرانک میڈیا میں اردو زبان کی اہمیت

ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی، سمجھی اور جانی جانے والی زبان اردو ہی ہے۔

الکٹرانک میڈیا میں، خاص طور پر ریڈیو میں کیونکہ رسم خط لپی کا مسئلہ نہیں ہے اس لیے اردو ہندی تقریباً ایک جیسی ہی زبان ہے اور یہی زبان الکٹرانک میڈیا کی بھی ہے۔یہ زبان کیونکہ ابتدا سے ہی عوامی رابطے کی زبان ہے۔اس لیے قدرے نئی ایجاد الکٹرانک میڈیا کی بھی رابطے کی زبان ہے۔

ریڈیو اور اردو

ماس میڈیا میں ریڈیو کی اہمیت کے بارے میں آپ جان چکے ہیں۔ریڈیو کیونکہ زبان کا ہی میڈیم ہے اس لیے اس میں زبان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔عام زندگی میں بولی جانے والی اردو آج بھی ریڈیو کی ایک بڑی زبان ہے۔

ریڈیو کی تجارتی اور غیر تجارتی سروسز اس زبان سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

فلم اور اردو

فلم کا میڈیم کیونکہ شروع سے ہی تھیٹر سے متاثر رہا ہے اس لیے اس میں تاریخی طور پر اردو کا اثر و رسوخ شروع سے ہی ہے۔

فلموں کی زبان آج بھی وہی عام اردو ہے جسے عوام بولتے، سمجھتے اور استعمال کرتے ہیں، البتہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور اس کے استعمال کی مختلف شکلیں سامنے آرہی ہیں۔

33B.4 ٹیلی ویژن اور اردو

ٹیلی ویژن ماس میڈیا کی صنف ہونے کے ناطے عوام کی زبان سے کیسے دور رہ سکتا تھا، ٹی وی کی عام زبان بھی بولی جانے والی اردو ہی ہے اور اس زبان کی شیرینی، سادگی اور اثر انگیزی نے ٹیلی ویژن کے ناظرین کو موہ لیا ہے چونکہ تجارتی طور پر آج ٹیلی

نوٹ

الکٹرانک میڈیا میں اردو کی اہمیت

ویژن سب سے بڑا الیکٹرانک بازار ہے، اس میں بیچی جانے والی چیزوں کے اشتہارات کی زبان بھی بولی جانے والی اردو ہی ہے۔

آپ کسی بھی وقت کسی بھی چینل پر کسی عوامی اشتہار کی زبان پر غور کریں، ہو سکے تو اس میں بولے جانے والے جملے کو کاغذ پر لکھ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس جملے میں زیادہ تر الفاظ اور ایکسپریشن اردو کے ہوں گے۔

ٹیلی ویژن پر اشتہارات اور دوسرے پروگراموں میں عوامی اردو کے استعمال کے علاوہ ٹیلی ویژن نے اردو شعر و ادب سے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ آج کل ٹیلی ویژن پر سیریلز بہت مقبول ہیں اگر ان سیریلز کے مکالموں اور ان میں شامل ٹائٹل سونگ پر غور کیا جائے تو ان سب میں اردو شاعری کا استعمال عام ہے اور اردو شاعری کی کشش نے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔

اردو زبان کی اہمیت ماس میڈیا میں پہلے بھی تھی مگر الکٹرانک میڈیا کے اضافے کے بعد اس کی اہمیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ آج الکٹرانک میڈیا کی کوئی بھی صنف بولی جانے والی عام اردو زبان کے بغیر عوام تک نہیں پہنچ سکتا۔

آپ نے کیا سیکھا؟

— ماس میڈیا آج کی زندگی کی ضرورت ہے۔
— ماس میڈیا کی دو قسمیں پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا۔
— ریڈیو کی اہمیت اور ضرورت۔
— فلم مقبول الکٹرانک میڈیم۔
— ٹیلی ویژن الکٹرانک میڈیم کی سب سے مقبول صنف ہے۔
— ٹیلی ویژن کے کچھ نقصان اور فائدے ہیں۔
— عام طور پر بولی جانے والی اردو زبان الکٹرانک میڈیا۔ ریڈیو، فلم اور ٹی وی کی اہم زبان ہے۔

متن پر سوالات 33B.1

1. الکٹرانک میڈیا میں سب سے مقبول صنف کونسی ہے؟
2. الکٹرانک میڈیا کس طرح نفع بخش ہے؟
3. الکٹرانک میڈیا کس طرح نقصان دہ ہے؟
4. معلومات کے لیے الکٹرانک میڈیا کس طرح اہم ہے۔
5. ٹی وی اشتہارات کی عام زبان کیا ہے۔

نوٹ

6. ٹی وی میں اردو کی مقبولیت کا راز کیا ہے۔
7. سیریلز کے شروع میں جو گانا ہوتا ہے اسے کیا کہتے ہیں۔
8. ٹی وی سیریلز میں اردو شاعری کا استعمال کیسے ہو رہا ہے۔

متن پر سوالات کے جوابات 33B.8

33B.1

1. الکٹرانک میڈیا میں سب مقبول صنف ٹیلی ویژن ہے۔
2. اخلاقی قدروں اور تعلیم و معلومات کے لیے استعمال ہو تو الکٹرانک میڈیا نفع بخش ہے۔
3. بری باتوں اور غلط خیالات کے لیے استعمال ہو تو نقصان دہ ہے۔
4. اس کے ذریعے جو معلومات ہو سکتی ہیں وہ کسی اور میڈیا سے نہیں ہو سکتیں۔
5. ٹی وی اشتہارات کی عام زبان بولی جانے والی اردو ہے۔
6. ٹی وی میں اردو کی مقبولیت کا راز اس کے عوامی رابطے کی زبان ہونے میں پوشیدہ ہے۔
7. سیریلز کے شروع میں جو گانا ہوتا ہے۔ اسے ٹائٹل سونگ کہتے ہیں۔
8. ٹائٹلز سونگ ٹی وی سریلز میں اردو شاعری کا استعمال عام ہے۔